MAUR-114 (N)

Sir Syed Ahmad Khan (Tafseeli Mutala)

MAUR-114 (N) سرسید احمد خاں (تفصیلی مطالعہ)

ء

سرسید احمد خاں (تفصیلی مطالعہ)

بلاک:1 سوانح اور عہد

اکائی ۱: سرسید احمد خاں: سوانح اور شخصیت

اکائی ۲: سرسید احمد خاں کا عہد (سیاسی، سماجی اور معاشرتی صورت حال)

اکائی ۳: سرسید احمد خاں: ملازمت اور سفر انگلستان

اکائی ۴: سرسید احمد خاں کی شخصیت کے نمایاں پہلو

بلاک:2 سرسید احمد خاں کی تصانیف اور معاصرین

اکائی ۵: سرسید احمد خاں کے معاصرین اور رفقا

اکائی ۶: سرسید احمد خاں کی تصنیف۔''اسباب بغاوت ہند'' کا تنقیدی مطالعہ

اکائی ۷: سرسید احمد خاں کی تصنیف۔''آثار الصنادید'' کا تنقیدی مطالعہ

اکائی ۸: سرسید احمد خاں کی تصنیف۔''خطبات احمدیہ'' کا تنقیدی مطالعہ

اکائی ۹: تہذیب الاخلاق کا اجرا اور اس کی سماجی و ادبی اہمیت

بلاک:3 سرسید احمد خاں کی علمی، ادبی و سیاسی خدمات

اکائی ۱۰: سرسید احمد خاں کا تصور تعلیم

اکائی ۱۱: سرسید احمد خاں کا تصور شعر و ادب

اکائی ۱۲: سرسید احمد خاں کی سیاسی و سماجی خدمات کا جائزہ

بلاک:4 سرسید احمد خاں کی مقالہ نگاری اور علی گڑھ تحریک

اکائی ۱۳: سرسید احمد خاں کی مقالہ نگاری اور اسلوب تحریر

اکائی ۱۴: شعر و ادب پر سرسید احمد خاں کے اثرات

اکائی ۱۵: علی گڑھ تحریک اور سرسید احمد خاں

کورس کا تعارف

سرسیداس زمانے کی پیداوار ہیں جس میں ہمارا ملک ہندستان تقریباً انگریزوں کا غلام ہو چکا تھااور ہندستانی عوام انگریزوں کے استحصالی وغاصبانہ منصوبوں سے اندرہی اندر کڑھنے لگے تھے۔یہی نہیں،انگریزوں کے استحصالی رویوں کے باعث یہاں کے عوام انگریزوں سے نفرت بھی کرنے لگے تھے۔لیکن سرسید کا معاملہ اس کے برعکس تھا۔انگریزوں سے تمام تر نفرتوں کے باوجود انھوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت اختیار کی۔یہی وجہ ہے کہ انھیں بعض لوگوں کی مخالفت کا سامنا بھی کرنا پڑا تھا۔انگریزوں سے ہندستانیوں کی نفرت کا عالم یہ تھا کہ بعض ہندستانی سپاہیوں نے 1857 میں انگریزوں کے خلاف بغاوت کا علم بلند کردیا تھا۔یہی وہ بغاوت ہے جس نے بہت جلد ہندستان کی پہلی جنگ آزادی کی شکل اختیار کرلی تھی۔یہ دیگر بات ہے کہ اس جنگ میں ہندستانیوں کو شکست سے دوچار ہونا پڑا تھا۔اس شکست کے بعد ہرطرف مایوسی اور بے بسی کی فضا قائم ہوگئی تھی۔ان حالات میں سرسید جیسی ہمہ جہت شخصیت نے ہندستانیوں کو مایوسی اور پسماندگی کی دلدل سے نکالنے کے لیے خود کو کمربستہ کرلیا تھا۔ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت میں رہتے ہوئے بھی سرسید نے ہندستانی عوام کی ترقی کے لیے نت نئی کوششیں کیں۔یہی نہیں،انگلستان گئے تو وہاں بھی انھوں نے قوم کی فلاح و بہبودی کو مقدم رکھااور سفرانگلستان کو ملک وقوم کی تعمیروترقی کے لیے بخوبی استعمال کیا۔

سرسید جس عہد کے پروردہ تھے،اس میں بہت سی ایسی باکمال شخصیات تھیں جن کی صحبت اور گفتگو نے سرسید کی شخصیت میں چار چاند لگائے۔انھوں نے اپنے عہد کے تقریباً تمام مروجہ علوم کو حاصل کیا۔اپنی خاندانی وجاہت کے سبب دہلی کی اعلیٰ سوسائٹی میں وہ قدرومنزلت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔قلعہ اورقلعہ سے باہر کے تمام باکمالوں کی مجلس میں سرسید شریک ہوتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی شخصیت کی تعمیراورمزاج کی استواری میں ان باکمال شخصیات نے نمایاں رول ادا کیا۔

اس کورس میں سرسید کی شخصیت،ان کے حالات زندگی،سرسید کا عہد،ان کی ملازمت وسفرانگلستان،ان کے معاصرین اوررفقا،ان کی ادبی خدمات،تصورتعلیم،تصورشعروادب،سیاسی وسماجی خدمات اورعلی گڑھ تحریک پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔ہم ان تمام نکات کے بارے میں جانیں گے اور سرسید کی شخصیت سے بھی متعارف ہوں گے۔

اکائی 1 ''سرسید احمد خاں: سوانح اور شخصیت'' پر مبنی ہے۔جس میں سرسید کی شخصیت، ان کے سوانحی کوائف اور دیگر امور پر مفصل گفتگو کی گئی ہے۔

اکائی 2 ''سرسید احمد خاں کا عہد (سیاسی،سماجی اور معاشرتی صورت حال)'' کے عنوان سے قائم کی گئی

ہے۔جس میں سرسید مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔

اکائی 3 ''سرسید احمد خاں: ملازمت اور سفر انگلستان'' پر مبنی ہے۔اس اکائی میں سرسید احمد خاں کے سفر انگلستان اور ان کی ملازمت سے متعلق معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

اکائی 4 میں ''سرسید احمد خاں کی شخصیت کے نمایاں پہلو'' پر مبنی ہے۔اس اکائی میں سرسید احمد خاں کی شخصیت کے اوصاف اور اس کے نمایاں پہلوؤں کو بروئے کار لانے کی کوشش کی گئی ہے۔جس سے طلبہ کو ان کی شخصیت کے بارے میں جاننے کا موقع ملے گا۔

اکائی 5 ''سرسید احمد خاں کے معاصرین اور رفقا'' پر مبنی ہے۔اس اکائی میں سرسید احمد خاں کے معاصرین اور ان کے رفقا جو ان کے ساتھ تمام علمی، ادبی و تعلیمی سرگرمیوں میں شامل رہے، ان سبھی پر گفتگو کی گئی ہے۔

اکائی 6 میں ''سرسید احمد خاں کی تصنیف۔''اسباب بغاوت ہند'' کا تنقیدی مطالعہ'' پر مبنی ہے۔اس اکائی میں ''اسباب بغاوت ہند'' کے متعلق تفصیلی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

اکائی 7 ''سرسید احمد خاں کی تصنیف۔''آثار الصنادید'' کا تنقیدی مطالعہ'' پر مبنی ہے۔اس میں ان کی تصنیف ''آثار الصنادید'' کے متعلق تفصیلی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

اکائی 8 ''سرسید احمد خاں کی تصنیف۔''خطبات احمدیہ'' کا تنقیدی مطالعہ'' پر مبنی ہے۔اس اکائی میں ان کی تصنیف ''خطبات احمدیہ'' کے متعلق تفصیلی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

اکائی 9 ''تہذیب الاخلاق کا اجرا اور اس کی سماجی و ادبی اہمیت'' پر مبنی ہے۔اس اکائی میں سرسید کے رسالے ''تہذیب الاخلاق'' کا اجرا اور اس رسالے کی علمی، ادبی و سماجی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اکائی 10 ''سرسید احمد خاں کا تصور تعلیم'' پر مبنی ہے۔اس اکائی میں سرسید کے تصور تعلیم اور اس کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اکائی 11 ''سرسید احمد خاں کا تصور شعر و ادب'' کے عنوان سے قائم کی گئی ہے۔اس میں سرسید کے تصور شعر و ادب یعنی ان کے ادبی نظریے کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

اکائی 12 ''سرسید احمد خاں کی سیاسی و سماجی خدمات کا جائزہ'' کے عنوان سے قائم کی گئی ہے۔جس میں سرسید کی سیاسی و سماجی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اکائی 13 ''سرسید احمد خاں کی مقالہ نگاری اور اسلوب تحریر'' کے عنوان سے قائم کی گئی ہے۔جس میں سرسید کے اسلوب تحریر کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

اکائی 14 ''شعر و ادب پر سرسید احمد خاں کے اثرات'' کے عنوان سے قائم کی گئی ہے۔جس میں سرسید

کے اردو نثر و نظم پر جو اثرات پڑے ان کا جائزہ لیا گیا ہے۔

اکائی 15 ''علی گڑھ تحریک اور سرسید احمد خاں'' کے عنوان سے قائم کی گئی ہے۔ جس میں علی گڑھ تحریک اور اس کی ابتدا میں سرسید کے کردار کی وضاحت کی گئی ہے۔

بلاک 1 سرسید احمد خاں سوانح اور عہد

اکائی ۱: سرسید احمد خاں: سوانح اور شخصیت

اکائی ۲: سرسید احمد خاں کا عہد (سیاسی، سماجی اور معاشرتی صورت حال)

اکائی ۳: سرسید احمد خاں: ملازمت اور سفر انگلستان

اکائی ۴: سرسید احمد خاں کی شخصیت کے نمایاں پہلو

اکائی 1 سرسید احمد خاں-سوانح اور شخصیت

اکائی کی ساخت

01.1 اغراض ومقاصد

01.2 تمہید

01.3 سرسید احمد خاں کے سوانحی حالات

01.3.1 خاندان

01.3.2 ولادت اور ابتدائی مراحل

01.3.3 رشتۂ ازدواج، ملازمت اور دیگر امور

01.3.4 قیام علی گڑھ اور دیگر سرگرمیاں

01.3.5 ایام آخری

01.3.6 اعزازات

01.3.7 اولاد

01.3.8 رفقاء

01.4 شخصیت کے نقوش

01.5 سرسید کی اہم اور نمایاں تصنیفات

01.6 آپ نے کیا سیکھا

01.7 اپنا امتحان خود لیجیے

01.8 سوالوں کے جوابات

01.9 فرہنگ

01.10 کتب برائے مطالعہ

01.1 اغراض ومقاصد

1۔ طلبہ کو سرسید کے خاندان، حسب نسب سے واقف کرانا۔

2۔ طلبہ کو سرسید کی شخصیت کے مختلف اوصاف سے متعارف کرانا۔

3۔ طلبہ کو سرسید کی سوانح کے اہم گوشوں سے واقف کرانا۔

4۔ طلبہ کو سرسید کی مختلف النوع صلاحیتوں سے متعارف کرانا۔

5۔ طلبہ کو سرسید کی اہم سرگرمیوں اور خدمات سے روشناس کرانا۔

02.2 تمہید

سرسید ایک عہد ساز شخصیت کے مالک تھے۔ وہ بیک وقت ایک عظیم مصلح اور مفکر، دانشور، مجتہد ہونے کے علاوہ ایک مستند محقق، مورخ، ناقد، مفسر قرآن، مصنف بھی تھے۔ وہ جدید اردو نثر کے بانی، عمدہ شاعر، بہترین مقالہ نگار اور بے باک صحافی بھی تھے۔ وہ علی گڑھ کے بانی اور علمبر دار بھی تھے اور ماہر تعلیم بھی۔ صحیح معنوں میں وہ وقت کے نباض اور راست دور اندیش تھے۔ اتنی گونا گوں صلاحیتوں کے مالک سرسید احمد خاں کو ہنگامہ خیز انیسویں صدی ملی تھی جو سیاسی، سماجی، معاشی، قومی، علمی، ادبی غرض ہر سطح پر اتھل پتھل اور انتشار کی شکار تھی۔ جہاں مغلیہ حکومت کا مکمل زوال ہو رہا تھا اور انگریزوں کا تسلط قائم ہو رہا تھا۔ جہاں ایک قوم کے ہاتھ سے حکومت کی باگ ڈور نکل کر دوسری زندہ قوم کے ہاتھ میں پہنچ گئی تھی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور اس کے بعد کی صورت حال میں سرسید کی شخصیت کو ابھرنے اور پنپنے کا موقع ملا اور سرسید نے اپنی صلاحیتوں سے ثابت کر دیا کہ ایسی ہستیاں تو صدیوں میں ایک بار ہی پیدا ہوتی ہیں اور انقلاب برپا کر دیتی ہیں، جن کے نقوش پا سے چراغ جلتے ہیں اور قومیں اس کی روشنی میں اپنا مستقبل طے کرتی ہیں۔ آیئے ایسی عظیم الشان عبقری شخصیت سے متعارف ہوتے ہیں اور اس کی زندگی کے حالات کو جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔

01.3 سوانح

01.3.1 خاندان

سرسید دہلی کے قدیم خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کا شجرۂ نسب امام تقی علیہ السلام اور وہاں سے ہوتا ہوا حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جا کر ملتا ہے۔ یہ شجرہ سرسید کی قبر مبارک کے دروازہ پر دونوں جانب کندہ ہے جسے ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ آپ کے آباواجداد ہرات سے دہلی منتقل ہوئے تھے جسے پہلے شاہ جہان آباد کہا جاتا تھا۔ آپ کے دادا سید ہادی فارسی کے صاحبِ دیوان شاعر تھے اور دادا کے بھائی سید مہدی عالمگیر ثانی کے دربار سے وابستہ اور اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ خود آپ کے والد سید متقی بھی مغل دربار سے وابستہ تھے۔

سرسید کے ننیہال کا تعلق خواجہ میر درد کے خانوادے سے تھا جو ایک معروف صوفی شاعر تھے۔ آپ کے نانا خواجہ فریدالدین اکبر شاہ ثانی کے عہد میں وزارت کے عہدے پر مامور تھے۔ خواجہ فریدالدین بے حد تعلیم یافتہ صاحب علم، ذہن وفطین تھے۔ ان کی تین بیٹیوں میں عزیز النساء سب سے بڑی تھیں اور والد ہی کی طرح بے حد ذی فہم اور نیک خاتون تھیں۔ یہ عزیز النساء ہی سرسید کی والدہ ماجدہ تھیں۔ میر متقی اور عزیز النساء کی تین اولادوں میں ایک بیٹی صفیۃ النساء اور دو بیٹے سید محمد اور چھوٹے سید احمد ہوئے۔ یہ سید احمد ہی سرسید احمد خاں کے نام سے معروف ہوئے اور اپنے خاندان کا نام روشن کیا۔

01.3.2 ولادت اور ابتدائی مراحل

سید احمد کی ولادت ۱۷/ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دلی میں ہوئی۔ بچپن سے ہی بے حد تندرست وتوانا اور مضبوط قد کاٹھی کے تھے۔ آپ کے نانا خواجہ فریدالدین نے پہلی بار جب ان کو دیکھا تو کہہ اٹھے ''یہ تو ہمارے گھر جاٹ پیدا ہوا ہے۔'' کھیل کو

د کے زمانے میں شروع سے ہی چاق و چوبند، پھرتیلے اور شوخ تھے۔ اکثر اپنے دوستوں سے شوخی کیا کرتے۔ یہ شوخی بڑے ہو جانے پر بھی قائم رہی جس کا اظہار وقتاً فوقتاً ان کی تحریروں اور گفتگو میں میں عیاں ہوتا رہتا ہے۔ مگر دل میں بڑی نرمی اور سوز و درد تھا۔ جو بعد میں قومی ہمدردی کی شکل میں ظاہر ہوتا رہا۔ زبان عمدہ اور شیریں تھی۔ راست بازی ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ ایک اچھے مقرر بھی تھے اور اپنی بات کو مدلل انداز میں کہنے کا فن جانتے تھے۔ انھوں نے تیراکی اور تیراندازی اپنے والد سے سیکھی۔

سرسید کی تعلیم کا آغاز روایت کے مطابق ہی ہوا۔ شاہ غلام علی نے بسم اللہ پڑھائی اور ایک استانی سے ناظرہ پڑھا۔ مولوی حمید الدین سے آمدنامہ، خالق باری اور گلستاں بوستاں، شرح ملا، شرح تہذیب اور مختصر المعانی پڑھیں۔ علم طب اور ریاضی میں حکیم حیدر خاں سے استفادہ کرنے کے ساتھ ذوق، غالب، صہبائی، آزردہ نصیر، مومن، شیفتہ جیسے شعراء کے کلام سے مستفیض ہوئے اور اس طرح خود بھی شاعری کرنے لگے اور آہی تخلص اختیار کیا۔

01.3.3 رشتۂ ازدواج اور ملازمت و دیگر امور

۱۹ برس کی عمر میں سرسید کی شادی نقیب الاولیاء خاندان کی ایک تعلیم یافتہ لڑکی پاکیزہ بیگم عرف مبارک بیگم سے ہوگئی۔ دو برس بعد سرسید کے والد کا انتقال (۱۸۳۸ء) ہو گیا۔ اس وقت مغل حکومت کا زوال ہو چکا تھا اور انگریزی عملداری میں دلی شامل ہو چکی تھی۔ ایسے وقت میں انھوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت کرنے کا ارادہ کیا اور کچہری کے کام سیکھنے لگے۔ رابرٹ ہملٹن آگرہ کے کمشنر مقرر ہوئے تو سرسید کی تقرری فروری ۱۸۳۹ء میں نائب منشی کے عہدے پر کر دی۔ سرسید نے یہاں قوانین مال سے گہری واقفیت حاصل کرنے کے علاوہ علم و ادب سے بھی رشتہ استوار رکھا اور خود کو مطالعہ میں منہمک رکھا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۴۰ء میں انھوں نے ایک رسالہ جام جم کے نام سے تصنیف کیا جس میں امیر تیمور سے بہادر شاہ ظفر کے بادشاہوں کے احوال درج ہیں۔ اسی دور میں انھوں نے عہدۂ منصفی کے لیے امتحان دیا اور کامیاب ہو کر ۲۴ر دسمبر ۱۸۴۱ء کو مین پوری میں منصف کے عہدے پر مامور ہوئے۔ ۱۰ر جنوری ۱۸۴۲ء میں فتح پور منتقلی کے بعد انھوں نے ایک مذہبی رسالہ ''جلاء القلوب بذکر المحبوب'' تصنیف کیا۔ ۱۸۴۶ء میں آپ تبدیل ہو کر دہلی آئے اور ۱۸۵۶ء تک وہیں رہے۔ اس عرصے میں انھوں نے علمائے دین سے فیض حاصل کیا۔ مولوی نوازش سے فقہ، مولوی فیض الحسن سے عربی ادب اور علم حدیث، مولانا عنایت رسول سے عبرانی و دیگر علوم و فنون سیکھتے رہے۔ دوران قیام انھوں نے مطالعہ کو وسعت دے کر بڑی سنجیدگی سے ''قول متین در ابطال حرکت'' (۱۸۴۸ء)، ''کلمۃ الحق در بیان حقیقت و پیری و مریدی'' (۱۸۴۹ء)، ''راہ سنت در رد بدعت'' (۱۸۵۰ء)، ''نمیقہ فی بیان مسئلہ تصور شیخ'' (۱۸۵۲ء) تصنیف کیے اور تحفۂ حسن کے باب دہم اور دوازدہم کا ترجمہ ۱۸۴۳ء، تسہیل فی جرالثقیل (ترجمہ) ۱۸۴۴ء، خواجہ فرید الدین کے رسالہ ''فوائد الافکار فی اعمال الفرجار'' کا ترجمہ (۱۸۴۹ء) بھی کیا۔

۱۳ر جنوری ۱۸۵۵ء کو سرسید مستقلاً صدر امین کے عہدے پر بجنور فائز ہوئے اور دو برس کے مختصر سے عرصے میں انھو ں نے تاریخ ضلع بجنور اور آئین اکبری کی تدوین کا کام سرانجام دیا۔ تاریخ ضلع بجنور ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں تلف

ہوگئی اور شائع نہ ہوسکی۔ آئین اکبری کی تدوینی خدمت کو بعد میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ اور اس کے ترجمے انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں کیے گئے۔ یہ وہ دور تھا جب ۱۸۵۷ء کا ہولناک واقعہ رونما ہوا۔ سرسید اس موقع پر اپنا فرض بخوبی ادا کیا اور انسانیت کے رشتے کو فوقیت دی۔ ہر طبقے اور قوم کے لوگوں کی جانیں بچائیں، ان میں انگریز افسران اور ان کے گھر والے بھی تھے۔ اسی شورش میں دہلی میں خود سرسید کا گھر لوٹ لیا گیا۔ انگریز حکومت نے سرسید کو ان کی کارکردگی کے عوض میں انعام واکرام سے نوازنے کی کوشش کی مگر سرسید نے کسی بھی طرح کے صلے سے انکار کردیا۔ ۱۸۵۸ء میں سرسید صدر الصدور بنا کر مرادآباد بھیجے گئے جہاں انھوں نے سرکشی ضلع بجنور شائع کی اور بڑی ایمان داری سے اس زمانے کے حالات تحریر کیے اور مسلمانوں پر ہونے والے ظلم وستم کا تذکرہ کیا۔ انھوں نے انگریزوں کی مسلمانوں کے تئیں پیدا ہوچکی غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لیے ''رسالہ اسباب بغاوت ہند'' (۱۸۵۹ء) تحریر کیا اور اس کے پانچ سو نسخے شائع کرا کر انگلستان بھیج دیے۔ ۱۸۶۰ء میں مرادآباد میں قحط پڑا تو سرسید کو اس حوالے سے ضلع کا کام سونپا گیا۔ انھو ں نے اس دوران عوام کی بالخصوص لاوارث بچوں کی دیکھ بھال بڑے خلوص سے کی۔ اسی دور میں انھوں نے مرادآباد میں ایک اردو میڈیم اسکول بھی قائم کیا اور لائل محمڈنز آف انڈیا رسالہ نکالنا شروع کیا جس کا مقصد ان مسلمانوں کی بابت انگریزوں کو بتانا تھا جو حکومت کے وفادار تھے۔ ۱۸۶۱ء میں ان کی بیوی کا انتقال وہیں مرادآباد میں ہوا۔ مرادآباد میں ہی انھوں نے ''تاریخ فیروز شاہی'' کی تدوین کی جسے رائل ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ نے شائع کیا۔ اس کے بعد ان کی تقرری غازی پور میں ہوئی جہاں انھوں نے تبیین الکلام کی ترتیب کا کام شروع کیا اور اسے الگ الگ حصوں میں شائع کرنے لگے۔ غازی پور میں سرسید کا سب سے بڑا کارنامہ سائنٹفک سوسائٹی کا قیام ہے، جس کا بنیادی مقصد غیر ملکی زبان کی علمی وادبی تصنیفات اور کاوشوں کا اردو میں ترجمہ تھا۔ سرسید اس کے اعزازی سکریٹری مقرر ہوئے اور اپنے ذاتی پریس سے تصنیفات کی طباعت کا سلسلہ شروع کیا۔ غازی پور میں انھوں نے ایک مدرسہ بھی قائم کیا جس میں اردو، سنسکرت، عربی اور فارسی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ آج یہ مدرسہ کوین وکٹوریہ کالج کے نام سے اپنی الگ شناخت رکھتا ہے۔ ان کے تعلیمی مشن اور علمی سفر کو اس وقت نئی راہ حاصل ہوئی جب آپ کا تبادلہ ۱۸۶۴ء میں علی گڑھ ہوگیا۔ اس طرح سوسائٹی کا دفتر بھی علی گڑھ منتقل ہوگیا اور پھر یہیں سے سائنٹفک سوسائٹی کا اخبار ''علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' بھی جاری ہونا شروع ہوا۔ اس کی ادارت کی ذمہ داری خود سرسید نے اپنے ہاتھوں میں لی اور آخری دم تک اس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ ۱۸۶۷ء اگست ماہ میں جج کے عہدے پر مامور کرتے ہوئے آپ کو بنارس بھیج دیا گیا۔ اس دوران سوسائٹی کا کام راجہ جے کشن داس سنبھالتے رہے۔ سرسید نے اس دوران ۱۸۶۷ء میں ایک شفاخانہ بنارس میں ہومیوپیتھک ڈسپنسری اینڈ ہاسپٹل کے نام سے کھولا تاکہ اس سے لوگ تیزی سے شفایاب ہوسکیں اور علاج تک آسانی سے ان کی رسائی ہوسکے۔ اسی دوران انھوں نے ۱۸۶۸ء میں ایک رسالہ ''احکام طعام اہل کتاب'' تحریر کیا جس میں اہل کتاب کے ساتھ طعام حلال میں شریک ہونے اور دسترخوان پر ساتھ بیٹھنے اور کھانا تناول کرنے کو جائز ٹھہرایا۔ اس کا مقصد مسلمانوں کے اندر اس قسم کی انگریزوں کے تئیں غلط فہمیوں کا ازالہ کرنا تھا جو ان کے مذہب اور ذہنوں کا حصہ بن چکی تھیں۔ تقریباً ڈیڑھ برس بنارس میں قیام کے بعد سرسید نے ۱۸۶۹ء میں انگلینڈ کا سفر کیا اور وہاں کے تعلیمی نصاب اور تعلیمی اداروں اور کتب خانوں، طرز معاشرت

وغیرہ کا معائنہ کیا تا کہ وہ اپنی قوم اور ہندوستان کے لیے ایک تعلیمی منصوبہ تشکیل دے سکیں۔ انھوں نے قیام کے دوران خطبات احمد یہ تصنیف کی جو بارہ خطبات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب ولیم میور کا مستند جواب تھی جو اس نے رسالت مآب پر اعتراضات کیے تھے۔ اس کے لیے سرسید نے اپنا وقت، دھن دولت، جائیداد غرض ہر چیز داؤ پر لگا دی تھی۔ عقیدت رسول اور عشق رسول کا یہ جیتا جاگتا ثبوت تھا جسے دیگر دانشوروں اور مفکرین کو بھی تسلیم کرنا پڑا اور خطبات احمدیہ کا قایل ہونا پڑا۔

01.3.04 قیام علی گڑھ اور دیگر سرگرمیاں

اکتوبر ۱۸۷۰ء کو سرسید ہندوستان واپس آئے تو انھوں نے بڑے منصوبہ بند طریقے سے کئی کام سرانجام دینے شروع کیے۔ انھوں نے لندن سے شائع ہونے والے رسالہ 'ٹیٹلر' اور 'اسپیکٹر' کی طرز پر ۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء کو تہذیب الاخلاق کا اجرا کیا۔ اس رسالے کا مقصد قوم کے اندر سماجی، سیاسی، تعلیمی، تہذیبی، ادبی غرض ہر قسم کی اصلاح تھا اور قوم کی بیداری اس رسالے کی روح تھی لہٰذا اس میں سرسید اور ان کے رفقاء اس قسم کے معاشرتی، سماجی، تہذیبی اور علمی مضامین تحریر کرتے تھے جن سے عوام کے ذہن کھل جائیں اور ان میں بیداری آئے۔ سرسید کا دوسرا بےحد اہم کارنامہ ''مدرسۃ العلوم'' کا قیام تھا، جس کا آغاز انھوں نے ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو ملکہ وکٹوریہ کی سالگرہ کے موقع پر کیا اور قبل از وقت پنشن کی درخواست دے کر ۱۸۷۶ء کو علی گڑھ میں منتقل ہو گئے۔ اس کے قیام کا مقصد روایتی علوم مشرقیہ کے ساتھ ساتھ علوم جدیدہ کا حصول تھا جس سے نئی نسل مستفیض ہو سکے اور ہندوستان ترقی کی راہ پر ایک بڑا قدم بڑھا سکے۔ کالج کے قیام اور اسے یونیورسٹی کی شکل دینے کے لیے وہ دن رات لگے رہتے، چندہ جمع کرتے، عمارت کے نقشے بنواتے، مختلف مشاغل میں مصروف رہتے۔ دن اور رات کو ایک کر کے انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی صورت کو بہتر بنانے کی کامیاب کوشش کی۔ یہ ان کی ہی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج یہ ایک عظیم الشان دانشگاہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے پوری دنیا میں علم کی روشنی بکھیر رہی ہے۔

سرسید نے ۱۸۸۳ء میں ''محمڈن سول سروس فنڈ ایسوسی ایشن'' کا قیام کیا تا کہ ایسے طلبہ جو بیرون ملک جا کر تعلیم کا حصول کرنا چاہیں تو انہیں ایک مناسب فنڈ مہیا کرایا جا سکے۔ اس کے علاوہ انھوں نے ۱۸۸۶ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ بھی قائم کی جس کا بنیادی مقصد ملک کے مختلف علاقوں میں تعلیمی صورت حال سے واقف ہونا اور ان کی تعلیمی فلاح وفروغ کے لیے کوششیں کرنا تھا۔ سرسید کا مشن یہی تھا کہ مسلمان صرف اور صرف تعلیم پر توجہ دیں اور اپنی صورت حال کو بہتر بنا سکیں۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ جب تک مسلمان تعلیمی اعتبار سے مضبوط نہ ہوں گے وہ کسی میدان میں ترقی نہ کر سکیں گے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ کسی بھی طرح کی سیاست کے قائل نہ تھے۔ اسی وجہ سے انھوں نے نیشنل کانگریس میں شامل ہونے سے مسلمانوں کو روکا اور تعلیم کی طرف توجہ مرکوز رکھنے کی ہدایت دی اور اسی مقصد کے تحت ۱۸۸۸ء میں انھوں نے پیٹریاٹک سوسائٹی ایسوسی ایشن تشکیل دی۔

01.3.5 ایام آخری

عمر کے آخری حصے میں جہاں آپ اس قومی اور تعلیمی مشن میں پوری تندہی اور خلوص کے ساتھ لگے ہوئے تھے، انہیں

بعض ناخوشگوار حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ان میں ایک واقعہ ٹرسٹی بل کا تھا جہاں سرسید کے بیٹے سید محمود کو کالج کا جوائنٹ سکریٹری بنانے پر ٹرسٹیوں، سرسید کے رفقاء میں باہمی اختلافات حد درجہ بڑھ گئے اور رنجش میں تبدیل ہو گئے۔اس کے علاوہ ایک واقعہ کالج کے روپے میں غبن کا بھی پیش آیا، جس میں سرسید کے جعلی دستخط کر کے کثیر رقم نکال لی گئی۔اس کے ایک عرصے تک کالج کا کام رک گیا۔ان واقعات کے ساتھ ۱۸۹۷ء میں سید محمود کی سخت علالت اور سرسید کے بڑے بیٹے سید حامد کے انتقال نے آپ کو بری طرح توڑ کر رکھ دیا۔ایسے حالات میں بھی انھوں نے قوم اور ملک کی اصلاح میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ دوران علالت ہی انھوں نے ایک عیسائی کی تصنیف ''امہات المومنین'' کے رد کے طور پر ''ازواج مطہرات'' کے نام سے ایک تصنیف لکھنی شروع کی جو نامکمل رہ گئی۔

سرسید کے انتقال سے چند روز قبل سید محمود کے مکان سے حاجی اسماعیل خاں کی کوٹھی میں چلے گئے۔ ۲۷/مارچ ۱۸۹۸ء بروز اتوار دس بجے شب آپ کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔کالج کے کرکٹ لان میں آپ کی نماز جنازہ ادا کی گئی جس کی امامت مولوی عبداللہ انصاری نے فرمائی۔ یونیورسٹی جامع مسجد میں آپ کی تدفین عمل میں آئی۔ درحقیقت سرسید کی موت ایک انسان کی موت نہ ہو کر ایک عہد کی موت تھی۔انکے ساتھ ہی ہندی مسلمانوں کی تاریخ کا ایک زریں باب بھی بند ہو گیا۔انہیں قوم کی خدمت کرنے کے عوض کافر، نیچری، ملحد، مرتد غرض ہر طرح کے خطابات سے نوازا گیا۔ ان کے مقاصد کو روکنے کے لیے کفر کے فتوے تک صادر کیے گئے۔ یہ سب کچھ ان کی روشن ضمیری اور روشن خیالی کے سبب ہوا۔انھوں نے عقلیت، استدلال، منطقیت، اجتہاد پر اصرار کیا، علوم جدیدہ کو فروغ دینے میں کوشاں رہے، اردو نثر کو سائنٹفک اور سنجیدہ و متین بنانے میں پہل کی اپنے مقالات کے ذریعہ جدید اردو نثر کا آغاز کیا۔ سادہ، سلیس اسلوب اور براہ راست انداز بیان پر زور دیا۔سائنسی ترقیوں، فلسفہ اور مغربی علوم، ایجادات و اختراعات کو اپنایا اور اپنانے کی قوم کو تلقین کی۔ نئے تعلیمی نصاب کو مروج کرنے کی کوشش کی جس سے دنیا میں شان سے جینے اور ترقی یافتہ بننے کا ہنر آئے۔ اردو میں محض نثر ہی نہیں بلکہ شاعری میں بھی تبدیلیوں کے وہ قائل نظر آئے۔انھوں نے جدید اردو نظم کو موضوعات کی پیشکش اور ترسیل کے اعتبار سے مروج کرنے پر زور دیا۔غزل کو فرسودہ موضوعات سے الگ کرنے کی تلقین کی۔فطرت، تاریخ، فلسفہ اور سنجیدہ موضوعات کو شاعری کا حصہ بنانے پر شعراء کو راغب کیا۔اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ انھوں نے علم وادب اور دیگر امور زندگی کے تمام تر گوشوں کا احاطہ کر لیا جس میں ترمیم واضافے یا تبدیلیوں کی اشد ضرورت تھی۔

01.3.6 اعزازات

۱۸۴۲ء میں بہادر شاہ ظفر نے ان کے خطاب جوادالدولہ میں عارف جنگ کا اضافہ کیا۔

قیام لندن کے دوران آپ کو سی ایس آئی کا خطاب دیا گیا۔

۱۸۷۸ء میں آپ کی خدمات کے اعتراف میں وائسریگل کاونسل کا رکن منتخب کیا گیا۔

۱۸۸۷ء میں لارڈ ڈفرن نے آپ کو سول سروس کمیشن کا رکن مقرر کیا۔

۱۸۸۸ء میں آپ کو کے سی ایس آئی اور سر کا خطاب عطا کیا گیا۔

۱۸۸۹ء میں ایڈنبرا یونیورسٹی کی جانب سے ڈاکٹر آف لاء کی اعزازی سند عطا کی گئی۔

01.3.7 اولاد

آپ کی تین اولاد تھیں:

بڑے بیٹے سید حامد تھے جو سپرنٹنڈنٹ پولیس تھے۔ سر سید کی زندگی میں ہی ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس کے بعد دوسرے بیٹے سید محمود تھے جو الہ آباد ہائی کورٹ کے جج تھے، جن کی شادی ان کی چچازاد بہن مشرف جہاں اور سر سید کے ماموں زاد بھائی شرف الدین کی لڑکی سے ہوئی تھی، جن سے اکلوتے بیٹے سر راس مسعود کی ولادت ہوئی تھی۔ سر سید کی چھوٹی بیٹی امینہ تھیں، جب سر سید کا قیام لندن میں تھا اس دوران امینہ کا انتقال ہو گیا تھا۔

01.3.8 رفقاء

سر سید محض ایک شخص نہیں تھے بلکہ اپنے آپ میں وہ ایک بزم، عہد اور تحریک تھے، لہٰذا آپ کا حلقۂ احباب بھی بے حد وسیع تھا مگر ان میں ایسے افراد امتیازی حیثیت کے حامل ہیں جنھوں نے سر سید کے مقاصد اور فکر کو فراخ دلی سے سمجھا اور ان سے متفق ہی نہیں ہوئے بلکہ ان کے مشن میں ہمنوائی کی۔ ان کا ہر اعتبار سے ساتھ دیا۔ نظریاتی اور مذہبی اختلافات کے باوجود ان کے اصلاحی مشن میں ہمہ تن مشغول و مصروف رہے۔ ان میں خواجہ الطاف حسین حالی، محسن الملک، وقار الملک، مولوی ذکاء اللہ، ڈپٹی نذیر احمد، علامہ شبلی، راجہ جے کشن داس، تھیوڈور بک، ماریسن، مولوی ممتاز علی، مولوی سمیع اللہ، زین العابدین، نواب فتح نواز جنگ، خلیفہ محمد حسین، خلیفہ محمد حسن وزراء پٹیالہ، نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی، مولوی سید علی، ڈاکٹر سید حسن، محمد حیات خاں، ڈپٹی برکت علی خان، شاہ دین، سر محمد شفیع وغیرہ بے حد اہمیت کے حامل ہیں۔

1.4 شخصیت کے نقوش

سر سید احمد خاں سرخ و سپید رنگت رکھنے والے عظیم المرتبت شخص تھے، جن کی پیشانی بے حد کشادہ اور بلند تھی، جسے خوش بختی اور خوش قسمتی کی علامت تصور کیا جاتا ہے۔ سر بڑا جو سرداروں اور دانشوروں کی پہچان معلوم ہوتا ہے۔ بھویں جدا جدا تھیں، جو چہرہ کو دلکش بناتی تھیں۔ آنکھیں متناسب نہ بہت زیادہ بڑی اور نہ چھوٹی اور نہایت روشن تھیں جو ان کی غیر معمولی ذہانت کا پتہ دیتی تھیں۔ کان لمبے اور ناک چھوٹی تھی، داڑھی لمبی اور کافی گھنی تھی، جس سے چہرہ بے حد نورانی اور بارعب معلوم ہوتا تھا۔ لمبے قد کے فربہ جسم والے تھے اور وزن ایک سو چالیس کلوگرام تھا۔ چوڑی چکلی ہڈی اور ہاتھ پاؤں بے حد مضبوط تھے۔ ہتھیلی چوڑی اور گوشت سے بھری ہوئی، انگلیاں موٹی موٹی اور ٹھوس تھیں، پاؤں بھی موٹے اور بھاری بھرکم تھے۔ شانہ اور بازو گوشت سے بھرے ہوئے فولاد کی مانند معلوم ہوتے تھے۔ چہرے کے اعتبار سے ہونٹ کسی حد تک باریک اور سینہ کافی چوڑا تھا۔ پنڈلیاں بھری بھری، بدن تندرست اور ورزشی و گٹھیلا تھا۔ صورت بہت اچھی، دلکش اور بارعب تھی، کرنل گراہم کے مطابق ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک ببر شیر ہمارے سامنے آن کھڑا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے نانا نے ان کو دیکھتے ہی جاٹ کہہ دیا تھا۔ کھیل کود کے بے حد شوقین تھے۔ گیند بلا، آنکھ مچولی، گڑ یریاں ان کے پسندیدہ کھیل تھے۔ تیراندازی اور تیراکی کے ماہر تھے۔ جوانی میں بے حد وجیہہ اور خوبصورت تھے اور بدن بے حد پھرتیلا اور توانا

تھا۔ آپ کو دیکھنے والے پر آپ کا رعب و دبدبہ اور ہیبت تا دیر قائم رہتی تھی۔ عنایت اللہ دہلوی جب چھوٹے تھے تو اپنے والد کے ساتھ علی گڑھ آپ سے ملنے گئے وہ بیان کرتے ہیں کہ ''میں نے انگریزی وضع کے مکان دور سے دیکھے تھے کبھی ان کے اندر نہیں گیا تھا۔ گاڑی سے اتر کر ہم کئی کمروں میں سے گزرتے ہوئے ایک بڑے کمرے میں آئے جو مجھے بہت وسیع معلوم ہوا۔ اس کمرے کے سب سے بڑے والے دروازے میں خس کی ٹٹی لگی ہوئی تھی، اور پنکھا چل رہا تھا مگر کھینچنے والا نظر نہ آتا تھا۔ کمرے میں بہت سی خوبصورت کرسیاں کئی وضع کی رکھی ہوئی تھیں۔ خس کی ٹٹی کے قریب ایک میز پر جس کی پوسش سبز تھی بہت سے کاغذ اور کتابیں اور کچھ چمکتی ہوئی چیزیں نہایت سلیقے اور خوبصورتی سے رکھی ہوئی تھیں۔ میز کے قریب ہی کرسی پر ایک بھاری بھرکم آدمی، سفید سر، سفید داڑھی، سفید لباس، موٹے موٹے پاؤں اور ان میں سلیپر جو مجھے قالین کے ٹکڑے معلوم ہوتے تھے، شیر کا سا کلہ، عینک لگی ہوئی، برہنہ سر بیٹھے ہوئے تھے۔ یہی سرسید احمد خان تھے جنہیں دلی کے بعض لوگ صرف 'علی گڑھ والا' کہنا کافی سمجھتے تھے اور وہ ایک خوف اور پرہیز کی چیز سمجھے جاتے تھے۔''

سرسید کی ایک بار جس سے ملاقات ہو جاتی تھی وہ ہمیشہ آپ سے ملنے کا خواہش مند رہتا تھا اور کچھ نہ کچھ سیکھ کر ہی لوٹتا تھا۔ لوگ آپ کی شگفتگی، شوخ مزاجی اور خوش خلقی کے گرویدہ تھے۔ دوران گفتگو چہرے سے خوش دلی، گرم جوشی اور زندہ دلی ظاہر ہوتی تھی۔ گفتگو شیریں انداز اور عام بول چال کے الفاظ سے مزین ہوتی تھی جس میں کسی بناوٹ کا دور دور تک شائبہ نہیں تھا۔ زبان دلی کی ضرور تھی مگر لب ولہجہ دلی جیسا نہیں تھا۔ آپ کا لباس ترکی تھا۔ اکثر سفید لباس زیبِ تن کیے رہتے اور رہن سہن انگریزی طرز پر تھا۔ گھر میں برتنے والی اشیا اور گھر کی ظاہری بناوٹ بھی انگریزی طرز کی ہی تھیں۔ کھانا ٹیبل کرسی پر بیٹھ کر چھری کانٹے اور چمچے سے کھاتے۔ صفائی ستھرائی اور پاکی کا بہت خیال رکھتے۔ سلیقہ ان کی اور گھر کی ہر شے سے ٹپکتا تھا۔ ہر شے قرینے سے رکھی ہوتی تھی، جس طرح ذہن کشادہ اور وسیع تھا، بالکل اسی طرح وسعت اور کشادگی میں رہنا پسند کرتے تھے۔ نیچر کے بے حد شوقین تھے۔ آپ کے کمرے میں فرشی پنکھے کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا، ہر طرف صفائی، سلیقہ، نیچے فرش پر زمرد حاشیہ دے کر سرخ اور پتلی دھاریوں کی دری اور سفید براق سی چھت گہری، دیواروں پر ہلکا فیروزی رنگ، کہیں کہیں سنہری چوکھٹوں میں تصویریں لٹکی ہوئی جن پر پہاڑ، سبزہ زار اور چشمے نظر آتے تھے۔

صحیح معنوں میں وہ زمانے کے نبض شناس اور بے حد دور اندیش تھے۔ وہ زمانے کی مصلحت کو بخوبی جانتے تھے۔ ان کے اندر کسی بھی طرح کی منافقت نہیں تھی۔ کسی بھی بات کو برملا کرنا ان کی فطرت تھی۔ وہ روایتی تقلید کے بالکل قائل نہیں تھے اور قوم کے سچے دردمند اور مخلص تھے۔ وہ جن باتوں کو قوم کے لے مفید تصور کرتے اسی کی تلقین کرتے۔ ان کے اندر ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ جس کام کو کرنے کے لیے ٹھان لیتے اس کے بعد اس پر ڈٹ جاتے۔ ان کے پائے استقامت کو کبھی لغزش نہ آتی۔ وہ پھر دنیا کی پرواہ نہیں کرتے۔ انہیں نہ تو کسی صلے کی تمنا اور نہ ستائش کی پرواہ تھی۔ قوم کی دردمندی اور خلوص کا اندازہ ان کے ایک ایک قدم اور ایک ایک سرگرمی سے کیا جا سکتا ہے۔ قوم کے لیے جو درد ان کے اندر موجود تھا اس کو ان کے ان الفاظ میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ وہ ایک تقریر میں کہتے ہیں:

''میں نے صرف اس خیال سے کہ کیا راہ ہے جس سے قوم کی حالت درست ہو، دور دراز کا سفر اختیار کیا اور بہت کچھ دیکھنے کے لائق تھا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جب میں نے کوئی عمدہ چیز دیکھی، جب کبھی عالموں اور مہذب

آدمیوں کو دیکھا، جب کبھی علمی مجلسیں دیکھیں، جہاں کہیں عمدہ مکانات دیکھے، جب کبھی عمدہ پھول دیکھے، جب کبھی کھیل کود، عیش وآرام کے جلسے دیکھے یہاں تک کہ جب کبھی کسی خوبصورت شخص کو دیکھا، مجھ کو ہمیشہ اپنا ملک اور اپنی قوم یاد آئی اور نہایت رنج ہوا کہ ہماری قوم ایسی کیوں نہیں؟ جہاں تک ہوسکا ہر موقع پر میں قومی ترقی کی تدبیروں پر غور کیا۔ سب سے اول یہی تدبیر سوجھی کہ قوم کے لیے قوم ہی کے ہاتھ سے ایک مدرسۃ العلوم قائم کیا جائے۔'' (حیات جاوید، حالی، ۱۹۳۹ء، ص: ۱۹۰)

1.5 سرسید کی اہم اور نمایاں تصنیفات

سرسید کی اہم اور نمایاں تصنیفات کو ہم تین یا چار حصوں میں آسانی کے لیے منقسم کرسکتے ہیں۔

(۱) علمی و مذہبی تصانیف اور تحریریں (۲) تاریخی تصانیف (۳) سیاسی، سماجی، سائنسی اور دیگر موضوعات پر تصانیف اور

(۴) ادبی تصانیف یا تحریریں

1.5.1 علمی و مذہبی تصانیف اور رسالے

۱-تحفہ حسن (۱۸۴۴ء) یہ ردشیعیت میں لکھا گیا شاہ عبدالعزیز کی مشہور و معروف تصنیف ''تحفۂ اثناعشری'' کے دسویں اور بارہویں باب کا ترجمہ ہے۔

۲-کلمۃ الحق (۱۸۴۹ء) یہ بھی پیری اور بیعت کے مروجہ طریقہ کے رد میں تحریر کردہ رسالہ ہے۔

۳-راہ سنت دررد بدعت (۱۸۵۰ء) اسے بھی بدعت کے رد میں تحریر کیا گیا ہے۔

۴-نمیقہ دربیان مسئلہ تصورشیخ (۱۸۵۲ء) یہ فارسی زبان میں تصور شیخ سے متعلق ہے۔

۵-تحقیق لفظ نصاریٰ- یہ رسالہ انگریزوں کی بدگمانی کو رفع کرنے کے لیے لفظ نصاریٰ کی تحقیق پر مبنی ہے۔

۶-احکام طعام اہل کتاب- اسے مسلمانوں کے لیے انگریزوں اور انگریزی طرز معاشرت سے پیدا ہونے والی نفرت کو دور کرنے کے لیے لکھا گیا تھا۔

۷-رسالہ ابطال غلامی- یہ اسلام اور غلامی کے رد میں تحریر کیا گیا تھا۔

۸-النظر فی بعض المسائل- اس میں قرآن کریم کے حوالے سے چند اہم مسائل کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔

۹-جواب امہات المومنین- یہ تعداد ازواج مطہرات کے بارے میں ہے۔

۱۰-جلاء القلوب بذکر المحبوب (۱۹۴۲ء) یہ رسولؐ کی ولادت، وصال اور معجزات کے بارے میں ہے۔

۱۱-الدعا والاستجابت- اس میں دعا کی اجابت سے بحث کی گئی ہے۔

۱۲-تحریر فی اصول التفسیر (۱۸۹۲ء) اس میں تفسیر کے اصول بیان کیے گئے ہیں۔

۱۳-۱۸۶۳ء میں امام غزالی کی کتاب کیمیائے سعادت کے ابتدائی صفحات کا ترجمہ بھی کیا۔

۱۴-تبیین القرآن- اس میں توریت اور انجیل کی تفسیر پیش کی ہے اور ان امور پر توجہ مرکوز کی جن سے انگریزوں

اور مسلمانوں کے مابین مختلف شکوک وشبہات اور غلط فہمیوں کا ازالہ ہو سکے اور بدگمانی دور ہو سکے۔

۱۵-تفسیر القرآن (۱۸۸۰ء) سرسید نے سائنٹفک انداز میں قرآن شریف کی تفسیر پیش کی ہے۔ یہ ۱۶ پاروں پر مشتمل ہے اور سرسید کا اہم کارنامہ ہے۔اس کی چھ جلدیں منظر عام پر آئی ہیں۔

۱۶-خطبات احمدیہ- یہ سر ولیم میور کی ''لائف آف محمد'' میں موجود غلط فہمیوں کا مدلل جواب ہے۔اسے انھوں نے ۱۲ خطبات کی شکل میں تحریر کیا ہے اور ۱۸۷۰ء میں لندن میں انگریزی میں ترجمہ کرا کے شائع بھی کروایا ہے۔

1.5.2 تاریخی تصانیف

۱۷-جام جم-امیر تیمور سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک ۴۳ بادشاہوں کے احوال پر مشتمل یہ کتاب فارسی زبان میں لکھی گئی ہے۔

۱۸-آثار الصنادید-اس کا پہلا ایڈیشن ۱۸۴۷ء اور دوسرا ترمیم شدہ ایڈیشن ۱۸۵۴ء میں منظر عام پر آیا۔ یہ دہلی کی عمارتوں، مقبروں، اہل فن وعلم کے احوال، مختلف نقشوں اور کتبوں کی تفصیل ہے، بقول پروفیسر نظامی آثار قدیمہ کے موضوع پر یہ پہلے ہندوستانی کی لکھی ہوئی کتاب ہے۔

۱۹-سلسلۃ الملوک- دہلی کے قدیم بادشاہوں، راجاؤں کے مختصر احوال پر مشتمل تصنیف ہے۔

۲۰-تاریخ بجنور-ضلع بجنور کی تاریخ بیان کرتی ہے جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی نذر ہو گئی۔

۲۱-تصحیح آئین اکبری-آئین اکبری کی تصحیح وتدوین کا اہم تحقیقی کارنامہ ہے۔

۲۲-تاریخ فیروز شاہی کی ترتیب وتدوین۔

۲۳-تزک جہاں گیری کی ترتیب وتدوین۔

ان دونوں میں جدید تحقیقی اصولوں کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔

1.5.3 سیاسی، سماجی اور دیگر موضوعات پر مشتمل تصانیف

۲۴-اسباب بغاوت ہند- اسے ۱۸۵۸ء میں مراد آباد میں لکھ کر شائع کروایا اور غدر کے وجوہات اور حکومت کی کمزوریوں کی نشاندہی کی ہے۔

۲۵-تاریخ سرکشی بجنور-بجنور میں ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی تفصیلات اور تفصیلی جائزہ پر مشتمل ہے۔

۲۶-رسالہ لائل محمڈنز آف انڈیا (۱۸۶۰ء) یہ انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں شائع ہوا۔اس میں حکومت کے تئیں وفادار مسلمانوں کا ذکر اس مقصد سے کیا گیا ہے کہ انگریزوں کے اندر سے مسلمانوں کے لیے بدگمانی دور ہو سکے۔ یہ ۱۸۶۱ء میں بند ہو گیا۔

۲۷-تسہیل فی جر الثقیل (۱۸۴۴ء) یہ بوعلی کی معروف تصنیف معیار العقول کا ترجمہ ہے، جس میں بھاری بھرکم اشیاء کے اٹھانے اور سخت چیزوں کے چیرنے کے مسائل اور طریقوں کو بیان کیا گیا ہے۔

۲۸-فی عمال الفرجار (۱۸۴۶ء) یہ سرسید کے نانا فرید الدین کے فارسی مسودوں کا ترجمہ ہے۔

۲۹-رسالہ قول متین در ابطال حرکت زمین (۱۸۴۶ء) اس میں زمین کی گردش اور حرکت کو تسلیم کیا گیا ہے۔

۳۰-انتخاب الاخوین (۱۸۴۶ء) یہ قانون کے مسائل پر مشتمل اہم تصنیف ہے۔

۳۱-علاج ہومیو پیتھک (۱۸۶۷ء) ہومیو پیتھک کے طریقۂ علاج اور اس کی حمایت میں ہے۔

۳۲-سیرت فریدیہ- یہ سرسید کے نانا خواجہ فریدالدین کے حالات اور شخصیت کے مختلف گوشوں کو آشکار کرتی ہے اور سرسید کے بچپن کے واقعات کو بھی بیان کرتی ہے۔

1.5.4 ادبی اور صحافتی تصانیف

۳۳-سفر نامہ لندن- اس میں لندن کے سفر سے متعلق تفصیلات درج ہیں اور لندن و یورپ کے عجائبات اور دیگر اہم چیزوں کو بڑے ہی دلچسپ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

۳۴-تہذیب الاخلاق کے مضامین- یہ اپنی طرز تحریر اور اسلوب کے اعتبار سے جدید ادبی نثر کی روایت کو قائم کرتے ہیں۔ گو کہ یہ مختلف النوع موضوعات جیسے تاریخ، سیاست، تہذیب وثقافت، سماجیات ومعاشیات، فلسفہ واخلاق کا احاطہ کرتے ہیں، جن کا مقصد قوم کی اصلاح و بیداری ہے۔

ان کے یہ مضامین مقالات کی شکل میں ۱۶ جلدوں میں الگ الگ موضوعات کے اعتبار سے شائع ہو چکے ہیں۔

۳۵-خطوط سرسید- یوں تو سرسید کے خطوط کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں، البتہ حال ہی میں مولانا آزاد لائبریری کے اسسٹنٹ لائبریرین عطا خورشید کی کاوش سے تقریباً چھ جلدوں میں ان کے خطوط کا مکمل مجموعہ منظر عام پر آچکا ہے۔

1.6 آپ نے کیا سیکھا

آپ سرسید کی شخصیت سے متعارف ہوئے۔

آپ کو سرسید کی زندگی کے حالات وواقعات کا علم ہوا۔

آپ سرسید کی اصلاحی، علمی، ادبی صلاحیتوں سے روشناس ہوئے۔

آپ سرسید کی تمام تصانیف سے متعارف ہوئے۔

آپ سرسید کے دیگر کارناموں اور اہم سرگرمیوں سے واقف ہوئے۔

01.7 اپنا امتحان خود لیجیے

1۔ سرسید کا تعلق کس خاندان سے تھا؟

2۔ سرسید کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

3۔ سرسید کو کن اعزازات سے نوازا گیا؟

4۔ سرسید کی ظاہری شخصیت پر گفتگو کیجیے؟

5۔ سرسید کے اہم رفقاء کون کون ہیں؟

01.8 اپنے جوابات خود دیجیے

1۔ سرسید دہلی کے قدیم خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔آپ کا شجرۂ نسب امام تقی علیہ السلام اور وہاں سے ہوتا ہوا حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جا کر ملتا ہے۔آپ کے آبا و اجداد ہرات سے دہلی منتقل ہوئے تھے۔ سرسید کے ننیہال کا تعلق خواجہ میر درد کے خانوادے سے تھا جو ایک معروف صوفی شاعر تھے۔آپ کے نانا خواجہ فریدالدین اکبر شاہ ثانی کے عہد میں وزارت کے عہدے پر مامور تھے۔ان کی تین بیٹیوں میں عزیزالنساء سب سے بڑی تھیں اور والدہ ہی کی طرح بے حد ذی فہم اور نیک خاتون تھیں۔یہ عزیزالنساء ہی سرسید کی والدہ ماجدہ تھیں۔

2۔ سید احمد کی ولادت ۱۷/اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دلی میں ہوئی۔بچپن سے ہی بے حد تندرست و توانا اور مضبوط قد کاٹھی کے تھے۔آپ کے نانا خواجہ فریدالدین نے پہلی بار جب ان کو دیکھا تو کہہ اٹھے ''یہ تو ہمارے گھر جاٹ پیدا ہوا ہے۔''

3۔ سرسید کو وقتاً فوقتاً کئی اعزازات سے نوازا گیا، جن میں:

۱۸۴۲ء میں بہادر شاہ ظفر نے ان کے خطاب جوادالدولہ میں عارف جنگ کا اضافہ کیا۔

قیام لندن کے دوران آپ کو سی ایس آئی کا خطاب دیا گیا۔

۱۸۷۸ء میں آپ کی خدمات کے اعتراف میں وائسریگل کاونسل کا رکن منتخب کیا گیا۔

۱۸۸۷ء میں لارڈ ڈفرن نے آپ کو سول سروس کمیشن کا رکن مقرر کیا۔

۱۸۸۸ء میں آپ کو کے سی ایس آئی اور سر کا خطاب عطا کیا گیا۔

۱۸۸۹ء میں ایڈنبرا یونیورسٹی کی جانب سے ڈاکٹر آف لاء کی اعزازی سند عطا کی گئی۔

4۔ سرسید احمد خاں سرخ و سپید رنگت رکھنے والے عظیم المرتبت شخص تھے، جن کی پیشانی بے حد کشادہ اور بلند تھی، سر بڑا، بھویں جدا جدا تھیں، کان لمبے اور ناک چھوٹی تھی، داڑھی لمبی اور کافی گھنی تھی۔ لمبے قد کے فربہ جسم والے تھے اور وزن ایک سو چالیس کلوگرام تھا۔چوڑی چکلی ہڈی اور ہاتھ پاؤں بے حد مضبوط تھے۔شانہ اور بازو گوشت سے بھرے ہوئے فولاد کی مانند معلوم ہوتے تھے۔بدن تندرست اور ورزشی و گٹھیلا تھا۔صورت بہت اچھی، دلکش اور بارعب تھی، کرنل گراہم کے مطابق ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک ببر شیر ہمارے سامنے آن کھڑا ہوا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے نانا نے ان کو دیکھتے ہی جاٹ کہہ دیا تھا۔ جوانی میں بے حد وجیہہ اور خوبصورت تھے اور بدن بے حد پھرتیلا اور توانا تھا۔آپ کو دیکھنے والے پر آپ کا رعب و دبدبہ اور ہیبت تادیر قائم رہتی تھی۔

5۔ آپ کا حلقۂ احباب بھی بے حد وسیع تھا۔خواجہ الطاف حسین حالی، محسن الملک، وقارالملک، مولوی ذکاءاللہ، ڈپٹی نذیر احمد، علامہ شبلی، راجہ جے کشن داس، تھیوڈور بک، ماریسن، مولوی ممتاز علی، مولوی سمیع اللہ، زین العابدین، نواب فتح نواز جنگ، خلیفہ محمد حسین، خلیفہ محمد حسن وزراء پٹیالہ، نواب عمادالملک سید حسین بلگرامی، مولوی سید علی، ڈاکٹر سید حسن، محمد حیات خاں، ڈپٹی برکت علی خان، شاہ دین، سر محمد شفیع وغیرہ بے حد اہمیت کے حامل ہیں۔

01.9 فرہنگ

انتشار	بکھراؤ
مروج کرنا	رائج کرنا، چلن میں لانا
استوار	قائم کرنا بنانا
فرسودہ	پرانا
تلف ہونا	ضائع ہونا
راغب	آمادہ
شورش	ہنگامہ
زریں	سنہرا
ازالہ	دور کرنا، کمی کو ختم کرنا
اصرار کرنا	ضد کرنا، زور دینا
تقرری	پوسٹنگ
منتقلی	تبادلہ، ٹرانسفر
ہمنوائی	ساتھ دینا، حمایت کرنا
تشکیل	بنانا، تعمیر کرنا، تیار کرنا

01.10 کتب برائے مطالعہ

1۔ حیات جاوید، الطاف حسین حالی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
2۔ اردو ادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ، منظر اعظمی، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ ۲۰۱۵ء
3۔ سرسید اور ان کا عہد، ثریا حسین، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۳ء
4۔ نامورانِ علی گڑھ، فکر و نظر، پہلا کارواں، طبع سوم، مارچ ۲۰۰۹ء، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

اکائی 2 سر سید احمد خاں کا عہد (سیاسی، سماجی اور معاشرتی صورت حال)

اکائی کی ساخت

02.1 اغراض ومقاصد

02.2 تمہید

02.3 سرسید احمد خاں کا عہد

2.3.1 پس منظر

2.3.2 سرسید احمد خاں کے عہد کی صورت حال

02.4 خلاصہ

02.5 آپ نے کیا سیکھا

02.6 خود سے سوالات کیجیے

02.7 سوالوں کے جوابات

02.8 فرہنگ

02.10 کتب برائے مطالعہ

02.1 اغراض ومقاصد

1۔ طلبہ کو اٹھارہویں صدی کی صورت حال سے آشنا کرنا۔

2۔ طلبہ کو سرسید کے زمانۂ آغاز کے بارے میں واقفیت بہم پہنچانا۔

3۔ طلبہ کو ۱۸۵۷ء کی شورش اور اس کے نتائج کے بارے میں بتانا۔

4۔ طلبہ کو سرسید کے عہد اور ان کی ہم انقلابی سرگرمیوں سے واقف کرانا۔

02.2 تمہید

سرسید انیسویں صدی کے انتشار اور عبوری دور کی پیداوار تھے۔ یہ زمانہ مغل سلطنت کے زوال اور انگریزی حکومت کے استحکام کا تھا۔ ملک کا سیاسی وسماجی نظام درہم برہم تھا۔ عوام تشکیک، کنفیوژن اور خوف میں جی رہی تھی اور اس میں کتنی ہی اخلاقی، سماجی اور تہذیبی خامیاں گھر کر چکی تھیں۔ چوں کہ انگریزوں نے مسلمانوں سے حکومت چھینی تھی، لہٰذا انگریز اُن کو دیگر قوموں کے بالمقابل سب سے بڑا دشمن تصور کرتے تھے۔ ایسی صورت میں عوام پوری طرح پستی کا شکار اور ظلم وستم کا نشانہ بنی ہوئی تھی۔ دوسری جانب قومی ترقی رک گئی تھی اور ملک طبقوں میں منقسم تھا۔ روایتی طور پر مذہب کی تقلید اور بے جا رسوم وقیود کو عوام نے اصل مذہب تسلیم کر لیا تھا اور اخلاقی اقدار بری طرح مجروح ہو چکی تھیں۔ تعلیم محض روایتی طرز پر

موجود تھی اور مغربی علوم کا حصول کفر خیال کیا جاتا تھا۔ بے عملی اور جمود، سستی و کاہلی مسلم قوم کی شناخت بن گئی تھی۔ ایسے دور میں سرسید نے آنکھیں کھولیں۔ ۱۸۵۷ء کی شورش میں وہ خود حکومت کے اہم عہدے پر فائز تھے لہٰذا یہ سارے ہنگامے ان کے سامنے تھے، جن کا انھوں نے مشاہدہ اور تجربہ کیا اور ملک وقوم کی ترقی کے لیے عملی اقدام کیے۔ انھوں نے انگریزوں سے مصالحت ومفاہمت کا رویہ اپنایا اور جدید تعلیم کے فروغ میں منصوبہ بند طریقے سے پوری تن دہی سے مصروف ہوگئے اور تادمِ آخر اس مشن کو آگے بڑھاتے رہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد اور انیسویں صدی کے ربع آخر کو ہم مسلم قوم کے لیے ایک انقلابی عہد سے تعبیر کر سکتے ہیں، جس میں زندگی کے مختلف گوشوں اور ہندوستانی معاشرے میں کئی معنی خیز تغیرات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ یہ سارے اقدامات درحقیقت ایک فرد کی مسلسل جدوجہد کا نتیجہ ہیں، جسے ہم ہندوستانی نشاۃ الثانیہ سے تعبیر کرتے ہیں۔

02.3 سرسید احمد خاں کا عہد

02.3.1 پس منظر

۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب کے بعد اٹھارہویں صدی میں ہندوستان کے سیاسی وسماجی حالات بہت سی تبدیلیوں سے دوچار رہے۔ ایک طرف تو مغل شاہ زادوں کی نااہلی اور باہمی کشمکش سے ہندوستانی اقتدار کی باگ ڈور ڈھیلی پڑی تو دوسری جانب نادر شاہ کی لوٹ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے ہندوستان کو سیاسی واقتصادی بحران کا شکار بنا دیا۔ اس کے علاوہ مرہٹوں، جاٹوں اور سکھوں کے اندرونی خلفشار نے ملک کے نظام کو درہم برہم کر دیا تو دوسری جانب بیرون سے آنے والی پرتگالی، ڈچ، فرانسیسی اور انگریز قوموں نے تجارتی مفاد کی خاطر ہندوستان میں پیر پسارنے شروع کر دیے اور اپنی فوجوں کو داخل کر کے آس پاس کے ان علاقوں پر قبضہ جمانا شروع کر دیا جہاں وہ آباد تھے۔ جب ملک کے انتظامی امور بگڑنے لگے تو زراعت اور کاشتکاری کو جس پر ملک کا زیادہ تر انحصار تھا خسارہ ہونے لگا، ٹیکس میں اضافے ہوئے، امراء خود غرض ہو کر عیش پرستی میں مصروف ہوگئے اور صنعت وحرفت سے توجہ ہٹالی گئی۔ نتیجتاً حکومت کے خزانے خالی ہوگئے۔ حالت یہ ہوگئی کہ مغلیہ حکومت کے پاس قلعوں کی مرمت کے لیے رقم اکٹھا کرنا مشکل ہوگیا۔

یہ وہ دور تھا جب ہندوستان کے باہر یورپ میں صنعتی انقلاب رونما ہو چکا تھا جس کی نمائندگی انگلستان کر رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے انگلستان ایک صنعتی ملک بن گیا۔ سائنس اور ٹکنالوجی اور مشینوں کی صنعتی پیداوار میں اس نے اتنی ترقی کی کہ یورپ کے تمام ممالک اس سے پیچھے رہ گئے۔ دوسری طرف فرانس میں بھی انقلاب آیا اور جاگیردارانہ نظام کا خاتمہ کر دیا گیا۔ اس کے نتیجے میں ایک متوسط طبقے کا وجود عمل میں آیا جس کا اثر پورے یورپ میں بھی محسوس کیا گیا اور قدامت پرستی کا یوں زوال ہوگیا جب کہ ہندوستان قدامت پرستی کی بنیادوں پر کھڑا ہوا تھا اور اپنی تمام تر توہمات اور سماجی رشتوں کے دھاگوں میں لپٹا ہوا اندرونی انتشار کو جھیل رہا تھا۔ ایسی صورت میں یہ تمام بیرونی طاقتیں اپنا سیاسی، سماجی اور تہذیبی تسلط قائم کرنے اور تبدیلیاں لانے کے لیے کوشاں تھیں۔ ان طاقتوں نے آہستہ آہستہ ہندوستانی علاقوں پر قبضہ جما لیا اور

اپنے اثرات مرتب کرنے شروع کر دیے۔ ان اسباب نے مغل حکومت کا شیرازہ بکھیر کر رکھ دیا۔ اس اعتبار سے یہ صدی پے در پے زوال کی ایک تاریخ بن کر رہ گئی۔ معروف تاریخ داں تاراچند اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''لیکن ہندوستان اپنی افسانوی دولت دور دور مشہور فنون اور جگمگاتے ہوئے کلچر کا اکبر اعظم اور شاہ جہاں داراشکوہ کا ہندوستان اٹھارہویں صدی میں اپنی قوت متحرکہ کھو چکا تھا۔ اب بہت سے گاؤں، ذاتوں، قبیلوں، جتھوں اور چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا قرون وسطیٰ کے طرز کا ایک غیر متحرک مجموعہ رہ گیا تھا۔ یہ سب اجزا اس مغل شاہنشاہیت کی ماتحتی میں جو برائے نام رہ گئی تھی ایک ڈھیلے ڈھالے دھاگے میں بندھے ہوئے تھے۔'' (تاریخ تحریک آزادی ہند (جلد اول) تاراچند ص: ۲۵)

ہندوستان کی اس وقت تصویر یہ تھی کہ ہر جگہ خود غرضی عام تھی، اخلاقی قدریں پامال ہو چکی تھیں، دغابازی، فریب، سستی، عیش پسندی عام تھی اور لوگ تقلید کو محض دین سمجھ کر خالی الذہن ہو چکے تھے۔ ہندوستان شروع سے مشترکہ تہذیب وتمدن کا گہوارہ رہا ہے اور سینکڑوں تہذیبیں اس میں پھلتی پھولتی رہی ہیں۔ اس کے اپنے مخصوص رسوم عقائد تھے، روایات وتوہمات اور نفسیات تھی۔ مغل اپنے ساتھ ایرانی تہذیب وتمدن لائے تھے جس نے ہندو تہذیب کے ساتھ مل کر ایک مشترکہ کلچر تعمیر کیا تھا جسے اکبر کے عہد میں تقویت ملی تھی مگر لوگ پھر بھی ذاتوں، قبیلوں، خاندانوں اور رنگوں میں منقسم تھے۔ مالی بدنظمی، امراء کی غداری، قوموں کی سازشوں، زراعت کی کمی، زمینداروں کا تشدد اور اخلاقی پستی نے مغلیہ حکومت کی چولیں ہلا کر رکھ دی تھیں۔ چوں کہ ادب اپنے عہد کا بہترین ترجمان ہوتا ہے لہٰذا اس دور کے شعراء کے کلام کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو یہ صورت حال ہمارے سامنے اجاگر ہوتی ہے جس کا ذکر ابھی اوپر ہوا ہے۔ یہ دور درحقیقت میر، سودا اور درد کا دور ہے۔ میر کے درد بھرے اشعار اس دور کی نفسیاتی، فکر اور ناسازگاری کی جانب اشارہ کرتے ہیں تو سودا کی ہجویں اس دور کی بدحالی کی قلعی کھول کر رکھ دیتی ہیں۔ چند اشعار سودا کے ملاحظہ کیجیے:

گھوڑا لے
اگر نوکری کرتے
ہیں کھوئی
تنخواہ کا پھر عالم بالا
پہ نشاں ہے
گزرے ہے سدا
یوں علف و دانہ کی
خاطر
شمشیر جو گھر میں تو
سپر بنیے کے یاں
ہے

کہتا ہے نفر عزہ کو
اصراف سے جا کر
بی بی نے تو کچھ کھایا
ہے فاقہ سے میاں
ہے

میر کے اشعار بھی دیکھیے:

پیسے والے جو تھے ہوئے ہیں فقیر   تن سے ظاہر رگیں ہیں جیسے لکیر
ہیں معذّب غرض صغیر و کبیر   مکھیاں سی گریں ہزاروں فقیر

دیکھیں
ٹکڑا
اگر
برابر
ماش

سیاسی وسماجی صورت حال کے علاوہ اس عہد کی ادبی صورت حال یہ تھی کہ اسی وقت فارسی کا زوال شروع ہوا اور اردو عام بول چال کا حصہ بننے کے علاوہ اپنی ادبی حیثیت کو منواتی نظر آئی۔ اردو کو دراصل زمانے کی ضرورت نے فروغ دیا اور ایہام گو شعراء نے اسے پوری طرح سے اپنانے کی کوشش کی۔ اس کے بعد درد، سودا اور میر جیسے مایہ ناز شعراء نے اردو کو ایک نئی جست عطا کر دی۔ حالاں کہ نثر میں اگر چہ وہ ترقی نہیں آئی۔ آگے چل کر شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر کے قرآن کے ترجمے ضرور ہوئے۔ مذہبی اور متصوفانہ تصانیف کے علاوہ داستانیں ہی تھیں جن پر عربی وفارسی کے گہرے اثرات تھے اور مقفیٰ و مسجع اسلوب حاوی تھا۔ حالاں کہ ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج نے آسان اور سلیس زبان کا چلن ضرور عام کیا، جس میں بھی انگریزوں کا خاص دخل تھا۔ یہ وہ دور تھا جب سراج الدولہ پلاسی میں، میر قاسم اور شاہ عالم بکسر میں انگریزوں سے جنگ ہار چکے تھے تو اس کے بعد ۱۷۹۹ء میں ٹیپو سلطان کی شہادت ہو چکی تھی اور وہ ایسٹ انڈیا کمپنی جو تجارت کی غرض سے ہندوستان آئی تھی، اس کے بیشتر حصوں پر قابض ہو کر سیاست اور حکومت کر رہی تھی۔ ہندوستانی عوام غلام ہو رہی تھی اور ہندوستانی زمین پر نیل اور افیون کی کھیتی کر کے استحصال کیا جا رہا تھا۔ کسانوں، صنعت کاروں پر جبر و تشدد کر کے ملک کی دولت انگلستان بھیجی جا رہی تھی۔ ۱۷۷۳ء میں انگریزی حکومت کی جانب سے بنائی جانے والی مختلف پالیسیاں ہوں یا ۱۸۱۳ء کا چارٹر جس میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی اجارہ داری ختم کر کے حکومت برطانیہ کا تسلط قائم ہو رہا تھا۔ غرض یہ سب کچھ ہندوستان کے لیے خسارے کا سودا تھا۔

02.3.2 سرسید احمد خاں اور ان کے عہد کی صورت حال

یہ محض حسن اتفاق کہہ لیجئے کہ ۱۸۱۷ء میں سرسید نے دہلی کے معزز خاندان میں آنکھیں کھولیں اور ۱۸۱۸ء میں انگریزوں کی جانب سے اصلاحات کے دور کا آغاز ہوا۔ یہ وہ دور تھا جب انگریزوں نے سنجیدگی سے ہندوستان کی صورت حال کا جائزہ لینا شروع کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیمی، ثقافتی اور سماجی تبدیلیوں کی کوششیں عمل میں آئیں۔ اخبارات کو آزادی نصیب ہوئی۔ ہندوستانیوں کا ایک نیا طبقہ وجود میں آیا اور بیداری کی مہم کا آغاز ہوا۔ ۱۸۳۳ء میں انگلستان میں ریفارم ایکٹ آیا جس نے وہاں انگلینڈ میں عدلیہ، سول اور دیگر انتظامی امور سلطنت میں اصلاحات کا سلسلہ قائم کیا، اس کا اثر ہندوستان میں بھی دیکھنے کو ملا اور یہاں بھی مدراس، ممبئی، بنگال جیسے علاقوں میں یہ انقلابی اقدامات نظر آنے لگے جو اس وقت انگریزوں کے تسلط میں تھے۔ ہندوستان میں منرو، الفنسٹن اور بینٹنگ جیسے افسران نے ہندوستانی قوانین، عدلیہ، تعلیم اور سماج کے حقوق پر خاصا کام کیا۔ الفنسٹن نے اسکول کی ابتدائی اور ثانوی سطح پر زیادہ سے زیادہ ہندوستانی بچوں کی تعلیم پر زور دیا، یورپی سائنس کو عام کرنے کے لیے نئے اسکولوں کا قیام کیا، اخلاقی اور سائنسی کتابوں کو دیسی زبان میں تیار کرنے کا لائحہ عمل تیار کیا۔ بینٹنگ نے ہندوستان سماج کا گہرائی سے جائزہ لیا اور مروجہ رسوم ورواج اور ذات پات کے نظام اور طرز معاشرت کی اصلاح کی۔ اس نے ستی کی رسم کے خلاف ۴/دسمبر ۱۸۲۹ء کو ایک قانون بنا کر اسے جرم قرار دیا اور راجہ رام موہن رائے نے ان کی حمایت کی۔ اسی طرح ہندوستان میں ٹھگی اور ڈکیتی پیشہ ورانہ طریقے سے عام تھی۔ ۱۸۳۶ء میں اسے بھی باقاعدہ جرم قرار دے دیا گیا۔ بعض علاقوں میں بچوں کی بلی اور قربانی کی رسم رائج تھی۔ اور خوشنودی خدا کے لیے کسان بچوں کا گوشت اپنے کھیتوں میں دبا دیتے تھے۔ راجپوتوں میں بچیوں کو مارنے کی جہالت آمیز رسم رائج تھی۔ ان سب کو بھی ممنوع قرار دیا گیا۔ لارڈ میکالے اور بینٹنگ نے انگریزی تعلیم کو ہندوستانیوں کے لیے اہم اور ضروری خیال کرتے ہوئے مشنریوں کو آگے بڑھایا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۸۵۷ء تک تین پریسیڈینیز میں یونیورسٹیاں جنوری ۱۸۵۷ء میں کلکتہ یونیورسٹی، جولائی ۱۸۵۷ء میں بمبئی یونیورسٹی اور ستمبر ۱۸۵۷ء میں مدراس یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔ ان تین کے بعد پنجاب یونیورسٹی کالج لاہور ۱۸۶۶ء اور الہ آباد یونیورسٹی ۱۸۸۷ء میں قائم ہوئی۔

ڈلہوزی نے تعلیم کے فروغ کو مزید آگے بڑھایا، برقی تار، بحری تار کے سلسلے کو بڑی تیزی سے عوام تک پہنچانے کا کام کیا۔ اصلاح اور بیداری کے تعلق سے الفنسٹن کا یہ قول اہمیت کا حامل ہے، جو وہ ایک جگہ اپنی تقریر میں کہتا ہے کہ:

> ''ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ ہندوستانیوں کو اس قابل بنا دیں کہ وہ اپنی حکومت میں اس طرح حصہ لیں جو ہمارے لیے مفید ہو، خود ان کے لیے مفید ہو اور تمام دنیا کے لیے مفید ہو اور اسی شاندار کارنامے کو اس احساس سےہم نے اپنا فرض ادا کیا، اپنی محنت کا سب سے بڑا صلہ سمجھیں۔''
>
> (ہندوستان کی معاشی تاریخ، رمیش دت، ص: ۲۴۹)

سرسید نے اس ماحول کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور اس کے اثرات بھی قبول کیے تھے۔ حالاں کہ آپ کی ابتدائی تعلیم روایتی اور مشرقی طرز پر ہی ہوئی تھی اور آپ کے گھرانے پر مذہبی اثرات پوری طرح موجود تھے۔ خود آپ کے والد

قلعہ معلّٰی سے وابستہ تھے اور وظیفہ وخلعت مقرر تھا، جو آپ کے والد کے بعد سر سید کو پہنچتا تھا۔ لہٰذا سر سید کھلی آنکھوں سے مسلم قوم کی صورت حال، قلعہ معلّٰی کی حالت زار اور ہندوستانی نظام سے بخوبی واقف تھے۔ وہ اس کے ساتھ انگریزوں کی تمام سرگرمیوں سے بھی مطلع تھے اور اس کے مثبت ومنفی اثرات پر غور وخوض کر رہے تھے۔ ان کے سامنے ان انگریز افسران کی اصلاحی اور تعلیمی کوششیں بھی واضح تھیں اور راجہ رام موہن رائے کے حمایتی اور اصلاحی اقدامات سے بھی اثر قبول کر رہے تھے۔ چوں کہ ان کا ذہن کشادہ اور روشن تھا لہٰذا انھوں نے تنگ دامنی کے بجائے فراخ دلی کا ثبوت پیش کرتے ہوئے ہر فکر کا گہرائی سے جائزہ لیا اور حقیقت ان پر پوری طرح واضح ہوگئی تھی۔ مذہبی امور میں بھی ان کے سامنے شاہ ولی اللہ کی تعلیمات تھیں نیز وہ عربی، فارسی، طب، قرآن، حدیث، فقہ اور اس کے اصولوں کا علم حاصل کر چکے تھے۔ امام غزالی کی عقلیت اور استدلالیت کو انھوں نے بڑی حد تک قبول بھی کیا تھا۔ اسی طرح ہندو قوم میں انہیں آریہ سماج کے طرز معاشرت نے متاثر کیا تھا، جہاں ایک بہتر سماج موجود تھا۔ وہ انگریزوں کے بنائے ہوئے تعلیمی نظام کا بھی مشاہدہ ومطالعہ کر رہے تھے اور اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے قیام اور اس کی تشکیل وتعمیر کے سلسلے سے واقف ہو رہے تھے۔ وہ مسلسل اس امر پر غور کر رہے تھے کہ وہ کون سی وجوہات ہیں یا ایسی خوبیاں ہیں جن کے دم پر ایک قوم دوسری قوموں پر حاوی ہو رہی ہے اور وہ کون سے اسباب اور خامیاں ہیں جن کے ذریعہ ایک قوم مسلسل زوال کا شکار ہے۔ سر سید کا ذہن مسلسل تقابلی عمل سے گزر رہا تھا اور مسلسل غور وفکر میں تھا، جس کے خاطر خواہ نتائج بھی سامنے آئے۔

یہی وجہ ہے کہ محض ۲۱ برس کی عمر میں جب آپ کے والد کا ۱۸۳۸ء میں انتقال ہوا تو سر سید نے سیاسی حالات کے پیش نظر اور دور اندیشی ودانشمندی کا ثبوت دیتے ہوئے مغل دربار سے وابستگی اختیار کرنے کے بجائے ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت کرنے کا ارادہ کیا۔ حالاں کہ مشرقی مزاج کا دلدادہ ان کے خاندان اور سارے افراد نے ان کے اس عمل کی مخالفت کی مگر انھوں نے عزم مصمم کر کے اپنے فیصلہ کو برقرار رکھا۔ ۱۸۳۹ء سے ۱۸۵۷ء تقریباً ۱۸ برسوں تک ان کی مختلف عہدوں پر ترقی اور تقرری ہوئی اور اس دوران انھوں نے مختلف علوم وفنون پر دسترس حاصل کی جس کا ذکر مندرجہ بالا سطروں میں ہو چکا ہے۔ اس عہد اور اس عرصہ کو ہم دو قوموں، دو ملکوں، دو تہذیبوں، دو حکومتوں اور قدیم وجدید کا تصادم بھی کہہ سکتے ہیں، جہاں عوام، معاشرہ اور ہر فرد انفرادی طور پر ایک خاص کشمکش اور اضطراب سے دوچار تھا۔ جہاں سائنسی ایجادات، صنعتی ترقیوں اور علوم جدیدہ کی چکا چوند نے پوری دنیا کے ہوش اڑا رکھے تھے، لہٰذا ہندوستان بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھا۔ مگر بغور معائنہ کریں تو یہ دور درحقیقت اشتراک اور امتزاج کا بھی دور تھا۔ اور اس اشتراک وامتزاج میں زبانیں اور علم کی مختلف سطحیں بڑا اہم کردار ادا کر رہی تھیں۔ سر سید اسی اشتراک اور امتزاج کا ایک نمائندہ حصہ تھے۔ انھوں نے اپنی تہذیب وثقافت، اپنی زبان اور مذہب کو باقی رکھتے ہوئے مغرب کے ان اثرات کو اپنایا جو انسانی ترقی اور قوموں کی ترقی کے لیے بے حد ضروری اور اہم تھے، جن کے بغیر انسانی وجود محض بیکار اور خالی ہو کر گمنام ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نئی تعلیم کے فروغ کو انیسویں صدی میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ مغربی علوم کی آمد اور انگریزی تعلیم نے ہندستان میں نئے رجحانات اور افکار کو عام کیا۔ ہندوستانی علوم نے شروع میں اس کے خلاف آواز بلند کی اور ایک خاص قسم کے تہذیبی وتعلیمی تصادم کی صورت نمودار ہوئی۔ مگر وقت کے ساتھ ساتھ لوگ سمجھنے لگے کہ ان علوم کی تحصیل کے بغیر ہم ترقی کی دوڑ میں آگے

نہیں بڑھ سکتے۔اس طرح عوام خود بخود اس جانب مائل ہونے لگی۔ایسی صورت میں تعلیم یافتہ افرادنفسیاتی طور پرخود میں احساس برتری کا جذبہ پانے لگے اور غیر تعلیم یافتہ کو خود سے کمتر سمجھنے لگے۔

بپن چندرا نے اس حوالے سے ایک انگریز افسر کا بیان اپنی کتاب میں نقل کیا ہے۔یہ افسر کچھ عرصے کے لیے بنگال میں رہ کر انگلستان چلا گیا تھا۔جب وہ دوبارہ آیا تو اسے اس بات پر شدید حیرت ہوئی کہ یہ وہی ہندوستانی ہیں جنہیں وہ آٹھ برس قبل اس حالت میں چھوڑ کر چلا گیا تھا کہ وہ انگریزی زبان اور تعلیم وتہذیب کو حاصل کرنے میں عار محسوس کررہے تھے اور آج وہی اسے انگریزی بول کر اور اپنا کر مغربی لباس پہن کر، ہمارے جیسے بن کر دوسروں کے مقابلے فخر محسوس کررہے ہیں۔مغربی اور مشرقی بالخصوص ہندوستان کے روایتی طرز تعلیم میں بڑا واضح فرق موجود تھا۔نہ تو علم کا تصور یہاں اس طرح رائج تھا اور نہ ہی اس کے حصول کا مقصد مناسبت رکھتا تھا۔مغرب میں علم کے حصول پر کسی بھی قسم کی کوئی پابندی نہیں تھی اور سب کو یکساں طور پر حصول علم کے مواقع حاصل تھے جبکہ ہندوستان مختلف طبقوں میں منقسم تھا یہاں علم صرف اشرافیہ کے لیے مخصوص تھا۔اس کے علاوہ حصول علم کا مقصد خداشناسی اور خوشنودیٔ رب زیادہ تھا جبکہ مغرب میں علم کا حصول خالص دنیاوی فلاح اور کامیابی کے لیے تھا۔سرسید ان حقائق سے بخوبی واقف تھے اور وہ جانتے تھے کہ قوم کی ترقی کا راز اسی دنیاوی کامیابی میں ہے جس کے نتیجے میں ہی وہ راستہ ملتا ہے جو خداشناسی تک انسان کی ذات کو پہنچا سکتا ہے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی کئی وجوہات تھیں۔انگریز حکام ہندوستان پر ظلم وجبر، استحصال، قومی برتری اور مختلف تشکیل کردہ انتظامی پالیسیاں، نیز فوج میں انگریز حکام کا فائز ہونا اور ہندوستانی فوجیوں کا فوج میں کوئی مستقبل نہ ہونا، مذہبی احساسات کا مجروح ہونا غرض بہت سی ایسی باتیں تھیں جس کی وجہ سے انگریزوں سے منافرت کا رویہ اس حد تک بڑھ گیا کہ عوام کے اندر پکنے والا لاوا پھٹ پڑا۔آخری مغل بادشاہ بہادرشاہ ظفر کی قیادت میں ہندوستانی انگریزوں سے برسرپیکار ہوئے اور ہندوستان نے ایک تشویشناک صورت حال اختیار کرلی۔سرسید خود اس کا تجزیہ اس طرح کرتے ہیں:

''بہت سی باتیں ایک مدت دراز سے لوگوں کے دل میں جمع ہوتی جاتی تھیں اور بہت بڑا میگزین جمع ہوگیا تھا صرف اس کے شتابے میں آگ لگانی باقی تھی کہ سال گزشتہ میں فوج کی بغاوت نے اس میں آگ لگادی۔'' (رسالہ اسباب بغاوت ہند ۱۸۵۹ء، مفصلائٹ گزٹ پریس، آگرہ، ص:۳)

۱۰ رمئی ۱۸۵۷ء کو شورش میرٹھ سے شروع ہوئی اور چاروں طرف پھیل گئی۔ستمبر ۱۸۵۷ء میں انگریز فوج نے دہلی اور پھر لکھنؤ پر قبضہ کرلیا۔اس طرح ایک مکمل سیاسی نظام کا خاتمہ ہوگیا اور ہندوستان کی دیرینہ تہذیب وثقافت کا شیرازہ بھی بکھر گیا۔علم وہنر کے کتنے ہی مراکز تباہ وبرباد ہوگئے۔غالب کے خط کا یہ جملہ اس حوالے سے یاد کیجیے کہ ''دلی واللہ اب شہر نہیں ہے کیمپ ہے، چھاؤنی ہے۔نہ قلعہ، نہ شہر، نہ بازار، نہ نہر۔'' (خطوط غالب، غلام رسول مہر، غلام اینڈ سنز لاہور، ص:۲۶۹ بحوالہ سرسید اوران کا عہد، ثریا حسین، ص:۲۳)

۱۸۵۷ء کی اس شورش کا سرسید نے نہ صرف یہ کہ مشاہدہ کیا تھا بلکہ خود بھی اس تلخ تجربے سے گزرے تھے۔ایک

طرف تو وہ بجنور میں آن ڈیوٹی اپنے فرائض انجام دے رہے تھے دوسری جانب خدمت خلق بھی انجام دے رہے تھے۔ سرسید نے جہاں بجنور میں انگریزوں کی حفاظت اپنی جان پر کھیل کر کی وہیں دہلی میں ان کا گھر لوٹ لیا گیا۔ جب وہ دہلی گئے تو دیکھا ان کی والدہ اور خالہ ایک کمرے میں بند ہیں۔ دونوں کو وہ میرٹھ لائے مگر والدہ کی صحت خراب ہو چکی تھی اور اسی کیفیت میں ان کا انتقال بھی اکتوبر ۱۸۵۷ء میں ہو گیا۔ سرسید کا کمال یہ تھا کہ انھوں نے اس بدامنی کے دور میں رسالہ اسباب بغاوت ہند، سرکشی ضلع بجنور جیسی تصانیف تحریر کیں اور بغیر کسی لاگ لپیٹ کے انگریز حکومت کے قومی تعصب اور مذہبی منافرت، ظلم و ستم اور عتاب کا ذکر کیا جس کا نشانہ بطور خاص مسلمان بنے تھے اور انگریزوں کو اس جانب توجہ دلائی کہ بغیر مفاہمت اور مصالحت کے دونوں قومیں ترقی یافتہ نہیں بن سکتیں۔ انھوں نے ہر ہر موقع پر مسلمانوں کو بھی راغب کیا کہ وہ انگریزوں کا ساتھ دیں اور ان کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑے ہو کر تعلیمی ترقی کو فروغ دیں۔

ہنگامہ ختم ہونے کے بعد انگریز حکومت نے اپنا رویہ بھی تبدیل کیا اور عوام کو یقین دلایا کہ ان کے مذہب اور عقائد کا تحفظ کیا جائے گا ان کی قابلیت اور تعلیم کے مناسبت سے ملازمتیں دی جائیں گی اور ترقیاں ملیں گی۔ نوابوں اور راجاؤں کے ریاستی معاملات میں دخل اندازی سے گریز کیا جائے گا۔ دوسری جانب ہندوستانی عوام نے بھی تیزی سے مغربی علوم وادب اور سائنسی ترقیوں سے استفادہ کیا اور اپنے اندر مساوات، وطنیت اور قومیت کے جذبے کو بیدار کیا جس کے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے۔

۱۸۶۲ء میں نواب عبداللطیف نے محمڈن لٹریری سوسائٹی کلکتہ میں قائم کی۔ ۱۸۶۶ء میں دیوبند مدرسہ کی تعمیر عمل میں آئی۔ علماء ہندوستان نے قومی اتحاد کی کوششیں کیں۔ ۱۸۵۷ء کے بعد انھوں نے بیداری کو عام کیا۔ غلط رسوم و رواج اور روایتی باتوں کی مخالفت کی۔ معاشرے کی کمزوریوں کو دور کرنے کی کوشش کی۔ تعلیم کو ترقی کی بنیاد بنایا اور مذہبی شدت پسندی کے خلاف آواز بلند کی۔ ان میں مولانا احمد شاہ، حاجی امداداللہ، مولانا قاسم نانوتوی، مولانا عبدالرشید گنگوہی، مولانا فضل حق خیرآبادی اور عبدالقادری لدھیانوی کے نام سرفہرست ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر ہندوستانی مصلحین میں رابندر ناتھ ٹیگور اور کیشب چندر نے بلاتفریق مذہب تعلیم پر زور دیا اور ذات پات، اونچ نیچ اور طبقاتی تقسیم کو غیر ضروری تصور کیا۔ دھرلو نائیڈو نے ۱۸۶۴ء میں ''مدراس وید سماج'' کی بنیاد قائم کی تو مہادیو گووند راناڈے نے ''بمبئی پرارتھنا سماج'' ۱۹۶۶ء میں تشکیل دی۔ برہمو سماج کی تبلیغ کا کام تامل، تیلگو اور مراٹھی میں ترجموں سے کیا گیا تو ۱۸۷۵ء میں سوامی وویکانند نے آریہ سماج کا کام شروع کیا۔ انھوں نے دیسی صنعتوں اور دستکاریوں کو فروغ دینے کے لیے اسکول قائم کیے۔ رام کرشن پرم ہنس نے مذہبی اصلاح کے کام کیے، سریندر ناتھ بنرجی نے انڈین ایسوسی ایشن کی کلکتہ میں بنیاد رکھی اور ۱۸۷۷ء میں راناڈے نے انڈین نیشنل سوشل کانفرنس وہیں قائم کی اور ۱۸۸۵ء میں ہیوم کے ذریعہ انڈین نیشنل کانگریس کا قیام کلکتہ میں ہوا۔ سوامی رام کرشن پرم ہند کی وفات کے بعد ان کے کاموں کو فرغ دینے کے لیے ۱۸۸۶ء میں رام کرشن مشن کی تشکیل عمل میں آئی اور اس کے تحت مغربی فلسفہ اور جدید علوم و خیالات و افکار کو مروج کرنے کا کام تیزی سے عمل میں آیا نیز تعلیم نسواں کو بطور خاص اہمیت دی جانے لگی۔ (بحوالہ سرسید اور ان کا عہد، ثریا حسین، ص: ۲۵)

یہ وہی زمانہ ہے جب سرسید مسلم قوم کی اصلاح اور فلاح و بہبود کی کوششوں میں مصروف تھے اور انہیں سیاسی، سماجی

اور تعلیمی بحران سے بچانے کی سعی کر رہے تھے۔سر سید نے مسلمانوں میں تعلیمی بیداری،علوم جدیدہ اور سائنس کو فروغ دینے،انگریزی علوم و افکار کو مروج کرنے اور حکومت وعوام میں ذہنی ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے کئی کوششیں اور عملی اقدام کیے۔ہم دیکھتے ہیں کہ وہ غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کرتے ہیں جس کا بنیادی مقصد غیر ملکی زبان کی علمی و ادبی کتابوں کا ترجمہ تھا،اس کے علاوہ انھوں نے ایک مدرسہ بھی وہاں قائم کیا جس میں مختلف زبانوں کی تعلیم دی جاتی ہے۔

۱۸۶۴ء میں علی گڑھ منتقلی کے بعد انھوں نے سوسائٹی کا اخبار علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ جاری کیا۔۱۸۶۷ء میں انھوں نے بنارس میں ہومیو پیتھک ڈسپنسری اینڈ ہاسپٹل کھولا۔۱۸۶۸ء میں رسالہ احکام طعام اہل کتاب تحریر کیا جس میں اہل کتاب کے ساتھ کھانے کو مباح اور جائز بتایا گیا۔۱۸۶۹ء میں لندن گئے اور وہاں کی طرز معاشرت،کتب خانوں، اداروں،تعلیم گاہوں کا جائزہ لیا۔دوران قیام ''خطبات احمدیہ'' لکھ کر ولیم میور کے ان اعتراضات کا مدلل جواب دیا جو انھوں نے رسالت مآبؐ کی شخصیت پر کیے تھے۔۱۸۷۰ء میں واپس ہندوستان آ کر ٹیٹلر اور اسپیکٹیٹر کی طرز پر مسلمانوں کی اصلاح اور بیداری کے لیے تہذیب الاخلاق کا اجرا کیا۔۱۸۷۵ء میں تعلیمی مشن کو فروغ دینے کے لیے مدرسۃ العلوم کا سنگ بنیاد رکھا۔۱۸۸۶ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ قائم کی جس کا مقصد ملک کے دیگر حصوں میں تعلیمی صورتحال سے واقف ہونا اور اس سلسلے میں تعلیمی سرگرمیوں کو مزید فعال بنانا تھا۔سیاست سے مسلمانوں کو دور رکھنے اور تعلمی سطح پر مضبوط اور مستحکم بنانے کے لیے انھوں نے ۱۸۸۸ء میں پیٹریاٹک ایسوسی ایشن تشکیل دی۔بغور مطالعہ کریں تو اندازہ ہوگا کہ ان کے عہد میں ہندوستانیوں کی سماجی،سیاسی،معاشی اور تعلیمی ترقی کے لیے جتنا کام دانشوروں اور مصلحوں نے مل کر کیا تھا سر سید نے مسلم قوم کے لیے تن تنہا کر دیا۔ظاہر ہے ان کے سامنے ان کے عہد میں ان مصلحین و مفکرین کی سرگرمیاں موجود تھیں اور انھوں نے ان تمام کا براہ راست یا بالواسطہ دونوں سطحوں پر اثر بھی قبول کیا تھا۔

ثریا حسین نے بجا طور پر تحریر کیا ہے کہ:

''......انیسویں صدی کے اس شکست وریخت کے دور میں مسلمانوں نے بھی اپنے تشخص کی بازیافت کی کوشش کی۔ان میں سر سید احمد خاں ذہنی بیداری کی ایک علامت ہیں۔'' (سر سید اور ان کا عہد،ثریا حسین،ص:۲۶)

خلیق احمد نظامی نے عالمگیر سطح پر اس حوالے سے گفتگو کی ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ:

''ترکی میں مدحت پاشا اور فواد پاشا،ایران میں حجۃ الاسلام شیخ ہادی نجم آبادی،مصر میں مصطفیٰ کمال،تیونس میں خیر الدین پاشا،الجیریا میں امیر عبد القادر سنوسی،نجد میں مولانا عبد الوہاب کے حلقہ فکر کے اکابر،طرابلس میں امام محمد،افغانستان میں سید جمال الدین حسینی،روس میں مفتی خاں اور ہندوستان میں سید احمد خاں نے اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنی زندگیوں کو وقف کر دیا۔'' (سر سید اور علی گڑھ تحریک،ایجوکیشنل بک ہاؤس،علی گڑھ ۱۹۸۲ء،ص:۶۲)

02.4 خلاصہ

اٹھارہویں صدی جس میں سرسید کی شخصیت پروان چڑھی، انقلابات، تغیرات، کشمکش، تصادم، تہذیب وثقافت کی شکست وریخت، اخلاقی اقدار کی پامالی اور زوال، نئی بیداری، مغربی حکومت کے تسلط، مغلیہ حکومت کے زوال، مغربی علوم اور انگریزی تعلیم کے فروغ، روایتی اور فرسودہ تعلیم سے گریز، عقلیت پسندی اور جدید فلسفہ کے عام ہونے کی صدی ہے۔ یہ صدی ہندوستانی عوام کی آزمائش اور ذہنی انتشار کے طویل عرصے کو محیط ہے۔ ہم اسے معاشی اور سیاسی زوال کی صدی بھی کہہ سکتے ہیں۔ مگر یہی دور کئی مثبت اقدامات پر مشتمل بھی ہے۔ اسی دور میں سائنسی ترقیاں ہندوستان کے قدم چوم رہی ہیں تو مختلف توہمات، رسوم وقیود، بے جا ظلم واستبداد اور اعلیٰ طبقہ کے تسلط، مذہبی شدت پسندی کا خاتمہ بھی مختلف اصلاحات کے ذریعہ ہو رہا ہے۔ یہی وہ عہد ہے جب ہندوستان کے کتنے ہی دانشوروں نے اپنی فکر اور روشن خیالی کے ذریعہ عوام الناس کو نئی روشنی عطا کی۔ جن میں راجہ رام موہن رائے، رابندر ناتھ ٹیگور، رام کرشن پرم ہنس، سریندر ناتھ بنرجی، سوامی وویکانند، دھرلونا یئڈو کے علاوہ نواب عبداللطیف، قاسم نانوتوی، مولانا عبدالرشید، حاجی امداداللہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ سرسید واحد ایسے دانشور ہیں جنھوں نے اپنے عہد میں ہندوستان اور مسلم قوم کے لیے بیک وقت سیاسی، سماجی، تہذیبی، علمی، مذہبی اور تعلیمی کارنامے انجام دیے اور مسلمانوں کو ہر سطح پر بیدار کرنے کا کام کیا۔

02.5 آپ نے کیا سیکھا

طلبہ اٹھارہویں صدی کے حالات سے واقف ہوئے۔

طلبہ اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے آغاز میں ہندوستان کی صورت حال سے واقف ہوئے۔

طبہ سرسید کے زمانہ کی اصلاحی کوششوں سے روشناس ہوئے۔

طلبہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور اس وقت کے نازک حالات سے آشنا ہوئے۔

طلبہ ۱۸۵۷ء کے بعد کی مجموعی صورت حال سے واقف ہوئے۔

02.6 اکتسابی جانچ

1۔ ۱۷۰۷ء کے بعد ملک کن مسائل سے دوچار رہا تھا؟

2۔ اٹھارہویں صدی میں ملک اور اس کی عوام کی صورت حال پر روشنی ڈالیے؟

3۔ ۱۸۱۸ء کے بعد انگریزوں نے ہندوستان میں کس طرح کی اصلاحات کیں؟

4۔ سرسید نے اپنے والد کے انتقال کے بعد کون سا اہم قدم اٹھایا؟

5۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد انگریز حکومت نے کیا تبدیلیاں کیں؟

02.7 اپنے جوابات خود دیکھیے

1- ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب کے بعد اٹھارہویں صدی میں ہندوستان کے سیاسی وسماجی حالات بہت سی تبدیلیوں سے دوچار رہے۔ ایک طرف تو مغل شاہ زادوں کی نااہلی اور باہمی کشمکش سے ہندوستانی اقتدار کی باگ ڈور ڈھیلی پڑی تو دوسری جانب نادرشاہ کی لوٹ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے ہندوستان کو سیاسی واقتصادی بحران کا شکار بنا دیا۔ اس کے علاوہ مرہٹوں، جاٹوں اور سکھوں کے اندرونی خلفشار سے ملک کے نظام کو درہم برہم کردیا تو دوسری بیرون سے آنے والی پرتگالی، ڈچ، فرانسیسی اور انگریز قوموں نے تجارتی مفاد کی خاطر ہندوستان میں پیر پسارنے شروع کر دیے اور اپنی فوجوں کو داخل کر کے آس پاس کے ان علاقوں پر قبضہ جمانا شروع کر دیا۔

2- ہندوستان کی اس وقت تصویر یہ تھی کہ ہر جگہ خودغرضی عام تھی، اخلاقی قدریں پامال ہوچکی تھیں، دغابازی، فریب، سستی، عیش پسندی عام تھی اور لوگ تقلید کو محض دین سمجھ کر خالی الذہن ہو چکے تھے۔ مالی بدنظمی، امراء کی غداری، قوموں کی سازشوں، زراعت کی کمی، زمینداروں کا تشدد اور خلاقی پستی نے مغلیہ حکومت کی چولیں ہلا کر رکھ دی تھیں۔

3- ہندوستان میں منرو، الفنسٹن اور بینٹنگ جیسے افسران نے ہندوستانی قوانین، عدلیہ، تعلیم اور سماج کے حقوق پر خاصا کام کیا۔ الفنسٹن نے اسکول کی ابتدائی اور ثانوی سطح پر زیادہ سے زیادہ ہندوستانی بچوں کی تعلیم پر زور دیا، یورپی سائنس کو عام کرنے کے لیے نئے اسکولوں کا قیام کیا، اخلاقی اور سائنسی کتابوں کو دیسی زبان میں تیار کرنے کا لائحہ عمل تیار کیا۔ بینٹنگ نے ہندوستان سماج کا گہرائی سے جائزہ لیا اور مروجہ رسوم ورواج اور ذات پات کے نظام اور طرز معاشرت کی اصلاح کی۔ اس نے ستی کی رسم کے خلاف ۴؍دسمبر ۱۸۲۹ء کو ایک قانون بنا کر اسے جرم قرار دیا اور راجہ رام موہن رائے نے ان کی حمایت کی۔ اسی طرح ہندوستان میں ٹھگی اور ڈکیتی پیشہ ورانہ طریقے سے عام تھی۔ ۱۸۳۶ء میں اسے بھی باقاعدہ جرم قرار دے دیا گیا۔ بعض علاقوں میں بچوں کی بلی اور قربانی کی رسم رائج تھی۔ راجپوتوں میں بچیوں کو مارنے کی جہالت آمیز رسم رائج تھی۔ ان سب کو بھی ممنوع قرار دیا گیا۔

4- محض ۲۱ برس کی عمر میں جب آپ کے والد کا ۱۸۳۸ء میں انتقال ہوا تو سرسید نے سیاسی حالات کے پیش نظر اور دوراندیشی ودانشمندی کا ثبوت دیتے ہوئے مغل دربار سے وابستگی اختیار کرنے کے بجائے ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت کرنے کا ارادہ کیا۔ حالاں کہ مشرقی مزاج کا دلدادہ ان کا خاندان اور سارے افراد نے ان کے اس عمل کی مخالفت کی مگر انھوں نے عزم مصمم کر کے اپنے فیصلہ کو برقرار رکھا۔ ۱۸۳۹ء سے ۱۸۵۷ء تقریباً ۱۸ برسوں تک ان کی مختلف عہدوں پر ترقی اور تقرری ہوئی اور اس دوران انھوں نے مختلف علوم وفنون پر دسترس حاصل کی۔

5- ہنگامہ ختم ہونے کے بعد انگریز حکومت نے اپنا رویہ بھی تبدیل کیا اور عوام کو یقین دلایا کہ ان کے مذہب اور عقائد کا تحفظ کیا جائے گا ان کی قابلیت اور تعلیم کے مناسبت سے ملازمتیں دی جائیں گی اور ترقیاں ملیں گی۔ نوابوں اور راجاؤں کے ریاستی معاملات میں دخل اندازی سے گریز کیا جائے گا۔ دوسری جانب ہندوستانی عوام نے بھی تیزی

سے مغربی علوم وادب اور سائنسی ترقیوں سے استفادہ کیا اور اپنے اندر مساوات، وطنیت اور قومیت کے جذبے کو بیدار کیا جس کے خاطر خواہ نتائج بر آمد ہوئے۔

02.8 فرہنگ

شورش	ہنگامہ
تصادم	ٹکراؤ
تغیرات	تبدیلیاں
شکست وریخت	ٹوٹ پھوٹ
بالمقابل	سامنے، اس کے مقابلے میں
منافرت	ایک دوسرے سے نفرت
تقلید	پیروی
تحفظ	حفاظت
اتباع	پیروی، پیچھے چلنا
گریز	بچنا
شناخت	پہچان
استفادہ	فیض حاصل کرنا، فائدہ اٹھانا
جدوجہد	کوشش، محنت
مصلح	اصلاح کرنے والا
قرون	قرن کی جمع، صدیاں
اجزاء	جز کی جمع، ٹکڑے
زراعت	کھیتی، کاشتکاری
ممنوع	رکا ہوا
فروغ	ترقی
مستثنیٰ	الگ ہونا

02.9 کتب برائے مطالعہ

1۔ سرسید احمد خاں اور ان کا عہد، ثریا حسین، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۱۹۹۳ء

2۔ سرسید اور علی گڑھ تحریک، خلیق احمد نظامی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۱۹۸۲ء

3۔ اردو ادب کی تحریکیں، انور سدید، کتابی دنیا، دہلی ۲۰۰۴ء
4۔ تاریخ تحریک آزادیٔ ہند، تاراچند، رترقی اردو بیورو، نئی دہلی ۱۹۸۰ء
5- نیا ہندوستان، رجنی پام دت، قومی دارالاشاعت، لاہور، سن ندارد

اکائی: 3 سر سید احمد خاں: ملازمت اور سفر انگلستان

ساخت

03.1 اغراض ومقاصد

03.2 تعارف

03.3 سرسید کی ملازمت اور سفر انگلستان

03.3.1 سرسید کی شخصیت

03.3.2 ملازمت کا آغاز (دہلی کی ملازت)

03.3.3 بجنور اور مرادآباد کی ملازمت

03.3.4 غازی پور اور علی گڑھ کی ملازت

03.3.5 بنارس کی ملازمت اور سرسید کا سفر انگلستان

03.4 ماحصل

03.5 اپنا امتحان خود لیجیے

03.6 سوالوں کے جوابات

03.7 فرہنگ

03.8 کتب برائے مطالعہ

03.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ

☆ سرسید کی شخصیت کو بنانے اور سنوارنے میں اُن کی ملازمتوں نے جو رول ادا کیا تھا، اس سے بخوبی واقف ہوں گے۔

☆ سرسید کی ان سیاسی، سماجی، علمی اور تعلیمی خدمات کا مطالعہ کریں گے جنھیں سرسید نے اپنی ملازمتوں کے دوران انجام دیں۔

☆ خاص طور پر دہلی، غازی پور، علی گڑھ اور بنارس کی ملازمت کے دوران سرسید نے جس نوع کے کارنامے انجام دیے، ان سے واقف ہوکر سرسید کے مشن کو بخوبی سمجھ سکیں گے۔

☆ سرسید کے سفر انگلستان اور اس کے بعد انھوں نے جس نوع کے اصلاحی کارنامے انجام دیے، ان سے آگاہ ہوں گے۔

03.2 تعارف

سرسیداس زمانے کی پیداوار ہیں جس میں ہمارا ملک ہندستان تقریباً انگریزوں کا غلام ہو چکا تھااور ہندستانی عوام انگریزوں کے استحصالی و غاصبانہ منصوبوں سے اندر ہی اندر کڑھنے لگے تھے۔یہی نہیں، انگریزوں کے استحصالی رویوں کے باعث یہاں کے عوام انگریزوں سے نفرت بھی کرنے لگے تھے۔لیکن سرسید کا معاملہ اس کے برعکس تھا۔انگریزوں سے تمام تر نفرتوں کے باوجودانھوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت اختیار کی۔یہی وجہ ہے کہ انھیں بعض لوگوں کی مخالفت کا سامنا بھی کرنا پڑا تھا۔انگریزوں سے ہندستانیوں کی نفرت کا عالم یہ تھا کہ بعض ہندستانی سپاہیوں نے 1857 میں انگریزوں کے خلاف بغاوت کا علم بلند کر دیا تھا۔یہی وہ بغاوت ہے جس نے بہت جلد ہندستان کی پہلی جنگ آزادی کی شکل اختیار کر لی تھی۔یہ دیگر بات ہے کہ اس جنگ میں ہندستانیوں کو شکست سے دوچار ہونا پڑا تھا۔اس شکست کے بعد ہر طرف مایوسی اور بے بسی کی فضا قائم ہوگئی تھی۔ان حالات میں سرسید جیسی ہمہ جہت شخصیت نے ہندستانیوں کو مایوسی اور پسماندگی کی دلدل سے نکالنے کے لیے خود کو کمر بستہ کر لیا تھا۔ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت میں رہتے ہوئے بھی سرسید نے ہندستانی عوام کی ترقی کے لیے نت نئی کوششیں کیں۔یہی نہیں، انگلستان گئے تو وہاں بھی انھوں نے قوم کی فلاح و بہبودی کو مقدم رکھااور سفر انگلستان کو ملک وقوم کی تعمیر و ترقی کے لیے بخوبی استعمال کیا۔

03.3 سرسید کی ملازمت اور سفر انگلستان

03.3.1 سرسید کی شخصیت

سرسید احمد خاں کے آباواجداد بنیادی طور پر ہرات کے رہنے والے تھے جنھوں نے اکبر (1556-1605) کے زمانے میں ہندستان کا رخ کیا۔یہاں انھوں نے خود کو مغل دربار سے وابستہ کر کے اس کے زوال تک بے لوث خدمت کی۔سرسید کے دادا سید ہادی نے 1754 میں مغل شہنشاہ عالم گیر ثانی سے ’جواد علی خاں‘ کا خطاب حاصل کیا اور ایک ہزار ذات و پانصد سوار کے منصب پر وہ فائز ہوئے۔بعد میں شاہ عالم نے انھیں ’جوادالدولہ‘ کے خطاب سے نوازا اور عہدۂ احتساب نیز کروڑی صوبہ شاہ جہاں آباد کی خدمت سونپی۔1774 میں قاضیِ لشکر کا عہدہ بھی ان کے سپرد کیا گیا۔

سرسید کے والد سید میر متقی ولد سید ہادی نے بھی وہ تمام خطابات اور اعزازات حاصل کیے جو سید ہادی کو مغل دربار سے ملے تھے۔اس زمانے میں مغلیہ سلطنت برائے نام رہ گئی تھی، اس لیے مذکورہ انعامات اور اعزازات سے انھیں خاطر خواہ مالی فائدہ نہیں ہوا۔سید میر متقی مغل دربار کے ایک بہادر، وفادار اور راست گو افسر تھے۔تیر اندازی اور تیرا کی میں مہارت رکھنے کے باوجود وہ صوفیانہ مزاج رکھتے تھے اور تصوف و آزاد منشی کی طرف

مائل تھے۔ سید متقی، شاہ غلام سے بیعت تھے جو ہندستان کے مشہور صوفیوں اور عالموں میں سے ایک تھے۔

سرسید کا نہ صرف یہ کہ دادیہال بلکہ نانیہال بھی تعلیم یافتہ، معزز اور غیر معمولی صلاحیتوں والا خاندان تھا۔ سرسید کے نانا خواجہ فریدالدین احمد (1828-1747) اپنے زمانے کے رائج علوم، خصوصاً علم ریاضی میں یدِطولیٰ رکھتے تھے۔ انھوں نے اس موضوع پر بہت سے رسالے لکھے اور اپنی کاریگری و ذہنی اختراع سے علم ریاضی کے بعض آلات بھی تیار کیے تھے۔ علم ریاضی میں خواجہ فریدالدین کی شہرت کی وجہ سے سرسید کہا کرتے تھے کہ ریاضی تو میرے گھر کا علم ہے۔ خواجہ فریدالدین کے پاس عمدہ اور معیاری قسم کا ایک کتب خانہ بھی تھا جس سے سرسید نے خوب استفادہ کیا۔ خواجہ فریدالدین کی صلاحیتوں کے پیش نظر اس زمانے میں انھیں سات سو روپے ماہانہ کی تنخواہ پر کلکتہ مدرسہ کا سپرنٹنڈنٹ مقرر کیا گیا تھا۔ 1803 میں ویلیزلی (Wellesley) نے انھیں سرکاری مشن پر ایران بھیجا تاکہ وہ دونوں ملکوں کے تعلقات میں بہتری لاسکیں۔ اس مشن میں خواجہ فریدالدین اس قدر کامیاب ہوئے کہ ان کا وقار مزید بڑھ گیا۔ اس کے بعد وہ برما بھیجے گئے۔ وہاں بھی انھوں نے اپنی مدبرانہ صلاحیتوں کا ثبوت دیا۔ برما سے واپسی کے بعد خواجہ فریدالدین کو بندیل کھنڈ کے علاقے میں مال گزاری وصول کرانے کا کام سونپا گیا۔ علاوہ ازیں باندہ کا تحصیلدار بھی مقرر کیا گیا۔ 1810 میں خواجہ فریدالدین اس کام سے مستعفی ہوکر دہلی واپس آ گئے تھے، لیکن دیکھا کہ دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا ہے اور شہر دہلی ڈیوڈ اکٹرلونی (David Ochterlony) کے زیر انتظام ہے، تو خواجہ فریدالدین بددل ہوکر کلکتہ چلے گئے تھے۔

معاشی بدحالی کے سبب اکبر شاہ ثانی کو اس زمانے میں جب ایک ایسے لائق اور باتدبیر وزیر کی تلاش ہوئی جو بڑھتے ہوئے معاشی بحران کا ازالہ کرسکے تو بادشاہ نے سید متقی سے مالی معاملات کا انتظام سنبھالنے کے لیے کہا لیکن انھوں نے اپنے خسر خواجہ فریدالدین کا نام تجویز کردیا۔ لہٰذا 1815 میں اکبر شاہ ثانی نے خواجہ فریدالدین کو کلکتہ سے طلب کیا اور خلعت وزارت کے ساتھ ساتھ 'دبیرالدولہ امین الملک مصلح جنگ' کا خطاب بھی عطا کیا۔

خواجہ فریدالدین نے اگرچہ اپنی تمام تر تدابیر سے معاشی بدحالی دور کرنے کی کوشش کی لیکن قلعے کے لوگ ان سے مطمئن نہیں ہوئے۔ ان حالات میں انھوں نے اس کام سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ بعدازاں پھر وہ کلکتہ چلے گئے لیکن جلد ہی وہ دوبارہ دہلی بلائے گئے اور انھیں شاہی سلطنت کے مالی امور کا انتظام سونپا گیا۔ تین سال کام کرنے کے بعد وہ اس عہدے سے بھی مستعفی ہوگئے تھے۔ سیاست سے وابستگی کے باوجود خواجہ فریدالدین گہرا صوفیانہ مزاج رکھتے تھے۔ انھی کی بڑی صاحب زادی عزیزالنسا کی شادی سید متقی سے ہوئی تھی اور یہی وہ ممتاز خاندان تھا جس میں سید احمد خاں 5 ذی الحجہ 1232ھ مطابق 17 اکتوبر 1817 کو دلّی میں پیدا ہوئے۔

سرسید کی تعلیم وتربیت میں ان کے نانا خواجہ فریدالدین اوران کی والدہ عزیزالنسا بیگم کا بے حداہم رول رہا ہے۔اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ سرسید کے والدمیر متقی نہایت آزادمنش آدمی تھے۔شاہ غلام علی صاحب کے مرید ہونے کے بعدتو دنیاداری سے وہ مزید بے تعلق ہوگئے تھے۔ان حالات میں اولاد کی تعلیم وتربیت کا انحصارزیادہ تر ان کی بیگم یعنی سرسید کی والدہ پر تھا۔گھر کی چہاردیواری میں مقید رہنے کے باعث اس زمانے کی خواتین میں مناسب سوجھ بوجھ کا فقدان ہوا کرتا تھا،لیکن اس کے برعکس سرسید کی والدہ بے حد دوراندیش خاتون تھیں۔علاوہ ازیں اولاد کی تربیت کے ہنر سے بھی وہ بخوبی واقف تھیں۔

سید متقی کے پیر شاہ غلام علی نے سرسید کا نام'احمد' رکھا۔چار سال اور چار مہینے کے ہوگئے تو سرسید نے باقاعدہ حصول تعلیم کا آغاز کیا۔بچپن میں ان کی پرورش ماں بی بی نام کی ایک دایہ نے کی جن کے انتقال کے وقت سرسید کی عمر محض پانچ سال تھی۔

سرسید کا بچپن ان کے نانا کے گھر امیرانہ ماحول میں بے حد طمطراق سے گزرا۔1828 میں ان کے نانا خواجہ فریدالدین کا انتقال ہوا تو سرسید کی عمر صرف گیارہ سال کی تھی۔بچپن میں اگرچہ بہت زیادہ ذہین یا Genious نہیں تھے لیکن ان کی راست گوئی انھیں کسی بڑے رہنما میں تبدیل کرنے کی جانب ضروراشارہ کررہی تھی۔مثلاً پانچ یا چھے سال کی عمر میں ایک دن زنانہ کمرے سے نکل کر اپنے نانا کے کمرے میں گئے تو دیکھا کہ ان کے نانا ڈیوڈ اکٹرلونی سے محوگفتگو ہیں۔چنانچہ وہ واپس جانے لگے۔سرسید کوواپس جاتے دیکھ ان کے نانا نے انھیں بلایا اور اکٹرلونی سے بات کرنے کو کہا۔اس پر سرسید نے اکٹرلونی سے پوچھا آپ نے ٹوپی میں پَر کیوں لگا رکھے ہیں اور کوٹ میں دوہرے بٹن کیوں لگائے ہیں؟ سرسید کے اس متجسسانہ سوال پر اکٹرلونی بہت خوش ہوا۔اسی طرح سرسید کوایک دن مغل دربار جانا تھا لیکن اس دن وہ دن چڑھے تک سوتے رہے اور تاخیر سے محل پہنچے۔انھوں نے دیکھا کہ بادشاہ تخت سے اٹھ کر ہوادار پر سوار ہو چکے ہیں۔ایک مصاحب نے سرسید کا نام پکارا۔تھوڑی دور چلنے کے بعد بادشاہ تسبیح خانہ کے پاس رک گئے اور سرسید کو بلوایا۔ان کا ہاتھ پکڑا اور تاخیر کی وجہ دریافت کی۔سرسید نے جواب دیا کہ وہ دیر تک سوتے رہے تھے۔درباری ان کی جرأت راست گفتاری پر سہم گئے لیکن بادشاہ مسکرائے اور انھوں نے فرمایا'تمھیں سویرے سوکر اٹھنا چاہیے'۔اکبر شاہ ثانی ہی کے زمانے میں سرسید نے راجہ رام موہن رائے (1772-1833) جیسے عظیم ہندستانی رہنما کو بھی دیکھا اوراپنی کمسنی کے باوجود وہ راجہ رام موہن رائے کی متانت،تہذیب وشائستگی اورعلم وفضل کے مرید ہوگئے تھے۔

سرسید کی شخصیت کونکھارنے اورسنوارنے میں ان کی والدہ عزیزالنسا بیگم کا زبردست رول رہا ہے۔ انھوں نے ہی سرسید کے ذہن کواعلیٰ نصب العین دیا اورزندگی کے تلخ حقائق سے دوچار ہونا سکھایا۔اس کی سب سے بڑی وجہ یہ بھی رہی کہ سرسید 19 سال کے تھے کہ 1836 میں ان کے والد سید متقی کا انتقال ہوگیا اوران کی

تربیت کا سارا بار ان کی والدہ پر آن پڑا تھا۔

سرسید کی والدہ عزیز النسا بیگم تربیت کے معاملے میں بہت سخت واقع ہوئی تھیں۔ سرسید کی کوتاہیوں اور غلطیوں پر وہ اکثر ان سے خفا ہوکر انھیں تنبیہ کیا کرتی تھیں۔ مثلاً سرسید جب گیارہ برس کے تھے تو انھوں نے اپنے گھر کے ایک ضعیف اور پرانے ملازم کو تھپڑ مار دیا تھا جس سے ان کی والدہ ان سے اس قدر خفا ہوگئی تھیں کہ انھوں نے سرسید کو گھر سے نکال دیا تھا۔ سرسید کو ان کی والدہ نے اس وقت تک گھر میں داخلہ نہیں دیا جب تک کہ انھوں نے اس ملازم سے معافی نہ مانگ لی۔ سرسید کی والدہ بے حد جدید خیالات رکھتی تھیں۔ وہ اوہام پسندی سے سخت نفرت کرتی تھیں۔ مثلاً سرسید کے بڑے بھائی سید محمد خاں کا انتقال ایسے وقت میں ہوا جب ان کے خاندان میں ایک رشتہ دار کی بیٹی کی شادی کے تمام انتظامات قریب قریب مکمل ہو چکے تھے۔ لڑکی کے والدین شادی ملتوی کر دینا چاہتے تھے لیکن سرسید کی والدہ نے اس التوا کو خاندان کے لیے غیر ضروری مالی نقصان سے تعبیر کیا۔ وہ لڑکی کے والدین کے پاس گئیں اور انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ شادی کی تقریب معینہ تاریخ پر ہو۔ اس طرح سرسید ایک ایسی ماں کے بیٹے تھے جو بے حد دور اندیش، جدید خیالات کی حامل اور بچوں کی تعلیم و تربیت کا خداداد ملکہ رکھتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ سرسید کی شخصیت پر ان کی والدہ کا بے پناہ اثر ہوا اور آگے چل کر انھوں نے ایک مصلح اور رہنما کی حیثیت سے اپنی زبردست شناخت قائم کی۔

سرسید جس عہد کے پروردہ تھے، اس میں بہت سی ایسی باکمال شخصیات تھیں جن کی صحبت اور گفتگو نے سرسید کی شخصیت میں چار چاند لگائے۔ انھوں نے اپنے عہد کے تقریباً تمام مروجہ علوم کو حاصل کیا۔ اپنی خاندانی وجاہت کے سبب دہلی کی اعلیٰ سوسائٹی میں وہ قدر و منزلت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ قلعہ اور قلعہ سے باہر کے تمام باکمالوں کی مجلس میں سرسید شریک ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شخصیت کی تعمیر اور مزاج کی استواری میں ان باکمال شخصیات نے نمایاں رول ادا کیا۔

سرسید کی پہلی معلّمہ یوں تو ان کی والدہ تھیں، لیکن بعد میں ایک دوسری معلّمہ نے انھیں قرآن شریف پڑھایا۔ ایک مشہور عالم مولانا حمید الدین نے انھیں کریما، خالق باری اور آمد نامہ کا درس دیا۔ مولانا کے انتقال کے بعد سعدی کی گلستاں، بوستاں اور چند دوسری کتابیں پڑھانے کے لیے دوسرے اساتذہ مقرر ہوئے۔ اس کے بعد سرسید نے عربی پڑھنی شروع کی۔ اس سلسلے میں عربی کی چند ابتدائی کتابیں بھی انھوں نے پڑھیں۔ سرسید کو ریاضی پڑھنے کا شوق ہوا تو انھوں نے اپنے ماموں نواب زین العابدین سے ریاضی پڑھی۔ ابھی چند ہی کتابیں پڑھی تھیں کہ انھیں آلات رصد سے دلچسپی ہوگئی اور اپنے ماموں سے اس مضمون میں بھی انھوں نے ضروری معلومات حاصل کیں۔ بعد میں وہ فن طب کی طرف مائل ہوئے اور دہلی کے مشہور طبیب حکیم غلام حیدر کے یہاں کچھ دنوں مطب میں کام بھی کیا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ اٹھارہ یا انیس سال کی عمر تک سرسید نے رسمی تعلیم ختم کرلی تھی۔ انھیں مطالعہ کا بے حد شوق تھا، اس لیے انھوں نے کتابوں کے مطالعے سے اپنا رشتہ برقرار رکھا اور اہل علم حضرات کی صحبت میں اٹھتے بیٹھتے رہے۔ صہبائی، غالب اور آزردہ جیسے اہل علم حضرات سے ان کی زبردست ملاقاتیں ہوتیں جو ازمنہ وسطیٰ کے امین تھے۔ یہی وجہ ہے کہ سرسید کی شخصیت میں ازمنہ وسطیٰ سے محبت نے ایک خاص قسم کی رنگارنگی پیدا کردی تھی۔

1838 میں سرسید کے والد کا انتقال ہوگیا۔ ان کے انتقال کے ساتھ ہی قلعہ سے ملنے والی پنشن بند ہوگئی تھی۔ ان کی والدہ کے نام اگرچہ کچھ رقم جاری رہی، لیکن اس سے سرسید کے گھر کے اخراجات پورے نہیں ہو پاتے تھے۔ ان حالات میں سرسید، جن کی عمر ابھی محض بائیس سال کی رہی ہوگی، ملازمت کرنے کو مجبور ہوگئے تھے۔

03.3.2 ملازمت کا آغاز (ملازمت دہلی)

قلعہ معلیٰ سے سرسید کے گہرے خاندانی تعلقات کے باوجود انھوں نے اپنی معاشی پریشانیوں کو دور کرنے کے لیے قلعہ معلیٰ کی ملازمت پر تکیہ نہیں کیا، بلکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت اختیار کی۔ اس کے لیے سرسید کو اپنے عزیز و اقارب کی مخالفت کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ یہی نہیں، سرسید کے اس فیصلے کے بعد ان کے گھر کی ایک ضعیفہ نے اپنی زندگی کے آخری لمحات تک ان کی صورت تک دیکھنے کو اپنے لیے حرام قرار دے دیا تھا۔ ان تمام حالات کے باوجود سرسید نے اپنی بصیرت اور حقیقت پسندی کے پیش نظر قلعہ کی نوکری پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت کو ترجیح دی۔

سرسید نے اپنی ملازمت کا آغاز 1838 میں دہلی میں صدر امین کے دفتر میں سررشتہ داری سے کیا۔ فروری 1839 میں سرسید کا تبادلہ آگرہ کمشنری میں نائب منشی کے عہدے پر ہوگیا۔ 24 دسمبر 1841 کو وہ مین پوری میں منصف کے عہدے پر فائز ہوئے اور 10 جنوری 1842 کو ان کا تبادلہ فتح پور سیکری ہوگیا۔ تبادلے کے بعد چند روز کی چھٹی لے کر سرسید دہلی آئے۔ یہاں انھیں مغلیہ دربار سے 'جوادالدولہ عارف جنگ' کا خطاب ملا۔ چھٹیاں گزار کر جب وہ فتح پور آئے تو انھوں نے یہاں دلجمعی کے ساتھ کام کیا۔ اس دوران میں انھیں اپنے علمی اور ادبی کاموں کے لیے بھی وقت ملا۔ لہٰذا فتح پور سیکری کی ملازمت کے دوران انھوں نے تین رسالے 'جلاء القلوب بذکر المحبوب' (اکتوبر 1843) جو آنحضرت کی مختصر سوانح ہے، 'تحفۂ حسن' (1844) جو 'تحفۂ اثنا عشریہ' کے باب دہم و دوازدہم کا ترجمہ ہے اور 'تسہیل فی جر الثقیل' (1844) جو 'معیار العقول' کا ترجمہ ہے، لکھے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب سرسید کی طبیعت بے حد رنگین ہوا کرتی تھی۔ عیش و نشاط کی محفلوں اور رنگین صحبتوں کی جانب وہ مائل تھے۔ یار باشی سے لطف اندوز ہونے، پھول والوں کی سیر میں شریک ہونے اور بسنت کے جلسوں

وتماشوں میں جانے کا نہ صرف یہ کہ انھیں بے حد شوق ہوا کرتا تھا بلکہ ان سے خوب لطف اندوز ہوتے تھے۔لیکن 1845 میں ان کے بڑے بھائی سید محمد خاں کے انتقال کے بعد سرسید کی زندگی میں زبردست تبدیلی آ گئی تھی۔ زندگی کے تمام تر لہوولعب سے انھوں نے یکسر منہ پھیر لیا۔سر منڈھوایا،لمبی داڑھی رکھ لی اور راگ رنگ کی محفلوں کو بالکل ترک کر دیا۔بڑے بھائی کے انتقال سے ان کی ماں چونکہ بے حد غمگین رہتی تھیں اس لیے سرسید نے فتح پور سے دہلی کے تبادلہ کے لیے درخواست دی جو منظور ہوگئی اور 18 فروری 1846 کو وہ دہلی چلے آئے جہاں 1854 یعنی مستقل صدر امین ہونے تک رہے۔اس دوران 1850 اور 1853 میں تھوڑی تھوڑی مدت کے لیے وہ روہتک میں قائم مقام صدر امین مقرر ہو کر ضرور گئے۔

دہلی میں ملازمت کے دوران سرسید کو علمی کام کرنے کا بھرپور موقع ملا۔اسی زمانے میں انھوں نے مذہبی علوم میں بھی استعداد پیدا کی۔اس دوران میں ان کی پانچ کتابیں اور رسالے منظر عام پر آئے۔اس حوالے سے 'آثارالصنادید'(1847)، 'کلمۃ الحق'(1849) 'راہ سنت دررد بدعت'(1850)، 'نمیقہ دربیان مسئلہ تصور شیخ' اور 'سلسلۃ الملوک'(1852) کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔

'آثارالصنادید' کا تعلق ہندستانی آثار قدیمہ سے ہے جس کا پہلا ایڈیشن 1847 میں منظر عام پر آیا۔ اس کتاب کے شائع ہوتے ہی علمی حلقوں میں اس کی خوب پذیرائی ہوئی اور اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔مشہور مستشرق گارسان دتاسی نے اس کتاب کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا۔سرسید کے اس علمی کام پر رائل ایشیا ٹک سوسائٹی نے انھیں اپنا فیلو تک مقرر کر لیا تھا۔

مذکورہ بالا دہلی کی اہم تاریخی عمارتوں سے متعلق کتاب کے علاوہ سرسید نے اگرچہ 1849 میں 'کلمۃ الحق'، 1850 میں 'راہ سنت دررد بدعت'، 1852 میں 'نمیقہ دربیان مسئلہ تصور شیخ' اور 'سلسلۃ الملوک' مکمل کی،لیکن دہلی میں ملازمت کے دوران مذکورہ پانچوں کتابوں اور رسالوں میں جو مقبولیت اور شہرت 'آثارالصنادید' نے حاصل کی، وہ کسی دوسری تصنیف کے حصے میں نہیں آئی۔یہی وجہ ہے کہ 1854 میں سرسید نے 'آثارالصنادید' کا دوسرا ایڈیشن شائع کروایا۔

سرسید کو ان کی علمی اور انتظامی صلاحیتوں کے پیش نظر دہلی میں اول درجہ کا منصف بنا دیا گیا۔اب وہ صدر امینی کے عہدے پر سرفراز تھے۔دہلی میں چونکہ ان کا اپنا گھر تھا،اس لیے وہ یہاں سے کسی دوسری جگہ نہیں جانا چاہتے تھے۔اس کے باوجود ایڈورڈ ٹامس (Edward Thoms) کے اصرار پر سرسید کو بجنور منتقل ہونا پڑا۔

03.3.3 بجنور اور مرادآباد کی ملازمت

بجنور کی ملازمت کا آغاز 13 جنوری 1855 کو ہوا۔یہاں سرسید نے اپنے علمی اور ادبی کام کو جاری

رکھا اور ضلع بجنور کی باقاعدہ ایک تاریخ مرتب کی۔ اس میں انھوں نے وہ تمام فرامین شامل کیے جو اکبر اور عالم گیر کے زمانے کے تھے۔ اسی زمانے یعنی 1855 میں انھوں نے 'آئین اکبری' کی تصحیح کر کے اسے اہتمام کے ساتھ شائع کیا۔ علاوہ ازیں بہت سے فلاحی کام کیے۔ مثلاً وہاں کی خراب سڑکوں کی مرمت کروائی اور پُل بنوائے۔

سرسید کو بجنور گئے بمشکل دو سال اور چار مہینے ہی ہوئے تھے کہ 10 مئی 1857 کو ہندستانی سپاہیوں نے میرٹھ میں انگریزوں کے خلاف علَمِ بغاوت بلند کر دیا جس نے اگلے ہی دن (11 مئی 1857) دہلی کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ اس بغاوت کی اطلاع دو تین دن بعد بجنور پہنچی۔ بغاوت کے زمانے میں بجنور میں بیس انگریز تھے جو بدلے ہوئے حالات میں غیر محفوظ ہو گئے تھے۔ سرسید نے انسانی جذبے کے تحت ان کی بے پناہ مدد کی۔ اپنی جان کی پروا کیے بغیر انھوں نے ان کے گھروں کی حفاظت کی۔ بجنور کے نواب محمود نے، جو اس علاقے میں انقلابیوں/ باغیوں کے سرغنہ تھے، جب سرسید سے انقلابیوں/ باغیوں کا ساتھ دینے کو کہا تو انھوں نے انکار کر دیا۔ نواب نے خفا ہو کر سرسید کے مکان پر قبضہ کر لیا اور ان کے تمام سامان کو لوٹ لیا تھا۔ ان حالات میں سرسید نے اگر چہ میرٹھ جانے کا فیصلہ کر لیا تھا، لیکن اسی درمیان میں ہلدور کے چودھری نے نواب محمود خاں کی فوج پر حملہ کر کے شکست دے دی تو سرسید کو بجنور کے انتظامات سنبھالنے پر مجبور ہونا پڑا۔ بجنور میں سرسید نے خود کو غیر محفوظ پایا تو وہ ہلدور چلے آئے اور رات کے اندھیرے میں یہاں سے میرٹھ کے لیے پیدل روانہ ہو گئے۔ پلانی کے قریب دو ہزار مسلح آدمیوں نے انھیں گھیر لیا تو بخشی نام کے ایک شخص نے ان کی جان بچائی اور کسی طرح چاند پور پہنچنے میں سرسید کامیاب ہوئے تھے۔ یہاں بھی کئی ہزار مسلح افراد نے انھیں گھیر لیا لیکن چاند پور کے رئیس میر صادق علی خاں کی بروقت مداخلت سے ان کی جان بچی۔ مچولہ سے گزرتے ہوئے سرسید نچھراؤں پہنچے۔ یہاں سے چند دنوں بعد وہ میرٹھ پہنچے تھے۔

سرسید میرٹھ پہنچے تو ان کے جسم پر ایک پھٹا کرتا اور جیب میں محض چھے پیسے تھے۔ میرٹھ میں سرسید نے پانچ مہینے سے کچھ زیادہ قیام کیا۔ یہیں انھیں دہلی کی بربادی اور اپنے خاندان کی مصیبتوں کا علم ہوا۔ ستمبر کے آخر میں جب وہ دہلی پہنچے تو سرسید کے چچا اور بھائی کا قتل ہو چکا تھا۔ ان کی ماں ایک اصطبل میں کسمپرسی کے عالم میں پڑی ہوئی تھیں۔ ان کے ساتھ دیگر کئی لوگوں نے کئی دن سے کچھ کھایا تھا اور نہ ہی پیا تھا۔ ان لوگوں کی پیاس بجھانے کی غرض سے سرسید جب پانی کی تلاش میں نکلے تو دہلی کے کنوؤں پر انھیں کوئی ایسی چیز نہیں ملی جس سے وہ پانی نکال سکتے لہٰذا وہ قلعے میں گئے اور وہاں سے ایک صراحی پانی لا کر تمام پیاسوں کو پانی پلایا۔ حالات اس قدر خراب تھے کہ وہ اپنی ماں اور خالہ کو لے کر میرٹھ آ گئے۔ یہاں انھوں نے اپنے دوست منشی الطاف حسین سررشتہ دار کے گھر پر قیام کیا۔ اٹھارہ سو ستاون کی جنگِ آزادی میں ہندستانیوں کی شکست کے بعد رونما ہونے والے واقعات سے سرسید کی ماں اس قدر دل برداشتہ ہو گئی تھیں کہ وہ میرٹھ پہنچنے کے چند ہی ہفتے بعد انتقال کر گئیں۔

اٹھارہ سو ستاون میں انگریزوں کے خلاف ہندستانی سپاہیوں کی بغاوت اور ملک کو آزاد کرانے کے لیے ان کے ذریعے چھیڑی گئی اس جنگ کے سرسید چونکہ چشم دید گواہ تھے، اس لیے اس جنگ نے ان کی زندگی میں زبردست تبدیلی پیدا کر دی تھی۔ اب تک سرسید روایتی اور مناظرانہ انداز کی کتابیں لکھا کرتے تھے جن کا کوئی خاص مقصد متعین نہیں تھا لیکن اٹھارہ سو ستاون کے واقعات نے سرسید کو ایک واضح مقصد اور سمت دے دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزوں کے خلاف ہندستانیوں کی جنگ اور اس کے ردعمل میں ہندستانیوں پر ہونے والے مظالم کا سرسید نے اپنی مختلف تحریروں میں کچھ ایسا معروضی تجزیہ پیش کیا جس سے ان کی دوراندیشی اور مدبرانہ صلاحیتوں کا بخوبی مظاہرہ ہوتا ہے۔

یکم اپریل 1858 کو سرسید صدرالصدور بنا کر مرادآباد بھیج دیے گئے۔ یہاں انھوں نے 'سرکشی ضلع بجنور' اور 'اسباب بغاوت ہند' جیسی تاریخ ساز اور دستاویزی اہمیت کی حامل کتابیں لکھیں اور ایک جدید مدرسہ بھی قائم کیا جو بعد میں مسٹر اسٹریچی (Mr. Stretchy) کے قائم کردہ تحصیلی مدرسہ میں ضم کر دیا گیا تھا۔ 1860 میں سرسید نے 'لائل محمڈنز آف انڈیا' نام کا ایک رسالہ جاری کیا۔ یہی وہ سال ہے جس میں شمال مغربی صوبہ میں زبردست قحط پڑا تو اس کے انتظام کے لیے مرادآباد کے کلکٹر اسٹریچی نے سرسید کو مامور کیا۔ سرسید کا دل چونکہ انسانی جذبے سے معمور تھا اس لیے انھوں نے اس کام کو بحسن وخوبی انجام دیا۔

1861 میں جبکہ سرسید مرادآباد میں تھے، ان کی بیوی پاکیزہ بیگم کا انتقال ہو گیا جن سے دو بیٹے — سید حامد اور سید محمود اور ایک بیٹی تھی۔ اس وقت سرسید کی عمر محض چوالیس سال تھی اور وہ دوسری شادی کر سکتے تھے لیکن انھوں نے دوسری شادی نہیں کی۔ اب وہ اپنا بیشتر وقت فلاحی کاموں میں صرف کرنے لگے تھے۔ یہیں انھوں نے 1862 میں ضیاء الدین برنی کی تاریخ فیروز شاہی کی تصحیح کی۔ انجیل مقدس کی تفسیر لکھنے کا ارادہ کیا اور ترکی سے ایک پرنٹنگ مشین بھی منگوائی لیکن قبل اس کے کہ یہ کام شروع ہوتا سرسید کا تبادلہ غازی پور ہو گیا۔

03.3.4 غازی پور اور علی گڑھ کی ملازمت

مئی 1862 میں سرسید غازی پور پہنچے۔ یہاں کے بعد کا ان کا تبادلہ علی گڑھ ہو گیا تھا۔ غازی پور اور علی گڑھ میں اپنی ملازمت کے دوران سرسید نے بے حد اہم اصلاحی کارنامے انجام دیے۔ مثلاً غازی پور میں انھوں نے 'تبیین الکلام فی تفسیر التوراۃ والانجیل علیٰ ملۃ الاسلام' لکھنی شروع کی جسے 1862 کے اخیر میں شائع کروایا۔ 9 جنوری 1864 کو غازی پور میں 'سائنٹفک سوسائٹی' قائم کی اور انگریزی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کروانا شروع کیا۔ اسی سال انھوں نے یہاں ایک مدرسہ بھی قائم کیا جس کے سرپرست اور وزیٹر دیونرائن سنگھ بنائے گئے۔ اس میں پانچ زبانوں- انگریزی، اردو، فارسی، عربی اور سنسکرت- میں تعلیم دینے کا انتظام کیا گیا تھا۔ یہی مدرسہ بعد میں وکٹوریہ ہائی اسکول کہلایا۔ علاوہ ازیں ایک رسالہ بعنوان 'التماس بخدمت ساکنان ہند در باب ترقی اہل ہند'

شائع کی۔ یہی وہ سال ہے جس میں سرسید کا تبادلہ علی گڑھ ہوگیا اور اسی کے ساتھ 'سائنٹفک سوسائٹی' بھی علی گڑھ منتقل ہوگئی۔ یہاں ان کی ملازمت تقریباً تین سال تک رہی۔ اس درمیان میں سرسید نے 'سائنٹفک سوسائٹی' کے زیر انتظام بہت سارے علمی کارنامے انجام دیے۔ یہاں اس سوسائٹی کی فعالیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ مہینے میں کئی بار اس کے جلسے ہوتے جن میں تعلیمی اور عام دلچسپی کے مضامین پڑھے جاتے۔ ہر مہینے طبیعیات کے کسی نہ کسی پہلو پر تقریر کا اہتمام ہوتا اور سامعین کے سامنے عملی تجربات پیش کرتے تھے۔ اس دورانیے میں مکنیکس، برق، نیومیٹکس، نیچر، فلاسفی، جدید زراعت اور ریاضی کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا گیا۔ 30 مارچ 1866 کو سوسائٹی کی جانب سے ایک اخبار 'علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ' جاری ہوا۔ شروع میں یہ ہفتہ وار تھا لیکن بعد میں سہ روزہ ہو گیا تھا۔

اسی نوع کے دیگر فلاحی کاموں کی جانب سرسید نے توجہ دینا شروع کر دی تھی۔ اب انھوں نے علی گڑھ کو اپنے فلاحی اور اصلاحی کاموں کا مرکز بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ 1867 میں سرسید کا تبادلہ بنارس ہوا تو انھوں نے یہاں کی، خاص طور پر سوسائٹی کی ذمہ داریاں اپنے دوست راجہ جے کشن داس کو سونپ دیں جو اس وقت علی گڑھ کے ڈپٹی کلکٹر تھے۔

03.3.5 بنارس کی ملازمت اور سرسید کا سفر انگلستان

اگست 1867 میں سرسید اسال کاز کورٹ کے جج کی حیثیت سے ترقی پا کر بنارس منتقل ہوئے۔ یہاں ان کی ملازمت تقریباً 9 سال تک رہی۔ اس درمیان میں انھوں نے اپنی زندگی کے بے حد اہم کام کیے۔ ان کے بیٹوں سید محمود اور سید حامد کو ولایت جانے کے لیے وظیفہ ملا تو اسی بہانے وہ اپنے بیٹوں کے ساتھ انگلستان گئے تاکہ وہاں کے طور طریق، رسوم و عادات، اخلاق و تربیت اور علمی و سیاسی معاملات کا جائزہ لیں اور ولیم میور (William Muir, 1819-1905) نے اپنی کتاب 'دی لائف آف محمد' (The Life of Mahomet) میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں جس نوع کے گستاخانہ کلمات کا استعمال کیا تھا، اس کا تنقیدی جواب دیں۔

سرسید نے انگلستان کا یہ سفر اپنے بیٹوں سید محمود اور سید حامد، رشتہ دار مرزا خداداد بیگ اور ملازم چھجو میاں کے ساتھ یکم اپریل 1869 کو بنارس سے شروع کیا۔ 1870 کے آخر میں ہندستان لوٹے اور اپنے خیالات کو عملی صورت دینے کے لیے 24 دسمبر 1870 کو ایک رسالہ 'تہذیب الاخلاق' جاری کیا۔ اس رسالے نے جلد ہی مسلمانوں میں نئی تحریک و توانائی پیدا کر دی۔ اس کے جاری کرنے کا مقصد مسلمانوں میں روشن خیالی کو فروغ دینا اور انھیں حصولِ علم کے لیے، جو اُن کی سابقہ روایت تھی، ترغیب دینا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں مذہبی، اجتماعی اور علمی مباحث پر مضامین شائع ہوتے تھے۔

سرسید کے ذہن میں چونکہ شروع ہی سے تمام طرح کی پسماندگی دور کرنے کا مداوا تعلیم کی شکل میں نظر آرہا تھا، اس لیے انگلستان سے آنے کے بعد تعلیمی ترقی کے لیے وہ پہلے سے زیادہ سرگرم ہوگئے تھے۔ چنانچہ 26 دسمبر 1870 کو انھوں نے 'کمیٹی خواستگار ترقیِ تعلیم مسلمانانِ ہند' کی بنیاد ڈالی اور فروری 1873 میں انھوں نے Mohammadan Anglo Oriental (MAO) College کے قیام کا منصوبہ پیش کیا جس پر کافی بحث وتمحیص کے بعد ایک کمیٹی 'خزینۃ البضاعۃ لتاسیس مدرسۃ المسلمین' کی تشکیل کی گئی۔ اس کے لیے سرسید نے خود چندہ اکٹھا کرنا شروع کیا۔

24 مئی 1875 کو علی گڑھ میں 'مدرسۃ العلوم' (M A O College) کا باقاعدہ افتتاح ہوا۔ یکم جون 1875 سے اس میں تعلیم کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ کالج کو جاری ہوئے ایک سال ہوگیا تو سرسید نے یہ ضروری سمجھا کہ وہ علی گڑھ میں مستقل رہیں۔ لہٰذا 1876 میں ملازمت سے سبکدوش ہوکر انھوں نے علی گڑھ میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ یہاں سرسید نے اپنا بیشتر وقت 'مدرسۃ العلوم' کے کام کاج اور اپنے دیگر علمی کاموں میں صرف کرنا شروع کردیا تھا۔ اسی سال انھوں نے تفسیر القرآن لکھنے کی ابتدا کی۔ 8 جنوری 1877 کو لارڈ ایڈورڈ رابرٹ لٹن (Lord Edward Robert Lytton) نے مدرسۃ العلوم کا سنگ بنیاد رکھا اور تقریباً ایک سال بعد یعنی 1878 میں انھوں نے ہی سرسید کو وائسرائے کی کونسل کا ممبر بھی نامزد کردیا۔

علی گڑھ میں رہ کر سرسید نے 'مدرسۃ العلوم' جو آج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے پوری دنیا میں مشہور ہے، کے لیے خوب محنت کی تاکہ ہندستانیوں بالخصوص مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کو دور کرکے انھیں ملک کی ترقی کے ساتھ جوڑا جاسکے۔ اس کے لیے انھوں نے 1883 میں 'محمڈن سول سروس فنڈ ایسوسی ایشن' قائم کی تاکہ اس فنڈ سے مسلم طالب علموں کو انگلستان میں سول سروس کا امتحان دینے کے لیے امداد دی جاسکے یا کسی بھی پیشہ ورانہ (Professional) تعلیم یا یونیورسٹی کی ڈگری حاصل کرنے میں مدد پہنچائی جاسکے۔ یہی وجہ ہے کہ 1885 میں 'انڈین نیشنل کانگریس' کا قیام عمل میں آیا تو سرسید نے اس طرف کوئی توجہ نہیں دی بلکہ 1886 میں 'محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس' قائم کی تاکہ مسلمانوں میں مغربی تعلیم کو اعلیٰ درجے تک پہنچایا جاسکے۔ ساتھ ہی علوم مشرقیہ اور دینیات کی تعلیم کو تقویت دی جاسکے۔ ایسی تعلیم جو قدیم طرز پر مقامی مکتبوں میں جاری ہے، اس کی صورتحال کے پیش نظر اس کی توسیع وترقی کے لیے کوشش کی جاسکے۔ سرسید جانتے تھے کہ مسلمانوں کو جب تک تعلیم یافتہ نہیں بنایا جائے گا، اس وقت تک وہ سیاست میں اچھی طرح حصہ لینے سے قاصر رہیں گے۔ سرسید کی محنت، ایمانداری اور لگن کی بنیاد پر 1887 میں لارڈ ڈفرن (Lord Dufferin) نے انھیں سول سروس کمیشن کا ممبر مقرر کیا۔ یہاں انھوں نے سول سروس کے قانون کو اس شکل میں باقی رکھنے پر زور دیا جس سے ہندستانی طلبا سول سروس کمیشن انگلینڈ کی تقرری کے بغیر اعلیٰ مناصب حاصل کرسکیں۔ 1888 میں سرسید نے 'دی یونائٹیڈ پیٹریاٹک ایسوسی ایشن'

قائم کی۔ اس کا مقصد انگریزی میں رسالے شائع کرنا اور برٹش پارلیمنٹ کے ممبران کو ان ہندوؤں اور مسلمانوں کے نظریات سے واقف کرانا تھا جو کانگریس کی پالیسیوں سے متفق نہیں تھے۔

جیسا کہ ذکر کیا جاچکا ہے، 1885 میں 'انڈین نیشنل کانگریس' کا قیام عمل میں آیا تو سرسید نے اس طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی اور تمام تر کوششوں کے باوجود انھوں نے خود کو اس پارٹی سے الگ رکھا۔ سرسید کے اس رویے سے بعض لوگ نالاں ہوگئے تھے اور انھیں زبردست تنقید کا نشانہ بنایا جانے لگا تھا۔ ان حالات میں سرسید بھی انڈین نیشنل کانگریس پر تنقید کرنے لگے تھے جس کا آغاز انھوں نے 1888 میں کیا۔ سرسید کا ماننا تھا کہ جمہوری طریقۂ کار کی کامیابی کے لیے ملک کے تمام لوگوں کا تعلیم یافتہ ہونا بے حد ضروری ہے۔ ہندستان میں چونکہ ایسی علمی سطح کا اس زمانے میں فقدان تھا، اس لیے سرسید کو اس بات کا خدشہ رہتا تھا کہ جمہوریت کے فوائد چند لوگوں تک محدود ہو کر رہ جائیں گے۔

سرسید جس خلوص، ایمانداری اور مصلحت آمیز انداز میں ہندستانیوں کی فلاح و بہبود کے لیے سرگرم عمل تھے، اس کے اعتراف میں انھیں 1888 میں نائٹ کمانڈ طبقہ اعلیٰ ستارۂ ہند [Knight Commander Star of India (KCSI)] کے اعزاز سے سرفراز کیا گیا۔ 1889 میں ایڈنبرا یونیورسٹی نے سرسید کو ڈاکٹر آف لاز کی اعزازی ڈگری عطا کی۔

سرسید کے تمام تر ایماندارانہ اصلاحی اور فلاحی کاموں کے باوجود انھیں بعض لوگوں کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ خاص طور پر زندگی کے آخری چند برس تو سرسید کے لیے نہایت تکلیف دہ ثابت ہوئے تھے۔ مثلاً 1889 میں انھوں نے مدرسۃ العلوم کے حوالے سے ایک مسودہ تیار کیا جسے انھوں نے اس کے ممبران کے پاس بھیج کر ان کے خیالات جاننے کی کوشش کی تو مولوی سمیع اللہ خاں نے، جو ان کے گہرے دوست اور قوت بازو سمجھے جاتے تھے، اس کی بعض دفعات سے اختلاف کیا۔ خصوصاً اس دفعہ سے جس کے مطابق سید محمود کو جوائنٹ سکریٹری مقرر کیا گیا تھا۔ قرارداد اگرچہ کثرت رائے سے پاس ہوگئی لیکن آخر آخر تک مولوی سمیع اللہ اور ان کے حامیان اس کی مخالفت کرتے رہے جس سے سرسید دل برداشتہ ہوگئے تھے۔ 1895 میں مدرسۃ العلوم کے ایک ہیڈ کلرک نے سرسید اور ٹرسٹیوں کے جعلی دستخط کر کے مختلف مواقع پر بینک سے مبلغ 105570 روپے نکال لیے جس سے سرسید بے حد پریشان اور دلی صدمے سے دوچار ہوگئے تھے۔ یہی وہ زمانہ ہے جس میں ان کے بیٹے سید محمود نے اپنا دماغی توازن کھو دیا جس سے سرسید بالکل ہی ٹوٹ گئے تھے۔

اسی طرح کے بعض دیگر معاملات و مسائل نے اس زمانے میں سرسید کو اگرچہ بددل اور پریشان کر دیا تھا، اس کے باوجود وہ قوم کی خدمت میں مصروف رہے۔ انتقال سے محض آٹھ دن قبل انھوں نے اردو ہندی تنازعہ کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا جسے انھوں نے اردو زبان کی حمایت کے لیے الہ آباد میں بنی کمیٹی کو روانہ بھی

کیا۔ اسی زمانے میں ایک عیسائی مشنری نے ایک رسالے کے ذریعے پیغمبر اسلام اور ان کی ازواج مطہرات پر نہایت دریدہ دہنی سے اعتراضات کیے تو سرسید سے رہا نہ گیا اور وہ اس کا جواب لکھوانے میں مشغول ہو گئے تھے۔ یہ جواب ابھی ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ 24 مارچ 1898 کو ان پر مرض کا شدید حملہ ہو گیا۔ ان کے علاج کے لیے تمام تر کوششیں کی گئیں۔ اس کے باوجود 27 مارچ 1898 کو وہ مالک حقیقی سے جا ملے۔ (انا اللہ وانا الیہ راجعون)

سرسید نے اپنی ملازمت کے دوران خود کو جس نوع کی سرگرمیوں میں مصروف رکھا؛ ہندستان کے سیاسی، سماجی، معاشی، تعلیمی اور مذہبی معاملات و مسائل پر اپنے خیالات کا اظہار کر کے ان میں جس نوع کی اصلاحات کیں، اس نے بہت جلد ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی تھی۔ یہی وہ تحریک ہے جسے ہندستان کی تاریخ میں 'سرسید تحریک' یا 'علی گڑھ تحریک' سے موسوم کیا جاتا ہے جو اصلاً ایک اصلاحی تحریک تھی۔

03.4 آپ نے کیا سیکھا

اس اکائی میں آپ نے

☆ سرسید کی زندگی اور ان کی شخصیت کے بعض پہلوؤں سے آگاہی حاصل کی۔
☆ ہندستان کے ان ان علاقوں سے واقفیت حاصل کی، جہاں جہاں سرسید نے ملازمت کی۔
☆ سرسید کے ان علمی اور اصلاحی کاموں کا مطالعہ کیا، جن پر سرسید نے اپنی ملازمت کے دوران توجہ مرکوز کی۔
☆ خاص طور پر دہلی، غازی پور، علی گڑھ اور بنارس میں اپنی ملازمت کے دوران سرسید نے جس طرح کے علمی، تعلیمی اور فلاحی کام کیے، ان سے بخوبی واقفیت حاصل کی۔
☆ سرسید کے سفر انگلستان، وہاں ان کی مختلف علمی و تہذیبی سرگرمیوں اور انگلستان سے واپسی کے بعد ہندستان میں سرسید نے ملک و قوم کی تعمیر و ترقی کے لیے کیا کچھ کیا، ان تمام سے آگاہی حاصل کی۔

03.5 اپنا امتحان خود لیجیے

1۔ سرسید کب اور کہاں پیدا ہوئے؟
2۔ سرسید نے اپنی ملازمت کا آغاز کب اور کہاں سے کیا؟
3۔ سرسید نے 'آثار الصنادید' کہاں لکھی تھی؟
4۔ 'اسباب بغاوت ہند' کا موضوع کیا ہے؟
5۔ سرسید نے 'سائنٹفک سوسائٹی' کہاں قائم کی تھی؟

6۔ سرسید نے انگلستان کا سفر کہاں کی ملازمت کے دوران کیا تھا؟

7۔ سرسید نے جس نوع کی سیاسی، سماجی، معاشی، تعلیمی، مذہبی اور ادبی و تہذیبی سرگرمیوں میں حصہ لیا، اس نے ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اس تحریک کو مورخین کس نام سے موسوم کرتے ہیں؟

03.6 سوالات کے جوابات

1۔ سرسید 17 اکتوبر 1817 کو دہلی میں پیدا ہوئے۔

2۔ سرسید نے اپنی ملازمت کا آغاز 1838 میں دہلی میں صدر امین کے دفتر سے کیا؟

3۔ سرسید نے 'آثار الصنادید' دہلی میں لکھی تھی۔

4۔ 'اسباب بغاوت ہند' کا موضوع 1857 میں ہوئی ہندستانیوں سپاہیوں کی بغاوت کے اسباب کا پتہ لگا کر انگریزوں اور ہندستانیوں کے درمیان پیدا شدہ غلط فہمیوں کو دور کرنا تھا۔

5۔ سرسید نے 'سائنٹفک سوسائٹی' غازی پور میں قائم کی تھی۔

6۔ سرسید نے انگلستان کا سفر بنارس کی ملازمت کے دوران کیا تھا۔

7۔ سرسید نے جس نوع کی سیاسی، سماجی، معاشی، تعلیمی، مذہبی اور ادبی و تہذیبی سرگرمیوں میں حصہ لیا، اس نے ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اس تحریک کو مورخین 'علی گڑھ تحریک' سے موسوم کرتے ہیں۔

03.7 فرہنگ

لفظ	معنی
فلاح و بہبود	کامیابی اور بھلائی
راست گو	سچا
مدبرانہ	عقل مندی اور سوجھ بوجھ والی/ والا
طمطراق	شان وشوکت، رعب وداب
متانت	سنجیدگی

مصاحب	ساتھی، خاص دوست
اوہام پسندی	فاسد خیالات کو پسند کرنا
التوا	آئندہ پر اٹھا رکھنا، ملتوی کرنا، ٹالنا
مروجہ	جو چیز چل رہی ہو یا رائج ہو
وجاہت	رعب و دبدبہ، خوبصورتی
استواری	مضبوطی، پائیداری
مطب	وہ جگہ یا مکان جہاں طبیب مریضوں کا علاج کرتا ہے
ازمنۂ وسطیٰ	درمیانی زمانہ یا عہد وسطیٰ
بصیرت	بینائی، آگاہی، دور اندیشی
سررشتہ داری	میر منشی، ہیڈ کلرک
یارباشی	زندہ دلی، دوستی
لہو ولعب	کھیل کود، سیر تماشا، تفریح، ہنسی مذاق
استعداد	لیاقت، قابلیت
مستشرق	وہ فرنگی جو مشرقی زبانوں اور علوم کا ماہر ہو
اصطبل	وہ جگہ جہاں گھوڑوں کو رکھا جاتا ہے
مناظرانہ انداز	بحث و مباحثہ والا انداز
مامور	مقرر، متعین، اجازت دیا گیا
معمور	بھرا ہوا، لبریز، آباد
مداوا	علاج، تدبیر، چارہ
دریدہ دہنی	گستاخی، بدزبانی

03.8 کتب برائے مطالعہ

اصغر عباس، سرسید کی صحافت، نئی دہلی: انجمن ترقی اردو ہند، 1975۔

افتخار عالم، سرسید اور سائنٹیفک سوسائٹی، دہلی: مکتبہ جامعہ، 2000۔

الطاف حسین حالی، حیات جاوید، نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، 1982۔

انور سدید، اردو ادب کی تحریکیں (ابتدا تا 1975)، دہلی: کتابی دنیا، 2008۔

ثریا حسین، سرسید احمد خاں اور ان کا عہد، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، 1993۔

خلیق احمد نظامی، سید احمد خاں (مترجم: اصغر عباس)، نئی دہلی: پبلی کیشن ڈویژن، 1971ء
خلیق احمد نظامی، سرسید اور علی گڑھ تحریک، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس،، 2017ء
سید عبداللہ، سرسید اور ان کے نامور رفقا، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، 1994ء
مظہر مہدی، علی گڑھ تحریک، دہلی: انجمن ترقی اردو (ہند)، 1993ء
منظر اعظمی، اردو ادب کے ارتقا میں تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ، لکھنؤ: یوپی اردو اکادمی، 1996ء
نورالحسن نقوی، سرسید اور ہندستانی مسلمان، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، 1979ء

☆☆☆

اکائی: 4 سرسید احمد خان کی شخصیت کے نمایاں پہلو

ساخت

4.1 اغراض ومقاصد
4.2 تمہید
4.3 سرسید احمد خان کا سوانحی تعارف اور حالاتِ زندگی
4.3.1 سرسید احمد خان کی شخصیت کے نمایاں پہلو
4.4 آپ نے کیا سیکھا
4.5 اپنا امتحان خود لیجیئے۔
4.6 سوالات کے جوابات
4.7 فرہنگ
4.8 کتب برائے مطالعہ

4.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ

سرسید احمد خان کے حالاتِ زندگی اور ان کی ادبی خدمات سے واقف ہوں گے۔

سرسید کی قومی وملی خدمات کا جائزہ لے سکیں گے۔

سرسید احمد خان کی شخصیت کے نمایاں پہلوؤں کو جان سکیں گے۔

4.2 تمہید

علوم مشرقیہ کے مستند اسکالر''ایچ۔اے۔ آر گب'' بڑے احترام سے سرسید کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ: ''مایوسی کے اس اندھیرے میں مسلمانوں کو ایک ایسے شخص کی ضرورت تھی جوان کو روشنی میں لے جائے اور ان کی شکستہ دنیا کی تعمیرِ نو کر دے۔ یہ شخص سرسید احمد خان کی شکل میں ظاہر ہوا۔ جیسے جیسے زمانہ گزرتا جاتا ہے اس عظیم راہ نما کی ضرورت نمایاں ہوتی جاتی ہے۔ وہ سادگی، سچائی، بلند دماغی، مقصد کی مضبوطی، جذبِ دل کی گہرائی اور ذاتی کشش جیسی خوبیوں کے مالک تھے۔ ان کی کوشش تھی کہ ان کا فرقہ جدید تعلیم حاصل کرے۔ اس مقصد کو سامنے رکھ کر وہ اپنے کام میں لگ گئے اور سترہ سال کی محنت کے بعد 1877 میں علی گڑھ کی زمین میں محمڈن اینگلو اورینٹل

کالج کھولنے میں کامیاب ہوگئے۔ان کا مقصد تھا کہ کالج سے فارغ طلبا و طالبات فراخ دل، بلند نظر اور پاکیزہ اخلاق کے حامل ہوں۔ان کا اٹھایا ہوا خمیر اب پھیل چکا ہے اور سرسید کے خواب نے دائمی کامیابی حاصل کر لی ہے۔''

سرسید احمد خان ہمارے فکر و شعور کا حصہ ہیں۔تعلیم و تہذیب کا ایک اٹوٹ انگ۔ ہندو ہو یا مسلمان، کسی بھی ذریعہ یا زاویے سے سرسید کے خیالات، نظریات اور ان کی علمی و عملی اقدامات کو نظر انداز کر کے ہندوستان کی تاریخ بالعموم اور مسلمانوں کی تاریخ بالخصوص نہیں لکھ سکتا۔خاص طور پر انیسویں صدی کی تاریخ جو بہت بے رحم اور سفاک صدی تھی۔بحران اور انتشار سے پر۔سرسید نے برِصغیر کے مسلمانوں کے لئے ایسے کڑے وقت میں دست گیری اور راہ نمائی کی جب وہ ہمہ جہت زوال و ادبار کی زد میں تھے۔سرسید کا شمار ہمارے عظیم المرتبت محسنوں میں ہوتا ہے جنہوں نے ساری عمر اپنے زمانہ اور ملتِ مسلمہ کی فلاح و اصلاح کی نذر کر دی۔آپ نے خلق خدا یا اپنی قوم یا وطن کی سچی اور بے لوث خدمت کی اور قوم کو ذلت، زوال اور تباہی سے نکال کر ترقی کے راستے پر لگایا۔

4.3 سرسید احمد خان کا سوانحی تعارف اور حالاتِ زندگی

برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کے عظیم محسن سرسید احمد خان ۵ ذی الحج ۱۲۳۲ ہجری بمطابق 17 اکتوبر 1817 کو دہلی میں پیدا ہوئے۔خود فرماتے ہیں:

''میری پیدائش دہلی کی ہے اور میں وہیں کا رہنے والا ہوں۔''

دلی جو ایک شہر تھا رشکِ جناں وخلد
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''میں مسلمان ہوں۔ ہندوستان کا باشندہ ہوں اور عرب کی نسل سے ہوں۔''

سید احمد 17 اکتوبر 1817 کو دلی میں پیدا ہوئے۔وہ بچپن سے ہی تندرست تھے۔ان کے نانا خواجہ فرید الدین نے جب پہلی بار نواسہ کو دیکھا تو بے اختیار کہا کہ ''یہ تو ہمارے گھر میں جاٹ پیدا ہوا ہے۔'' بڑے ہونے پر وہ گورے چٹے، کشیدہ قامت اور ہاتھ پیر کے مضبوط نکلے۔سید احمد نے تیر اندازی اور تیراکی اپنے والد سے سیکھی جو اپنے زمانے کے ماہرِ فن تھے۔جسم و جان کی تاب و توانائی کے ساتھ وہ دل کے نرم اور زبان کے شیریں تھے۔وہ اپنی خوش طبعی اور بذلہ سنجی کی وجہ سے بھی پسند کئے جاتے تھے۔ان کی راست بازی، ارادہ کی مضبوطی نے انہیں آگے چل کر اپنے مشن میں کامیاب کیا۔وہ ایک اچھے مقرر تھے اور اپنی بات کو مدلل انداز میں پیش کرنا جانتے تھے۔وہ مشرقی تمدن کے پروردہ اور شائق تھے۔لیکن اس کے باوجود مغربی تہذیب کے بھی معترف تھے۔انھوں نے ترکی ٹوپی اور ٹرکش کوٹ کا جو لباس اختیار کیا وہ مشرق و مغرب کے درمیان تہذیبی مصالحت کی ایک علامت

ہے۔

سر سید دہلی کے ایک قدیم خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ان کا شجرہ نسب امام تقیؑ سے جا کر ملتا ہے۔ان کے مورثِ اعلی ہرات سے شاجہاں آباد آئے تھے۔پانچویں پشت اوپر سید احمد خان کے جدِ بزرگ سید محمد دوست نے اورنگ زیب عالمگیر کے لشکر کے ساتھ ساتھ دکن کی مہم میں حصہ لیا تھا۔اوران کی جاں نثاری کی بناپر مغل شہنشاہ نے انہیں ''یکہ بہادر'' کا خطاب دیا تھا۔سید احمد کے دادا سید ہادی فارسی میں شعر کہتے اور صاحبِ دیوان تھے۔ان کے بھائی سید مہدی عالمگیر ثانی کے دربار میں اہم عہدے پر فائز تھے۔خود سید احمد کے والد سید متقی کا مغل دربار سے بالوسطہ تعلق تھا۔

سر سید کا ننیہالی تعلق اردو کے مشہور شاعر خواجہ میر درد کے خاندان سے تھا۔ان کے نانا خواجہ فرید الدین احمد خان صاحبِ علم اور ذی فہم تھے۔وہ اکبر شاہ ثانی کے دور میں عہدہ وزارت پر مامور تھے۔اور ایران کے سفیر بنا کر بھی بھیجے گئے تھے۔سید احمد خان نے ان کی سوانح حیات ''سیرتِ فریدیہ'' کے نام سے لکھی۔خواجہ فرید الدین کی تین بیٹیوں میں سے ''عزیز النسا'' بڑی بیٹی تھیں۔ان کے گھر کا ماحول علمی وادبی تھا۔اس لئے سب ہی بھائی بہن تعلیم کی اہمیت سے واقف تھے۔وہ ذہین اور حلیم الطبع خاتون تھیں۔ان کی شادی میر متقی سے ہوئی۔

۔سر سید کی عظیم شخصیت اور بے مثل سیرت وکردار کی تشکیل وتعمیر میں زیادہ حصہ ان کی والدہ کا ہے۔وہ نیک خاتون تھیں۔سر سید کے والد ایک آزاد منش اور درویش صفت انسان تھے اور زیادہ وقت اپنے مرشد حضرت شاہ غلام علی کی خانقاہ میں گزارتے اور ان کی صحبت میں رہتے تھے۔گھر کا سارا انتظام وانصرام سر سید کی والدہ کے سپرد تھا۔سر سید کی طبیعت اور مزاج پر اپنی والدہ کی عادات وخصائل کا اثر تھا۔مولانا حالی لکھتے ہیں کہ سر سید کی والدہ میں اولاد کو تربیت دینے کا خداداد ملکہ تھا۔اس امر کا بخوبی سر سید کی اپنی تحریر سے لئے گئے اقتباس سے ہوتا ہے۔اپنی والدہ کے بارے میں بتاتے ہیں۔

''جب میں ان کو سبق سناتا یا نئے سبق کا مطالعہ ان کے پاس بیٹھ کر کرتا تو وہ ایک لکڑی جس میں سوت کی گندھی ہوئی تین لڑیں باندھ رکھی تھیں،اپنے پاس رکھ لیتیں۔وہ خفا تو اکثر ہوتی تھیں مگر ان سوت کی لڑوں سے مجھے کبھی مارا نہیں۔''

4.3.1 سر سید احمد خان کی شخصیت کے نمایاں پہلو

سر سید احمد خان بچپن سے دہلی کی وضع میں رہتے تھے۔گول یا چوگوشہ ٹوپی، نیچا کرتا اس پر صدری ٹخنوں سے اونچا مغلئی پاجامہ، گلے میں بڑا سا رومال بندھا رہتا تھا۔ولایت جانے سے پہلے ان کا لباس ہندوستانی طرز کا تھا لیکن جب ولایت جانے کا رادہ کیا تو ان کے دوست مسٹر ہٹن نے جو سر سید کے دوست تھے،انگلستان سے ان کو لکھا کہ (یہاں آؤ تو ترکی لباس پہن کر آنا) یورپین طریقہ پر بود و باش رکھنا،کوٹھی بنگلوں میں آبادی سے الگ رہنا

،میز کرسی لگا کر کھانا کھانا یہ انہوں نے ولایت جانے سے پہلے ہی اختیار کرلیا تھا۔قطع نظر اس کے کہ یہ طریقہ انگریزوں کے میل جول کا ایک ذریعہ تھا۔ بڑا فائدہ اس کا یہ تھا کہ وہ ہندوستانی سوسائٹی میں رہ کر کوئی بڑا کام ہرگز انجام نہ کر سکتے تھے۔

عقائد واعمال، مذہب ومعاشرت:

سرسید عقائد میں قرآنِ مجید اور احادیثِ صحیحہ کے مطابق، نہایت راسخ تھے۔سرسید نے قرآن کے روامز وغوامض اور اعجاز پر جس قدر غور کیا تھا ایسے چند ہی نفوس کرام ہوں گے جو ان کا مقابلہ کرسکیں۔لیکن اس فلسفیانہ اور متکلمانہ نظر کے ساتھ وہ قرآن مجید کے سادہ الفاظ کی برکتوں کے بھی قائل تھے۔فرائض واعمالِ مذہب میں نماز سب سے زیادہ اہم فرض ہے۔اس کی نسبت وہ اپنے دوست سید شرف الدین بلخی کو لکھتے ہیں کہ:

''میرے نزدیک جمع بین الصلواتین جائز ہے۔ میں ایک گناہ گار آدمی ہوں نماز پڑھتا بھی ہوں اور قضا بھی ہوجاتی ہے۔شامتِ اعمال سے اس کی مذمت ہوتی ہے اپنے آپ کو گنہگار سمجھتا ہوں خدا سے معافی چاہتا ہوں۔''

روزے بھی جب تک طاقت رہی برابر رکھتے تھے۔حج کے لئے بھی کبھی استطاعت نہ ہوئی، 1869 میں لندن گئے تو قرض لے کر اور گھر بار بیچ کر اور وہاں سے سب سے زیادہ متبرک چیز ''الخطبات الاحمدیہ'' لائے۔زکوۃ کے لئے کبھی معذرۃ نہ ہوئی اور یوں بھی کچھ آتا تھا اس کا بڑا حصہ مصارفِ خیر اور غربا واعزا کی کفالت ہی میں خرچ ہوتا تھا۔جمع کیا کرتے ضروری لباس بھی ثابت نہ تھا اور مرتے وقت گور وکفن بھی دوسروں نے کیا۔ جہاس بالقلم میں پوری عمر گزار دی۔رسول اللہ سے محبت اس درجہ تھی کہ دورِ اول میں رسالہ ''جلا القلوب'' کی تالیف کی اور دورِ ثالث میں بے مثل محنت وتحقیق سے ''خطباتِ احمدیہ'' تالیف کی۔اور جب تک دماغ میں سوچنے اور ہاتھ میں قلم پکڑنے کی طاقت رہی یعنی انتقال سے ایک ہفتہ قبل تک رسالہ ''امہات المومنین'' کی تالیف میں مصروف رہے۔

سرکاری وعلمی، خطابات واعزازات:

حکومت کی جانب سے جو اعزازات دیے جاتے ہیں وہ عزت ووقار کا باعث ہوتے ہیں۔سرسید کو مغل سلطنت کے آخری وارث نے جو موروثی خطاب دیا وہ کچھ اضافہ کے ساتھ تھا۔ برطانوی دور میں اول مرتبہ 1869 میں ''سی۔ایس۔آئی'' کا خطاب ملا اور زمانہ قیامِ لندن میں وزیرِ ہند نے اس کا تمغہ پہنایا۔دوسری مرتبہ یکم جنوری 1888 کو سی۔ایس۔آئی ''سر'' کے خطاب سے مخاطب ہوئے۔

رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے لندن کی فیلوشپ اور ممبرشپ کا موقع دیا اور ''اڈنمبرا'' یونیورسیٹی کے ایک اعلی منصف اور حامی علوم کی حیثیت سے ''ایل۔ایل۔ڈی'' کی ڈگری دی۔

بیماری ورحلت:

1892 سے سرسید کی طبیعت روز بروز مضمحل و ناساز ہوتی چلی گئی۔مولانا حالی اس زمانے کی کیفیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اگر چہ غبن کے واقعے نے سرسید کی خوش دلی کو بہت مکدر کر دیا تھا مگر اس صدمے سے ان کی طبیعت ایسی مغلوب نہیں ہوئی تھی کہ ان کی ہمت اور کوشش میں فتور آ جائے۔وہ تمام قومی خدمات اپنی قدیم عادات کے موافق برابر انجام دیتے تھے۔اور غبن کے سبب کالج کو جو نقصان پہنچا تھا اس کے تدارک کی فکر سے بھی غافل نہ تھے۔لیکن افسوس ہے کہ بیٹے کی علالت نے جس پر نہ صرف باپ کو بلکہ پوری قوم کو فخر تھا سرسید کو آوے کی طرح بٹھا دیا۔یہ صدمہ اندر ہی اندر کام تمام کرتا جاتا تھا۔مرنے سے دو تین مہینے پہلے ان کو چپ لگ گئی تھی۔ان کے یارِ غار محسن الملک اور سید زین العابدین گھنٹوں ان کے پاس خاموش بیٹھے رہتے تھے۔صحبت کا لطف بالکل جاتا رہا تھا۔ایک دن زین العابدین نے پوچھا آپ ہر وقت چپ کیوں رہتے ہیں؟ سرسید نے جواب دیا ''اب وہ وقت قریب ہے کہ ہمیشہ چپ رہنا ہوگا۔اس لئے خاموش رہنے کی عادت ڈالتا ہوں۔''

کالج کے معمولی کاموں کے علاوہ متعدد آرٹیکل تعلیم پر لکھے۔اردو زبان اور فارسی رسم الخط سے متعلق خط و کتابت کرتے رہے۔کتاب ''ازواجِ مطہرات'' کی تالیف میں رحلت سے آٹھ دن پہلے تک مصروفیت رہی۔24 مارچ سے طبیعت بگڑنی شروع ہوگئی۔ 26,27 مارچ کو نہایت شدید دردِ سر لاحق ہو گیا۔اسی دن شام کو شدید لرزہ کے ساتھ حرارت اور ہذیان کی صورت پیدا ہوگئی۔ان کی عادت تھی کہ بیماری میں ذکر کا ورد کرتے تھے۔چند گھنٹے بعد احتضار شروع ہو گیا اور مارچ 27,28 (یکشنبہ اور دوشنبہ) کی درمیانی شب میں دس بجے انتقال کیا۔مغرب سے کچھ قبل اس جوہرِ بے بہا کو مٹی کے سپرد کر دیا گیا۔گو ابھی کچھ دن باقی تھا مگر معلوم ہوتا تھا گویا آفتاب قبل از وقت ڈوب گیا اور جب واقعی ڈوب گیا تو معلوم ہوتا تھا کہ آدھی رات کی سیاہی چھائی ہوئی ہے۔

سرسید احمد خان کی شخصیت کے نمایاں پہلو:

انسان کے عادات و اخلاقِ حسنہ کا مظہر ہمیشہ اس کی زندگی کا عمل و کردار ہوتا ہے۔اور اسی سے اس کا اندازہ بلکہ صحیح وزن کیا جا سکتا ہے۔سرسید احمد خان کی زندگی سراسر عمل و کردار تھی۔اور یہ ہی چیز اس کے مختلف پہلوؤں میں نمایاں ہے۔یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس عمل و کردار میں کوئی خطا نہ تھی مگر اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اگر کوئی خطا تھی تو وہ اجتہادی اور نیک نیتی پر مبنی تھی۔

سرسید احمد خان کے کارہائے نمایاں جس طرح غیر معمولی اور حیرت میں ڈالنے والے ہیں اسی طرح ان کی شکل و شباہت اور ذاتی عادات و خصائل بھی غیر معمولی اور ناقابلِ فراموش تھے۔مولانا الطاف حسین حالی نے ''حیاتِ جاوید'' میں ان کا حلیہ یوں لکھا ہے۔

’’رنگ سرخ وسفید، پیشانی بلند، سر بڑا اور موزوں بھنویں جدا جدا آنکھیں روشن، نہ چھوٹی نہ بہت بڑی،نسبتاً چہرے کی شان کے مقابلے میں کسی قدر چھوٹی، کان لمبے، چہرہ بارعب ہونے کے باوجود دلکش،جسم بہت فربہ،قد لمبا مگر جسم کی فربہی کے سبب میانہ نما، ہڈی، چکلی، ہاتھ، پاوں اور تمام اعضا نہایت قوی، زبردست اور متناسب، بدن ٹھوس، وزن ساڑھے تین من ۔ بڑھاپے کی وجاہت دلالت کرتی تھی کہ جوانی میں بہت خوب صورت ہوں گے۔ اگرچہ خاموشی اور فکر کے وقت سرسید کا چہرہ نہایت عبوس، ڈراونا معلوم ہوتا تھا۔مگر گفتگو کے وقت اس سے مسرت، زندہ دلی اور مسرت ٹپکتی تھی۔ جس طرح اخلاق میں مطلق تصنع نہ تھا اسی طرح بات چیت میں بالکل بناوٹ نہ تھی۔ زبان دلی کی تھی مگر لب ولہجہ دلی کا سا نہیں معلوم ہوتا تھا۔ زبان قینچی کی طرح جلدی جلدی نہیں چلتی تھی، نہ زیادہ محاورے اور لغت زبان پر آتے تھے محض سیدھے سادے طور پر عام فہم بول چال میں وہ ہر قسم کی باتیں کرتے تھے۔‘‘

کرنل گراہم کی کتاب ’’دی لائف اینڈ ورک آف سرسید احمد خان‘‘ کے شروع میں سرسید کی ایک خوب صورت تصویر دی گئی ہے۔ جب یہ کتاب پہلی دفعہ چھپی تو بمبئی گزٹ میں اس پر جو تبصرہ آیا اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

’’کتاب شروع کرنے سے پہلے جب ہماری نظر سرسید احمد خان کی خوب صورت تصویر پر پڑتی ہے تو ہم ان کی طرف اپنے دل میں ایک لطف انگیز کشش محسوس کرتے ہیں۔ تصویر کیا ہے؟ گویا ایک شیر، پر رعب اور پر ہیبت صورت کا، بہادر اور دلیر، ہمارے سامنے کھڑا ہے۔ ہم حیران ہو کر سوچتے ہیں کہ قدیم جنگ جوئی کے زمانے میں اس شخص کا پیشہ کیا ہوتا۔ اس کی بہادری اور اولعزمی ملکوں کی فتح کرتی، وہی اب دلوں کو فتح اور جہل وتعصب کو تاخت وتاراج کرتی ہے۔‘‘

مولانا حالی کہتے ہیں کہ کسی حکیم کا قول ہے سچائی کی اگر کوئی زندہ شکل وصورت ہوتی تو یقیناً وہ شیر کے صورت میں ظاہر ہوتی۔ سرسید کی صورت سے جو رعب، دبدبہ اور دلیری ٹپکتی ہیوہ درحقیقت ان کے کردار کی مضبوطی ان کے قول وفعل کی صداقت اور ان کے اخلاق کی بلندی تھی۔ پروفیسر آرنلڈ کہتے ہیں کہ ’’میں نے زندگی میں سرسید جیسا شریف اور خوددار شخص کبھی نہیں دیکھا۔‘‘ محمڈن کالج علی گڑھ کے پرنسپال مسٹر تھیوڈ وربک نے جنھوں نے ایک طویل عرصہ سرسید کے ساتھ کام کیا، سرسید کے انتقال پر کہتے ہیں کہ ’’اس کی لیاقتیں بہت بڑی تھیں مگر اس کے اخلاق ان سے بھی بڑے تھے۔‘‘

محبت وصداقت:

محبت والفت کا مادہ سرسید احمد خان میں دیگر لوگوں کی نسبت بہت زیادہ تھا۔ اور اسی لئے ان کے تمام تعلقات میں محبت کا ظہور بدرجہ غایت پایا جاتا ہے۔ وہ اپنے ایک دوست کو دوسرے دوست کی نسبت جس سے کچھ

شکر رنجی ہوگئی ہے لکھتے ہیں

''وہ دوستی و محبت کے معاملات و برتاو سے ناواقف ہیں۔کسی پر وہ عاشق نہیں ہوئے،کسی سے انہوں نے دل نہیں لگایا،ان کو مزہ دوستی اور محبت کا مطلوب علم نہیں،سچ یہ ہے کہ جس شخص نے ایک گھڑی بھی عشق نہیں برتا نہ وہ خدا کی دوستی کا مزہ جانتا ہے نہ انسان کی دوستی کا اور نہ محبت کے لائق ہے۔''

یہ سرسید کی محبت کا ہی دام تھا کہ جس کے باعث رفیقانِ سرسید علامہ شبلی نعمانی،مولانا الطاف حسین حالی ،نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک ،مولوی چراغ علی ،ڈپٹی نذیر احمد ،جیسی عبقری شخصیات ان کی محبت میں گرفت تھے۔محسن الملک کو سرسید کا دستِ راست کہا جاتا ہے،انہوں نے قدم قدم پر سرسید کا ساتھ دیا۔ان کا اصل نام سید مہدی علی تھا۔آپ ایک بہترین مقالہ نگار،قانون کی اچھی سمجھ رکھنے والے اور ماہر سیاست تھے۔سرسید خود بھی ان سے متاثر رہتے اور ان کی تعریف کرتے تھے۔کچھ قلم کاروں نے انہیں سرسید کا محبّ اور محبوب بتایا ہے ۔مولانا الطاف حسین حالی اور سرسید کی محبت و صداقت کا بہترین نمونہ ''مسدس مد و جزر اسلام'' ہے۔جسے حالی نے سرسید احمد خان کے اسرار اور محبت کے تقاضے کی بنا پر تحریر کیا تھا۔علامہ شبلی نعمانی سرسید احمد خان سے چالیس سال چھوٹے تھے باوجود اس کے وہ ایک دوسرے کے قدر دان تھے۔شبلی سرسید کے کچھ معاملات سے اتفاق نہیں رکھتے تھے لیکن یہ سرسید کی محبت کا اثر ہی تھا کہ مولانا شبلی خود کو سرسید سے الگ نہ کر سکے۔

وہ اپنے بے شمار دوستوں کو بڑی خندہ پیشانی اور دل کھول کر خاطر مدارت کرتے ہیں۔ان کے دوستوں میں مسلمان ،سکھ ،ہندو ،انگریز سب شامل ہیں اور یہ دوست ہندوستان کے ہر طبقے سے ان کے پاس آتے ہیں۔ان کے گھر کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں اور اس پر ایک ادبی ماحول چھایا ہوا رہتا ہے۔صبح چار بجے اٹھتے ہیں اور پھر تحریر و تصنیف کا کام کرتے ہیں،پھر آنے والوں سے ملتے ہیں۔جن میں سرکاری اور غیر سرکاری دونوں قسم کے لوگ شامل ہیں۔ساتھ ساتھ اسکول اور کالج کی کمیٹیوں کے معتمد کے فرائض بھی نبھاتے جاتے ہیں۔یہ مصروفیات اکثر رات گئے تک ان کا وقت لے لیتی ہے۔وہ کہا کرتے تھے کہ اعلی درجہ کی دماغی محنت اچھی صحت اور طویل زندگی کی ضامن ہے۔

سرسید ہر حلقہ،ہر گروہ اور ہر مذہب کے افراد سے یکساں محبت کرتے تھے۔اپنے ہم مشرب دوستوں کے بارے میں تہذیب الاخلاق میں لکھتے ہیں کہ :

''ہمارے دوست ہمارے سچے محبوب اور ہمارے سچے محبّ ہیں۔میں بلاشبہ خدا کا نہایت شکر کرتا ہوں بلکہ فخر و ناز کرتا ہوں کہ خدا نے مجھ کو ایسے دوست دیے ہیں کہ اس زمانے میں ایسے دوست ملنے عجائبات سے ہیں۔مگر یہ سمجھنا کہ ہم سب کے خیالات بھی ایک ہیں محض غلط فہمی ہے لیکن میرے رفقا کی معیت میں میں نے دامے درمے سخنے قوم کی ترقی میں حسبِ استطاعت جد و جہد میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔''

خاندان سے محبت:

انسان کی محبت سب سے پہلے اپنے کنبے سے ظاہر ہوتی ہے جو ایک قدرتی تعلق ہے۔ سر سید کو ہمیشہ اپنے اہلِ خانہ سے شدید قلبی لگاؤ رہا ہے۔ بھائی کی موت کا صدمہ ان کو کئی برس تک تھا۔ بہت مدت کے بعد ان کی بھتیجی کے منہ سے بھائی کا ذکر نکلا تھا تب سر سید کی حالت ایسی متغیر ہوگئی کہ آج ہی بھائی کا انتقال ہوا ہو۔ بھائی کے انتقال کے بعد صغیرسن بھتیجے کی انہوں نے ایسی پرورش کی جیسے مائیں اپنے بچے کی کرتی ہیں۔ باوجود یہ کہ بھابھی زندہ تھیں، بھتیجے کو کبھی خود سے جدا نہیں کیا۔ سفر وحضر میں ہمیشہ اس کو اپنے ساتھ رکھا اور مدتوں اپنے ساتھ پلنگ پر سلایا۔ اور ہر طرح سے اس کی دلجوئی کی۔ سر سید احمد خان کی اہلیہ کا انتقال اس وقت ہوا جب ان کی عمر اوپر کچھ چالیس برس تھی۔ اور تین صغیرسن بچے تھے۔ ان کی پرورش اور رکھ رکھاو کیلیے باپ سے ہونا سخت دشوار تھا، ہر چند دوستوں نے سمجھایا کہ دوسری شادی کر لیں، مگر محبت اور وفاداری نے ہرگز اجازت نہ دی۔ ان کے ایک دوست کا بیان ہے کہ ''میں ان کو ہمیشہ دوسرے نکاح کی ترغیب دیا کرتا تھا وہ سن کر ہنسی میں ٹال دیتے تھے، ایک دن وہ برآندے میں ٹہل رہے تھے کہ میں نے پھر وہی ذکر چھیڑا، انہوں نے دردناک لہجے میں کہا ''محمود کی ماں کہاں سے آوے گی''، پھر میں نے یہ ذکر کرنا چھوڑ دیا۔ سر سید اپنے ہر رشتہ دار کے بچوں کو وقتاً فوقتاً نہایت شفقت کے ساتھ سرپرستی کرتے اور ان کی تعلیم وتربیت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتے تھے۔

سر سید بڑی محبت کرنے والے انسان تھے۔ دوستوں اور عزیز رشتہ داروں سے اپنے تعلقات میں وہ جس بے پناہ محبت اور اپنائیت کا اظہار کرتے تھے اس کی مثال نہیں ملتی۔ انہیں اپنی والدہ سے اس قدر محبت تھی کہ والدہ کی وفات کے کوئی 35 سال بعد جب ایک دفعہ وہ میرٹھ میں تقریر کر رہے تھے والدہ کا ذکر کیا اور پھر ان کا دل ایسا بھر آیا کہ آنکھیں تر ہوگئیں۔ اپنے بڑے بھائی سید محمد کی وفات کا آخر دم تک تازہ رہا۔

محبِ قوم :

اپنے وطن کے ساتھ ہر شخص کو الفت اور موانست ہوتی ہے۔ سر سید بھی اپنے وطن سے بہت محبت کرتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جہاں دلی میں ابھی چند خاندان نام ونمود کے باقی تھے اور ہر قسم کے اہلِ کمال اور اہلِ ہنر زمانہ کی بساط کے موافق وہاں موجود تھے۔ قلعہ کا چراغ اگرچہ ٹمٹما رہا تھا مگر گل نہ ہوا تھا۔ سر سید کو جو زندہ دل سوسائٹی وہاں میسر تھی دوسری جگہ اس کے ملنے کی امید نہ تھی۔ مگر غدر کے بعد جب وہاں کے مسلمان بالکل مٹ گئے اور دلی ایک قالب بے روح ہوگئی اب اسی حب وطن کا یہ تقاضہ ہوا کہ جن آنکھوں سے اس کی بہار دیکھی تھی انہیں آنکھوں سے اس کی قضا کیونکر دیکھی جائے۔ گو بظاہر سر سید نے دلی ہمیشہ کے لئے چھوڑ دی تھی لیکن دلی ہمیشہ ان کے دل سے قریب تھی۔ جہاں کہیں ان کے مضامین، تقاریر اور خطوط میں دلی کا ذکر آتا، ان کا دل امڈے بغیر نہیں رہتا تھا۔ ایک

مضمون میں لکھتے ہیں کہ

''اس اجڑے شہر کے اخباروں کا بھی جس کا نام لیتے دل بھر آتا ہے، ہم دل سے شکرادا کرتے ہیں۔ ہمارے وطن کے اخبار ہم سے اس لئے ناراض ہیں کہ مدرس العلوم دہلی میں کیوں نہ مقرر ہوا؟ بھائی! کہاں ہے وہ دلی اور کہاں ہیں وہ دلی والے؟ جو نقش کہ مٹ گیا اس کا اب کیا نام لینا ہے؟ مرثیہ پڑھا کرو اور دلی والوں کو رویا کرو۔''

دلی کا شیرازہ بکھرتے دیکھ سرسید کو بہت صدمہ ہوا۔ اگر غور کر کے دیکھا جائے تو سرسید کے دل میں قوم کی بھلائی اور مستقبل کی فکر کا خیال اور قومی ہمدردی کا جوش زیادہ تر دلی ہی کی تباہی اور بربادی نے پیدا کیا۔ سرسید جیسے ذکی الحس آدمی کے لئے یہ شہر آشوب علاقہ ایک تازیانہ تھا۔ دلی کا سناٹا دیکھ ایسی چوٹ ان کے دل پر لگی جو رفتہ رفتہ زخم اور آخر کار ناسور بن گئی۔ مسلمانوں کی تعلیم کا خیال بھی ان نازک حالات کو دیکھ کر دوبالا ہو گیا تھا۔ حتی یہ کہ دلی کا ہر شخص ان کو خود سے بھی زیادہ عزیز تھا۔ جس کسی شخص کے قدم ان کے یہاں جم گئے بس پھر کو خود سے کبھی جدا نہ کرتے تھے اور نہ وہ ان سے جدا ہونا چاہتا تھا۔

انہیں اکثر اپنے وطنِ مالوف دہلی مرحوم کی یاد ستاتی تھی وہاں کی پرانی صحبتوں کا تذکرہ کرتے تھے۔ اور بچھڑے ہوئے دوستوں کو یاد کرتے تھے۔ ایک دوست کو خط میں لکھتے ہیں۔

''جہاں میں پیدا ہوا، جہاں میرے بزرگوں کی، جہاں میرے عزیزوں کی ہڈیاں اب تک زمین میں پڑی ہیں اور جہاں میرے دوست اور میرے عزیز اب تک رہتے ہیں جس کی مٹی سے لوگوں نے خیال کیا تھا کہ میں بنا ہوا ہوں اور اس میں ہی میری خاک پھر مل جائے گی۔''

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں کہ

''وہاں اکثر دوستوں کا اور بڑے بڑے نامی اور باکمال لوگوں کا مجمع ہوتا تھا غالب کی دلکش اور محبت آمیز بزرگانہ باتوں سے، آزردہ کی دلچسپ اور دلربا فصاحت سے، شیفتہ کی متین و نیم خندہ زن وضع سے، صہبائی جاں نواز کے مئے خانہ محبت سے دل شاد رہتا تھا۔ یہ باتیں تو ایسی صحبتوں کی یادگار ہیں جن کی یاد سے آنسو بھر آتے ہیں۔ کجا وہ صحبتیں اور کجا وہ مجلسیں، کہاں وہ آزردہ اور کہاں وہ شیفتہ اور کہاں وہ صہبائی، کہاں وہ علما اور کہاں وہ صلحا، صرف یاد ہی یاد ہے۔''

تصنیف و تالیف، علمی مشاغل:

سرسید کی ذات مختلف صفات اور غیر معمولی قابلیت کی حامل تھی۔ اصلاحِ معاشرت کی کوشش، مباحثِ علمی میں سرگرمی، تصنیف و تالیف، تحریر و تقریر، مخالفت کا مقابلہ علی گڑھ کے لئے سرمایہ کی فراہمی، انتظامی امور کا مسئلہ تعمیرات کی نگرانی، انجمنوں کے کام اور مجالس کا اہتمام جن کو وہ بیک وقت کامیابی سے انجام دیتے تھے۔ اصل میں یہ ان کے مشاغل تھے جسے وہ بحسن و خوبی ادا بھی کرتے تھے ورنہ کیوں کر ایک وقت میں اتنے کام انجام پاتے؟ سر

سید کی شہرت کا دارومدار ان کی سرکاری حیثیت پر بالکل نہیں وہ ملک میں مصنف اور سیاسی راہنما کی حیثیت سے ممتاز تھے لیکن آپ کی اصل پہچان ایک مدبر، خطیب، مصلح قوم اور مایہ ناز ادیب کی ہے۔ آپ کا طرزِ تحریر سادہ مگر پرزور تھا۔ ان کی تحریریں مغلق اور غریب عربی الفاظ سے جو اس زمانے کا عام انداز تھا خالی ہوتی تھیں۔ ان کے مضامین سبق آموز تھے اور اپنی قوتِ تقریر سے دیسی مجموعوں میں شعلے برساتے تھے۔ سر سید کو تقریر و تحریر کا خداداد ملکہ تھا۔ اگرچہ یہ دونوں خوبیاں مشکل سے ایک جگہ جمع ہوتی ہیں مگر ان کی تقریر کا اثر بھی ایسا ہی ہوتا تھا جیسا کہ ان کے تحریری مضامین کا۔ ہندوستان اور انگلستان کے نامور اشخاص کا بیان ہے کہ سر سید ایک بہترین اوریٹر (مقرر) تھے۔ جب وہ اہلِ اسلام کے متعلق تقریر کرتے تھے تو الفاظ کی روانی اور طبیعت کا جوش اس طرح امنڈ آتا تھا کہ ان کے چہرہ پر اس کا اثر محسوس ہونے لگتا تھا۔ قومی غفلت کا نوحہ کرتے وقت سننے والوں کے دلوں پر تیر و سنان کا کام دیتا تھا۔ اور جو اثر مجموعے پر ہوتا تھا وہ لوگوں کی رنجیدی صورتوں اور آنسوؤں کے قطروں سے ظاہر ہونے لگتا تھا۔

سر سید کے زمانے میں بھی عہدِ منصفی کے لئے ایک امتحان مشروط ہوتا تھا اس تیاری کے لئے سر سید اور ان کے برادر سید محمد نے مل کر ''انتخاب الاخوین'' جاری کیا۔ اور عرصہ تک امیدواران اس سے استفادہ کرتے رہے۔ مذہبی مصنفات و مولفات میں سب سے پہلی کتاب ''جلاء القلوب بذکر المحبوب'' کی تالیف کی۔ سر سید نے متعدد مذہبی و علمی رسائل بھی تصنیف کئے جن میں سے دو علمِ ہندسہ اور حرکت زمین کے متعلق اور کلمۃ الحق، راہِ سنت و نمیقہ عقائد و تصوف میں اور سلسلۃ الملوک فنِ تاریخ میں ہیں۔

اسی دوسرے دور کی تصانیف میں 'طعام اہلِ کتاب، رسالہ 'اسبابِ بغاوتِ ہند' رسالہ ابطال غلامی، رسالہ تحقیقِ لفظ نصاریٰ اور تاریخ سرکشی بجنور کا بھی شمار ہوتا ہے۔ سر سید نے لندن کے سفر سے واپسی کے بعد لندن کے حالات و عجائبات لکھنے شروع کئے تھے جو ''انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' میں شائع ہوتے تھے۔ سیرت و تفسیر کے میدان میں سر سید نے ''سر ولیم میور'' کی کتاب ''لائف آف محمدؐ'' جو تعصّبانہ اور ضعیف روایات پر لکھی گئی تھی اس کے جواب میں سیرت النبی پر ایک مستند کتاب ''الخطبات الحمدیہ فی سیرۃ الحمدیہ'' لکھی۔

سر سید نے مذہب پر خاص تعداد میں کتابیں تصنیف کی ہیں۔ جن کو انہوں نے ایک خاص مقصد سے شائع کروایا تھا۔ جس کی اشاعت کا اپنی زندگی کے ابتدائی ایام میں ان کی مصروفیات بیشتر علمی رہیں۔ تاریخ اور دینیات سے انہیں خاص دلچسپی تھی۔ ان کے تصانیف کی تعداد کثیر رہی ہے۔ ہندوستان اور عرب کے مسلمانوں کے ابتدائی حالات کی تحقیق کا انہیں بے حد شوق تھا۔ قطب مینار کے کتبوں کو نقل کرنے کے لئے وہ اس کی خطرناک منڈیروں سے ایک ٹوکری لٹکا کر اس میں بیٹھ جاتے تھے۔ سب سے پہلے انہوں نے قطب الدین کے دہلی فتح کرنے کی تاریخ کا تعین کیا تھا۔ آثارِ قدیمہ کے بعض دوسرے حقائق بھی انہیں کی بدولت روشنی میں آئے۔ اس زمانے میں آثار الصنادید اور آئینِ اکبری کی تصحیح زبردست علمی کام قرار پائے۔

۳ آثار الصنادید: آثار الصنادید اس کتاب کی ترتیب و تالیف میں سرسید نے جس قدر محنت کی ہے اور منہمک رہے ہیں وہ کسی تحقیقاتِ عصری کے آج کل کی طرح بڑے بڑے پہاڑوں کی چوٹیاں سر کرنے سے کم نہ تھا۔ مولانا حالی لکھتے ہیں کہ:

''بابر کی عمارتوں کی تحقیقات کرنا ایک نہایت مشکل کام تھا۔ بیسوں عمارتیں ٹوٹ پھوٹ کر کھنڈر ہوگئیں تھیں۔ اکثر عمارتوں کے کتبے پڑھے نہ جاتے تھے۔ بہت سے کتبوں سے ضروری حالات معلوم نہ ہو سکتے تھے۔ اکثر عمارتوں کے ضروری حصے معدوم ہو چکے تھے۔ اور جو متفرق اور پراگندہ اجزا باقی رہ گئے تھے ان سے کچھ پتہ نہ چلتا تھا کہ یہ عمارت کیوں تباہ کی گئی تھی۔ کتبوں میں جن بانیوں کے نام لکھے گئے تھے ان کا مفصل حال معلوم کرنے کے لئے تاریخ کی طرف رجوع کرنا پڑتا تھا۔ سرسید کہتے تھے کہ قطب صاحب کے بعض کتبے جو زیادہ بلند ہونے کے سبب پڑھے نہ جا سکتے تھے ان کے پڑھنے کو ایک چھینکا لٹکا کر، خود میں اوپر چڑھ کر اور چھینکے میں بیٹھ کر کتبے کا چربہ اتارتا تھا۔''

سرسید کے دل میں اپنے وطن کی محبت کا جو مادہ اور قوم کی عظمتِ رفتہ کا جو احساس تھا دراصل وہ ہی اس کتاب کی تالیف، جسمانی محنت، انہماک، دماغ سوزی، فراہمی حالات میں سرگرمی کا باعث ہوا۔

سرسید نے مذہب پر خاص تعداد میں کتابیں تصنیف کی ہیں۔ جن کو انہوں نے ایک خاص مقصد سے شائع کروایا تھا۔ جس کی اشاعت کا ناگزیر نتیجہ مخالفت کا وہ طوفان تھا جو آخر دم تک کم نہ ہوا۔ لیکن باوجود اس کے سرسید نے جس آسانی اور قدرت کے ساتھ اس مسائل پر دادِ تحقیق دی ہے اور مجتہدانہ موشگافیاں کی ہیں وہ ان کی مصروفیات کو دیکھتے ہوئے عجیب بات معلوم ہوتی ہے۔ پھر سفر و حضر، ملازمت و ہجوم، مشاغل، دوست احباب کے جلسے کوئی چیز بھی ان کے شغلِ تصنیف و تالیف میں سدِ راہ نہ ہوتی تھی۔ اور ان کا قلم چلتا ہی رہتا تھا۔ سرسید کے کل تصنیفات کی تعداد دو درجن سے زیادہ ہے۔

یوں تو سرسید کے احسانات گوناگوں ہیں۔ لیکن ان کا ایک بڑا احسان اردو پر ہے۔ زبان کو پستی سے نکالا، اندازِ بیاں میں سادگی کے ساتھ قوت پیدا کی اور سنجیدہ علمی مضامین لکھنے کی روایت ڈالی۔ سرسید اردو زبان کی حمایت میں آخری دم تک لڑتے رہے۔ سرسید کو فطری طور پر ادب و سخن کا مذاق تھا۔ مولانا شبلی نے ''سرسید اور اردو لٹریچر'' کے عنوان سے ایک بسیط مضمون تحریر و شائع کیا تھا اس میں لکھتے ہیں کہ:

''سرسید کے جس قدر کارنامے ہیں اگرچہ کہ ریفارمیشن اور اصلاح کی حیثیت ہر جگہ نظر آتی ہے۔ لیکن جو چیزیں خصوصیت کے ساتھ ان کی بدولت ذرہ سے آفتاب بن گئیں ان میں ایک لیٹریچر بھی ہے۔ سرسید ہی کے بدولت اردو اس قابل ہوئی کہ عشق و عاشقی کے دائرے سے نکل کر ملکی، سیاسی، تاریخی، ہر قسم کے مضامین اس زور، اثر، وسعت، جامعیت، سادگی اور صفائی سے ادا کر سکتی ہے۔ سرسید نے قوم کی حالت کی اصلاح کے لئے

پرچہ ''تہذیب الاخلاق'' شروع کیا۔اور انشا پردازی کو اس رتبہ پر پہنچا دیا جس سے آگے ایک قدم بھی بڑھنا ممکن نہیں۔۔''

سماجی، مذہبی، اخلاقی اور تعلیمی موضوعات پر تہذیب الاخلاق میں سرسید نے اور ان کی تحریک پر ان کے رفقا نے ایسے چبھتے ہوئے مضامین لکھے کہ موافق اور مخالف دونوں طرح کے لوگوں میں ان کی بڑی اشاعت ہوئی ۔موافقین ہو کہ مخالفین سبھی نے اس اسلوب کو اپنانا شروع کیا اس طرح اردو مضمون نویسی خوب پھلی پھولی۔سرسید نے انگریزی مصنف ''ایڈیسن اور اسٹیل'' کے کئی مضامین کا ترجمہ اردو میں کیا جو اردو نثر کے لئے تازہ ہوا کا جھونکا ثابت ہوئے۔سرسید کی طرزِ تحریر اور اسلوب کے بارے میں نقادانِ ادب کا کہنا ہے کہ اس پر غالب کے خطوط کا بہت اثر ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ سرسید کی نثر کا بے تکلف ،سیدھا سادا اور گفتگو کا انداز جس میں شوخی و ظرافت ہے غالب کے خطوط کی یاد دلاتا ہے۔سرسید کی یہ عطا کیا کم ہے کہ ان کی وجہ سے اردو لکھنے اور پڑھنے والوں کو اردو زباں کی تنگئی داماں کا گلہ جاتا رہا۔اور سرسید نے ثابت کر دیا کہ اردو ہر طرح کے خیال اور مضمون کو بیان کرنے کی وافر صلاحیت رکھتی ہے۔

فراخ حوصلگی:

سیر چشمی اور فراخ حوصلگی بھی سرسید کے خاص اوصاف میں سے تھی۔انہوں نے اپنی کمائی سے نہ کبھی مال جمع کرنے کا ارادہ کیا اور نہ کبھی اولاد کے لئے کوئی جائداد خریدی بلکہ جو کچھ کمایا اس کو یا اپنی ضروری آسائش اور سچی عزت و نیک نامی کے ذرائع میں صرف کیا یا کنبے کی خبر گیری، مستحقوں کی امداد،اولاد کی تعلیم ،ملک اور قوم کی بھلائی اور مذہب کی حمایت میں اٹھایا۔وہ 37 برس سرکاری ملازمت میں رہے اور اس عرصہ میں 100 روپیہ ماہوار سے 800 روپیہ تک تنخواہ ملتی رہی نیز سید محمود جب ہائی کورٹ کے جج رہے ایک ہزار ماہوار والد کو دیتے رہے مگر اس روپئے کو سرسید نے نہایت ایمانداری اور فراخ دلی کے ساتھ سماجی فلاح کے کاموں میں صرف کرتے رہے۔ابتدا سے ہی ان کا یہ حال رہا کہ جس کام کی لہر ان کے دل میں اٹھی اس پر روپیہ صرف کرنے میں کبھی بھی انہوں نے پس و پیش نہیں کیا۔وہ اپنے کھانے پہننے کے اخراجات میں کمی کرتے تھے مگر اپنے شوق کے کاموں میں انہوں نے کبھی مضائقہ نہیں کیا۔جس کتاب کی ان کو تلاش ہوئی اگر وہ بیس گنی قیمت پر بھی ملتی تو اس کو لئے بغیر نہیں چھوڑا۔ریاضی کے متعلق آلات جمع کرنے کا ان کو شوق ہوا،صدہا روپیہ اس میں صرف کر ڈالا۔کسی تصنیف کے لئے مواد جمع کرنے میں،کسی کتاب کو شائع کروانے میں،کسی سوسائٹی کا قیام یا انجمن و مدرسہ کو قائم کرنے میں وہ ہمیشہ اپنی بساط سے زیادہ خرچ کرتے رہے۔ساری عمر تصنیف و تالیف میں گزاری مگر کبھی حق تصنیف سے کبھی فائدہ نہیں اٹھایا اور کبھی کسی کتاب کی رجسٹری نہیں کروائی۔جہاں کہیں کسی مسجد یا فلاحی ادارے کا قیام ہوتا وہاں وہ کافی مدد کرتے۔اگر خرچ زیادہ ہو تب ہی انہوں نے اپنے خیر خواہ اور رشتے داروں سے چندہ مانگا ورنہ تو سرسید

نے کسی پر بلا وجہ بوجھ نہیں ڈالا۔

طلبا کی تعلیمی امداد کرنے اور کروانے میں انتہائی فیاض تھے۔کئی طلبا و طالبات کو وظیفے مقرر کروائے اور جن طلبا کو وظیفہ نہیں مل سکا سر سید نے ذاتی جیب خرچ سے آخر تک ان کی مدد کی۔طلبا کے ساتھ شفقت و برتاو بھی سر سید کی سیرت وزندگی کا ایک جزو ہے۔خصوصا کم سن اور چھوٹے بچوں کے ساتھ پدرانہ جذبہ تھا۔مولانا حالی لکھتے ہیں کہ جب میں نے کالج کی سیر کی تو،منظر خوش پایا۔

''ہم نے حیدر آباد اور مدراس تک کے بچے یہاں صغیر سن پائے۔ان کو اس قدر خوش وخرم،مطمئن اور فارغ البال دیکھا کہ شاید اپنے گھر پر اپنے پیارے ماں باپ کے پہلو میں بھی اس قدر خوش حال نہ ہوں گے۔وہ ہی اولوالعزم پیرومرد جس وقت ان کے سر پر باپ سے بھی زیادہ شفقت بھرا ہاتھ پھیرتا ہے اور ان کو چمکارتا ہے اور طرح طرح سے ان کا دل بہلاتا ہے تو ان کے دل باغ باغ ہو جاتے ہیں اور وہ اپنے کنبے اور دیس کو بھول جاتے ہیں۔''

وثوق بالذات(خود پر یقین):

منجملہ اور بڑے بڑے اوصاف کے ایک وصف،جس کو سر سید کے تمام کارہائے نمایاں کی بنیاد سمجھنا چاہیے۔ان میں یہ تھا کہ ان کو اپنی ہر ایک رائے پر خواہ مذہبی مسائل سے متعلق ہو اور خواہ اور کسی معاملے سے ہمیشہ ایسا وثوق معلوم ہوتا تھا کہ کسی دلیل یا مخالف پارٹی کی مجارٹی سے اس میں تزلزل آنے والا نہیں تھا۔اس لئے ان کو عموماً ''خودالرائے'' کہا جاتا تھا۔یہ تو ظاہر ہے کہ ان کی ہر ایک رائے جس پر ان کو اصرار ہوتا تھا ہمیشہ صائب اور غلطی کے پاک نہیں ہوسکتی تھی۔مگر اس میں شک نہیں کہ اگر ان کو اپنی رایوں پر ایسا وثوق نہ ہوتا تو وہ بڑے بڑے کام جو ان سے بن آئے ان میں سے ایک بھی ظہور میں نہ آتا۔انہوں نے قوم کی بھلائی کے لئے جتنے کام اٹھائے وہ سب قوم کے خیالات سے بالاتر اور ان کی سمجھ سے باہر تھے۔جب وہ ولایت سے واپس آئے اور علی االعلان اپنے منصوبے قوم کے حق میں ظاہر کئے تو،جیسا ان کا خیال تھا،ہزاروں مخالفین کھڑے ہوگئے،اور جہاں تک ممکن ہوسکا ان کے کاموں میں رکاوٹیں پیدا کیں۔باوجود اس کے ان کے ہر کام میں کامیابی توقع سے زیادہ حاصل ہوئی۔مخالفین روز بروز کم ہوتے گئے،سر سید کے خدمات کی وقعت ان کی نظروں میں بڑھنے لگی اور وہ سید کے کاموں کی قدر کرنے لگے۔اگر سر سید کو اپنی رائے،تجویزوں اور منصوبوں پر کامل وثوق نہ ہوتا تو کیونکر ایسے عظیم کارنامے ظہور ہوتے۔

سر سید میں اپنی رائے پر وثوق کمال کا تھا اور طبیعت میں آمریت بھی تھی،کوئی شک نہیں کہ ان دونوں صفات سے بہت سے فوائد بھی ہوئے۔اس کی مثال یہ ہے کہ کئی بار ان کے دوستوں نے بعض چیزوں کو مناسب نہیں جانا لیکن سر سید کہتے تھے کہ ''جن امور کو آپ تصور کرتے ہیں کہ قومی کالج کے لئے مبارک فال نہیں ہے ہم انہیں امور کو قومی کالج کے لئے مبارک فال سمجھتے ہیں۔پس اس کا کوئی علاج نہیں ہے اور یقین کرنا چاہیے کہ جو خدا

کو منظور ہے وہ ہوگا۔‘‘

بے تعصبی:

سر سید احمد کی مذہبی زندگی میں دو ایسی متضاد خاصیتیں پائی جاتی تھیں جو ایک مذہبی آدمی میں بہت ہی کم جمع ہوتی ہیں۔ حالانکہ اسلامی حمیت ان میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی باوجود اس کے مذہبی تعصّبات سے وہ بالکل پاک تھے۔ جس بے تعصبی سے انہوں نے فصلِ خصومات کا کام انجام دیا اور جس طرح کہ ہر مذہب وملت کے لوگوں کے ساتھ ان کا برتاو بحثیت ایک جج ہونے کے یکساں اور بے طرفدارانہ رہا اس کو ہر قوم اور ہر فرقے کے لوگوں نے برابر تسلیم کیا ہے۔ یہی حال ان کے برتاو کا دوستی و ملاقات اور سوشل معاملات میں تھا۔ اور یہی رنگ ان مذہبی جھگڑوں کے متعلق تھا جو سنی، شیعہ، مقلد، غیر مقلد اور ہندو مسلمان میں ہمیشہ پیش آتے تھے اور پیش آتے ہیں۔ ان کے نہایت گاڑھے دوست جن کی دوستی اخوت کے درجہ کو پہنچ گئی تھی ہر مذہب اور ہر طریقے کے لوگوں میں موجود تھے۔ جن کے ساتھ اخیر دم تک ان کی یکجہتی اور یک رنگی کا یکساں حال رہا۔ اپنے خطبے کے دوران ایک جگہ وہ کہتے ہیں کہ:

’’اے میرے دوستو! میں نے بارہا کہا ہے اور پھر کہتا ہوں کہ ہندوستان ایک دلہن کی مانند ہے جس کی خوب صورت اور رسیلی دو آنکھیں ہندو اور مسلمان ہیں۔ اگر وہ دونوں آپس میں نفاق رکھیں گے تو وہ پیاری دلہن بھینگی ہو جاوے گی اور اگر ایک دوسرے کو برباد کریں گے تو وہ کانڑی بن جاوے گی، پس اے ہندوستان کے رہنے والو ہندو مسلمانو! اب تم کو اختیار ہے چاہے اس دلہن کو بھینگا بناؤ چاہو کانڑا۔‘‘

اس کے علاوہ انہوں نے جتنے رفاہِ عام کے کام کئے ان میں تمام ہندو مسلمانوں کو شامل کیا، سوسائٹی کے اخبار میں جو 35 برس ان کے زیرِ نگرانی چلتا رہا کبھی بھول کر بھی کوئی آرٹیکل یا نوٹ ایسا نہیں لکھا جس سے مذہبی تعصب کی بو آتی ہو۔ کبھی گورنمنٹ سے اس بات کی شکایت نہیں کی کہ مسلمانوں کی تعداد بہ نسبت ہندووں کے سرکاری ملازمت میں بہت کم ہے برخلاف اس کے ہمیشہ مسلمانوں کو یہ نصیحت کرتے رہے کہ سرکاری ملازمت کا استحقاق پیدا کریں۔ ہمیشہ ہندو لیڈروں اور رفارمروں کا ذکر نہایت تعظیم کے ساتھ اخباروں میں کیا اور ہمیشہ ان کے مرنے پر رنج اور افسوس ظاہر کیا۔ یہی حال ان کی بے تعصبی کا اسلامی فرقے کے ساتھ تھا اور یہی عیسائیوں کے ساتھ۔

دوست نواز:

’’دنیا کے تمام بڑے لوگوں کی سب سے بڑی پہچان یہی ہے کہ وہ اپنے ساتھ والوں میں بھی اپنے ہی ایسا جوش وخروش اور صداقت وراست بازی پیدا کر دیتے ہیں۔ یہی حال سر سید کے حواریوں کا تھا جن کی زبردست

جماعت نے اپنے ادبی اورسیاسی کارناموں سے ہندوستان میں ایک کارنامہ برپا کردیا۔‘‘

مولانا الطاف حسین حالی لکھتے ہیں کہ ان کی خوشی بلکہ ان کی زندگی کا دارومدار صرف دو چیزوں پر معلوم ہوتا تھا، کام اور دوستوں سے ملاقات۔ ان کو شاید ہی ایسی خوشی ہوئی ہو جیسی اپنے مخلص دوستوں سے مل کر حاصل ہوتی تھی۔ وہ فی الواقع دوستوں کو اپنی زندگانی کا ایک اہم عنصر سمجھتے تھے۔ دن بھر میں کوئی گھنٹہ بلکہ کوئی منٹ ایسا نہ ہوتا جب انہیں کام سے فرصت ہو۔ ایسے شخص کو تنہائی پسند ہونا چاہیے مگر دوستوں سے کبھی ان کا جی نہ اکتاتا تھا، ان کے دوست بھی انہیں بے حد چاہتے تھے اور ان کی خوشنودی کے لئے ہمیشہ کوشاں رہتے تھے۔ بقول مولانا حالی ان کے ایک عزیز دوست کہا کرتے تھے کہ قومی ہمدردی تو ہم کو معلوم نہیں کس چیز کو کہتے ہیں، ہاں مگر سرسید کی زبان میں ضرور جادو ہے کہ جہاں روپیہ دو روپیہ دینا مشکل معلوم ہوتا ہے وہاں ان کے اشارے پر آنکھ بند کر کے سینکڑوں روپے کا چندہ دے دیتے ہیں۔ سرسید اپنے بے تکلف اور قریبی دوستوں کو کس قدر چاہتے تھے اس کا اندازہ خان بہادر سید زین العابدین کے نام ان کے اس خط سے ہوتا ہے:

’’مکرمی زینو! ابھی بھی تمہارا خط پہنچا کچھ شبہ نہیں کہ تم کو مجھ سے جدا ہونے کا ایسا ہی رنج ہے جیسا کہ تم نے لکھا۔ مگر تم تو اس رنج کو کسی قدر لکھ بھی سکے۔ مجھ کو تمہارے چلے جانے سے جو رنج ہے وہ لکھا بھی نہیں جا سکتا۔ زبان کھجلاتی ہے اور کوئی یہاں نہیں ہے کہ اس کو برا کہوں۔ دل میں غصہ آتا ہے اور کوئی یہاں نہیں ہے۔ جس پر غصہ نکالوں، ہاتھ کھجلاتے ہیں اور کوئی یہاں نہیں ہے جس کو ماروں، حقیقت میں تمہارے جانے سے مکان سونا نہیں ہوا بلکہ دل سونا ہو گیا۔‘‘

نواب محسن الملک سید مہدی علی خان نے ایک موقع پر سرسید کا ذکر کرتے ہوئے کہا ’’میں نے کسی شخص کی ذات میں اس قدر خوبیاں جمع نہیں دیکھیں۔ میری ان سے ملاقات 1863 میں ہوئی تھی۔ اس وقت سے لے کر آج تک ایک بات بھی ان میں ایسی نہیں دیکھی جس کو برا کہہ سکوں۔ نہ بھائی سے اس قدر محبت ہو سکتی ہے نہ باپ سے، جیسا کہ اس شخص کی محبت خدا نے دل میں ڈال دی ہے۔‘‘

مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی اکثر کہا کرتے تھے کہ سرسید کی صحبت اور فیض سے کئی دوست واحباب نے صفر سے شروعات کی اور اوپر تک اپنی منزلیں حاصل کی ہیں، مولانا شبلی کی وفات پر وہ لکھتے ہیں کہ:

’’یہ راستہ تھا مولانا شبلی کا علامہ شبلی بننے کا۔ پھر سرسید کے پڑوس میں ایک چھوٹا بنگلہ لے کر آ رہے۔ سرسید مرحوم کو خداوندِ تعالیٰ نے ایسا دماغ عطا فرمایا تھا جو صحیح اصول کا اخذ کرنے والا تھا، ذوقِ علم ان کے رگ وروپے میں جاری و ساری تھا ان کی مجلسوں میں علمی چرچے رہتے تھے۔ مختلف مسائل پر جرح قدح ہوتی تھی جدید وقدیم اصول باہم ٹکراتے تھے۔‘‘

ایک دوسرے مضمون ’’یادِ سرسید‘‘ میں لکھتے ہیں

''ہمارا بیان ناقص رہے گا اگر یہ نہ کہا جائے کہ سرسید کی صحبت خود ایک درس گاہ تھی جس کے اثر نے بڑے بڑے ادبی و علمی انقلاب دنیا میں انجام دیے، یہ اس حیات آفریں صحبت کا اثر تھا کہ مولانا شبلی مرحوم نے مورخ بن کر بے بہا علمی خدمات انجام دیں اور دنیا کو دکھا دیا کہ علوم عربیہ میں تاریخ کا فن کیا پایہ رکھتا ہے۔''

اسلامی حمیت:

باوجود اس کے اسلامی حمیت جیسی اس شخص میں پائی جاتی تھی نہ وہ مولویوں اور وعظوں میں دیکھی گئی اور نہ صوفیوں اور درویشوں میں، جب کوئی بے جا حملہ اسلام یا مسلمانوں پر غیر مذہب والوں کی طرف سے ہوتو وہ گرم جوشی سے نہیں بلکہ سمجھ داری سے مسئلہ حل کرتے تھے۔ جہاں کہیں اسلام کی بیخ کنی کی کوششیں کی جاتیں، فارسی کا قلع قمع ہو یا مشنری اسکول کے باعث اردو اور گورنمنٹ اسکول کا خاتمہ کرنا ہو، سرسید نے ایجوکیشن کمیشن کی شہادت میں صاف صاف کہہ دیا کہ مسلمانوں کے جذبات مشنری اسکولوں اور کالجوں کے برخلاف ہیں اگر کہیں کسی گورنمنٹ اسکول کو منہدم کر دیا جائے گا تو اس کی وجہ سے لوگوں میں ناراضگی پیدا ہوگی۔ انہوں نے کمیشن میں یہ بھی ظاہر کر دیا کہ ''جہاں مشنری اسکول ہیں وہاں لوگ اگر اپنی اولاد کو ان اسکولوں میں بھیجنا پسند نہ کریں تو اور آپ اپنے لئے علیحدہ اسکول یا کالج قائم کریں تو گورنمنٹ ان کو گرانٹ ان ایڈ عطا کر دے۔ اور اس بات کی خبر رکھے کہ وہاں کے حکام اس قسم کی لوکل کوششوں میں دخل اندازی نہ کریں۔ اپنی حکومت اور رعب دعب کو برخلاف عمل میں نہ لاویں۔''

اسلامی حمیت کی ڈور وطن کی محبت سے جدا نہیں کی جاسکتی یا وطن کو دین سے جدا نہیں کیا جاسکتا اس نکتہ کو سمجھانے کے لئے سرسید احمد خان نے ایک تقریر میں واضح کیا کہ

''سب سے اول ہمارا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں میں نیشنیلٹی یعنی قومیت، قومی اتحاد اور قومی ہمدردی جو اول سیڑھی قومی ترقی کی ہے قائم رہے اس کے لئے ہم کو کیا کرنا ہے سب سے مقدم یہ کرنا ہے کہ وہ مسلمان رہیں اور اور مذہبِ اسلام کی حقیقت ان کے دل میں قائم رہے اس لئے ضروری ہے کہ ہم انگریزی تعلیم کے ساتھ ان کو مذہبی تعلیم بھی دیں اور عقائدِ مذہبی ان کو سکھا دیں، ہم ہمارے بچوں میں اخوت و ہمدردی کا جوش پیدا کریں کہ اس کے بغیر قوم قوم نہ بن سکے گی۔ پھر ہمیں ان کو اس طرح پرکھنا ہے کہ وہ مردہ دل نہ ہو جائیں اور ان کی دلی امنگیں ٹھنڈی نہ پڑنے پائیں۔ ان کی جرات و ہمت کسی طرح کم نہ ہونے پائے، ان میں اخلاق، نیکی، راست بازی اور سچائی پیدا ہو۔

سرسید کی طبیعت میں اہلِ امت کے لئے اسلامی اخوت اور اعلیٰ درجہ کی تربیت فراہم کرنے کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ قوم میں تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت اور قومیت کے احساسات ترقی پائیں تاکہ قوم ایک معزز قومیت کا درجہ حاصل کرے۔

سچائی اور راست بازی:

سرسید کا سب سے بڑا وصف ان کی سچائی اور راست بازی تھی۔ وہ کوئی ایسی بات ہرگز نہیں کرتے تھے جس کی صداقت پر انہیں کامل یقین نہ ہوتا۔ کسی مصلحت یا خوف کو انہوں نے کبھی آڑے نہ آنے دیا۔ ان کا مقولہ تھا کہ جیسا دل میں سمجھو ویسا ہی زبان سے کہو اور جو کچھ کہو اس کو کر دکھاؤ۔ اکثر وہ اپنے دوستوں کو کہا کرتے تھے کہ ہم اپنے آپ کو ٹٹولیں، پہچانے اور جب سچا جانیں تو اور یہ سچائی ہمارے ہر فعل سے متعلق ہو۔ مولانا حالی لکھتے ہیں کہ:

''سرسید نے محض اپنی راست بازی کی وجہ سے ایک عالم کو اپنا مخالف بنایا مگر جس بات کو سچ جانا اس کے کہنے میں کبھی تامل نہیں کیا۔ جس بات پر دل سے یقین کر لیا اسی کے موافق کہا اور ویسا ہی کیا۔ جس بات میں ملک یا قوم کی بھلائی سمجھی اس کے کہنے اور کرنے میں کسی مخالفت کی کچھ پرواہ نہیں کی۔ ممکن ہے کہ سرسید سے کسی بات کے سمجھنے میں غلطی ہوئی ہو مگر انہوں نے کبھی کوئی کام اپنے ضمیر کے خلاف نہیں کیا۔

سرسید کی سچائی، زندہ دلی اور راست بازی کے اتنے قصے ہیں کہ ان کا ایک اچھا خاصہ مجموعہ شائع ہو سکتا ہے۔ مولانا حالی نے حیاتِ جاوید میں اور مولوی ڈاکٹر عبدالحق نے اپنے مضامین میں جابجا اس کا ذکر کیا ہے۔

مولوی علی بخش جو سرسید کے کٹر مخالف تھے ایک کتاب ان کی مخالفت میں تائید الاسلام'' شائع کی۔ جس میں بہت سے بہتان باندھے تھے۔

سرسید نے تہذیب الاخلاق میں ایک بسیط مضمون ''دافع البہتان'' کے عنوان سے لکھا اور سچائی کی وضاحت کی ہے۔

''جو کوئی میری اس تحریر کو دیکھے گا تعجب کرے گا کہ جناب سید الحاج نے کیوں ایسے سخت اور محض کیوں ایسے بہتان مجھ پر کئے ہیں بظاہر اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ جناب سید الحاج نے جب یہ رسالہ لکھا ہے قریب اسی زمانے کے حج کو تشریف لے جانے والے تھے۔ انہوں نے خیال کیا ہوگا کہ لاؤ حج کو تو جاتے ہی ہیں جتنے گناہ کرنے ہیں سب کر لیں، حج کے بعد تو سب پاک ہی ہو جائیں گے۔ مگر جناب الحاج صاحب کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ حج میں آ کے سب گناہ معاف ہو گئے ہوں گے اور شبلی وجنید کے مرتبے پر آپ پہنچ گئے ہوں گے مگر حق العباد نہ حج سے بخشے جاتے ہیں نہ کسی بشارت سے۔ آپ نے جو اتہام مجھ پر کئے ہیں جب تک میں ہی معاف نہ کروں معاف نہیں ہو سکتے۔''

مندرجہ بالا اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کس قدر سرسید راست آدمی تھے۔

ایچ۔ جی۔ رالنسر سید پر ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

''سرسید کے کردار کا ایک نمایاں پہلو تھا، ان کی مکمل بے خوفی، ان کی صاف گوئی بعض اوقات تشویشناک ہو جاتی تھی۔ ان کا مخاطب خواہ وائسرے ہو یا کوئی مغلوب الغضب ملا۔ کسی جماعت یا فرقہ کی دھمکیاں کوئی چیز بھی ان کو

اپنے ارادے سے باز نہ رکھ سکتی تھی۔انھوں نے مکمل غیر جانب داری سے انگریز افسروں کو ان کی بے نیازی اور اپنے ہم وطنوں کو ان کی تنگ نظری پر ملامت کی۔غدر کے اسباب پر ان کی کتاب صاف گوئی کی ایسی ہی مثال ہے جیسا پیغمبرِ اسلام کی زندگی پر ان کا مقالہ۔صرف ایسا ہی نڈر شخص Self Govt کے بارے میں ایسے کڑوے جملے بول سکتا تھا۔''

شوخی وظرافت:

بہت لگتا ہے دل صحبت میں اس کی　　　　وہ اپنی ذات سے ایک انجمن ہے

سر سید جس طرح اپنی دوسری خوبیوں کی وجہ سے اپنے ہم عصروں میں امتیاز رکھتے تھے اسی طرح اپنی ذاتی صفات میں ممتاز تھے۔خلوص ومحبت ،اولوالعزمی ،بلند خیالی ،استقلال و ہمت ،جذبہ ایثار اور ظرافت ان کی ذات میں جمع تھے۔سر سید احمد خان میں شوخی وظرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔انتہا کے زندہ دل اور خوش طبع تھے۔ ان کی بے تکلف صحبتیں،ہنسی مذاق اور چھیڑ چھاڑ کی وجہ سے ہمیشہ پر لطف رہتی تھیں۔ان کو اپنے احباب مخلصین کے ساتھ ہمیشہ وہ تعلق رہا جو دوسروں کو اپنے عزیزوں سے بھی نہیں ہوتا۔

سید مہدی علی خان کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''ہم کو اپنے خدا سے معاملہ ہے جس کے ہاتھوں سے ایسے تنگ آئے ہیں کہ کچھ بیان نہیں ہوسکتا۔جو کام کرتے ہیں وہ دیکھتا ہے،جو بات کہتے ہیں سن لیتا ہے،جو بات دل میں لاتے ہیں جان لیتا ہے،ایسا پیچھے چمٹا ہے کہ نہ جہاز میں چھوڑے ہے نہ زمین پر نہ رات کو الگ ہو نہ دن کو،نہ غیر ذبح مرغی کھاتے وقت پیچھا چھوڑے۔''

تہذیب الاخلاق کے پرچے میں مسلمانوں کو بیدار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''سوتوں کو جھنجوڑتے ہیں کہ جاگ اٹھیں اگر اٹھ کھڑے ہوئے تو مطلب پورا ہوگیا اور نیند میں اٹھانے سے کچھ بڑبڑائے،کچھ جھنجلائے ،ادھر ہاتھ جھٹک دیا،ادھر پیر جھٹک دیا اور اینڈے پڑتے سوتے رہے تو بھی توقع ہوئی کہ تھوڑی دیر بعد جاگ اٹھیں گے۔شاید ہمارے بھائیوں کی اس اخیر درجہ تک نوبت آگئی ہے،اگر یہ خیال ٹھیک ہو تو ہم کو بھی زیادہ نہ چھیڑنا چاہیے۔بچے اٹھاتے وقت کہ اٹھتے ہیں کہ ہم کو اٹھائے جاوگے تو ہم اور پڑے رہیں گے ۔تم ٹھہر جاوَ۔ہم آپ ہی کھڑے ہوں گے۔بچہ کڑوی دوا پیتے وقت منہ بسور کر ماں سے کہتا ہے کہ بی!یہ مت کہے جاو کہ شاباش بیٹا!پی لے،پی لے۔تم چپ رہو میں آپ ہی پی لوں گا۔لو بھائیو!اب ہم بھی نہیں کہتے کہ اٹھو اٹھو پی لو پی لو۔''

سر سید کے مزاج اور طبیعت میں جو زندہ دلی،شوخی وظرافت تھی اس نے ان کی تحریروں کو نہایت دلچسپ بنا دیا ہے۔ہنسی مذاق میں جو بات وہ ذہن میں ڈال دیتے ہیں پھر نکالے نہیں نکلتی۔

دور اندیش مفکر:

ہر قوم کی زندگی میں مدوجزر کے دور آتے رہتے ہیں مگر جب تک اس کے اندر قوتِ حیات کے سوتے بالکل خشک نہیں ہوتے اس وقت تک اس قوم کی بیداری کی امید باقی رہتی ہے۔اور یہ بات ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ ہر ترقی یافتہ قوم کے عروج میں علم کا سب سے اہم کردار ہوتا ہے۔اس کے برعکس جب جب کسی قوم کی ذہنی ،معاشرتی اور اخلاقی پستی انتہا کو پہنچتی ہے تو کہیں نہ کہیں تعلیم کی کمی ہی سب سے بڑی وجہ بن کر سامنے آتی ہے۔انیسویں صدی کے نصف آخر میں ہندوستانی مسلمانوں کی ذہنی،معاشرتی اوراخلاقی پستی بھی انتہا کو پہنچ چکی تھی ایسے میں ایک مفکر،رہبرِ قوم نے جس کے سینے میں ایک دردمند دل تھاایک خواب دیکھا تھا۔

''میں اپنی قوم کوآسمان کی مانندکرنا چاہتا ہوں جورات کے وقت ہم کودکھائی دیتا ہے جب میں رات کوآسماں دیکھتا ہوں تو میں اس کے حصہ کو نیلا نیلا سیاہ ڈراونا دکھائی دیتا ہے کچھ بھی پرواہ نہیں کرتا مگران ستاروں کودیکھنا چاہتا ہوں جواس میں چمک رہے ہیں اور معشوقانہ انداز کی چمک سے ہم کواپنی طرف کھینچتے ہیں اور جن کے سبب سے اس تمام سیاہ آسمان کوبھی عجیب قسم کی خوبصورتی حاصل ہوتی ہے۔''

اے صاحبو! کیاتم اپنی قوم میں اس قسم کے لوگ پیدا کئے بغیر جوتمہاری قوم میں ایسے چمکتے ہوں جیسے آسمان پر تارے اپنی قوم کومعزز اور دوسری قوموں کی آنکھ میں باعزت بناسکتے ہو؟ یہ الفاظ سرسید احمد خان کے ہیں جنہیں آپ چاہے جہدِ مسلسل اور عملِ پیہم کا مجسمہ پیکر کہیے یا ملک وملت کا سچا خادم ،چاہےقوم کے اس فرزند کے کارناموں پرمولاناالطاف حسین حالی کی یہ تحریر لے لیجیے جوموصوف کی لافانی تحریر''حیاتِ جاوید'' کے دیباچے سے ماخوذ ہے۔

''سرسید احمد خان کے جہاں ہم پر بہت احسانات ہیں انہیں میں سے ایک بہت بڑا احسان یہ ہے کہ وہ ہمارے لئے ایک ایسی بے مثال زندگی کا نمونہ چھوڑ گئے ہیں جس سے بہتر ہم اپنی موجودہ حالت کے موافق کوئی نمونہ قوم کی تاریخ میں نہیں پاسکتے۔''

سرسید نے مسلمانوں کی تباہی اور جہالت اور علومِ جدیدہ سے غفلت پر 1857 سے ہی غور کرنا شروع کردیا تھا جس کی نسبت انہوں نے اپنے ایک لکچر میں غدر کی حالت بیان کرتے ہوئے کہا تھا کہ جب میں نے سوچا کہ قوم پر یہ مصیبت کیوں پڑی اور کیوں کر دور ہوسکتی ہے،اس کا جواب ملا کہ قوم میں تعلیم وتربیت نہیں تھی اور انگریزوں سے جن کو خدا نے ہم پر مسلط کیا ہے میل جول اور اتحاد نہ تھا۔اس امر کی تحقیق کے بعد سرسید نے مسلمانوں کی توجہ تعلیم کی طرف مرکوز کی اور عملی جدوجہد کا آغاز کردیا۔۔ابتدا میں انہوں نے حکومت سے تعلیمی مدارس،کالج اور یونیورسیٹی کے قیام کو لے کر بہت تکلیفیں برداشت کیں،حکومت نے ان کے مطالبے یکسر مسترد کردئے لیکن سرسید کا خیال اورعزم وارادہ اپنی جگہ قائم رہا۔وہ چاہتے تھے کہ قوم کے نونہال اپنی قومی و مذہبی تعلیم میں عام تعلیم جس میں دینیاتِ ادب،ریاضی اور طبعیات تھی۔خاص تعلیم میں سائنس اورفنی تعلیم ،انجینئرنگ،فلسفہ

،طبیعات، کیمیات، حیاتیات، طبقات الارض کو رکھا دارالعلوم میں تین مدارس انگریزی، اردو، عربی اور فارسی کے تجویز کئے گئے اور وہ اصول وضوابط بیان کئے گئے جن پر مدارِ تعلیم تھا۔ سرسید جانتے تھے کہ عمدہ تعلیم وتربیت ہی قومی عزت اور قومی ترقی کا اصل ذریعہ ہے۔ مگر کوئی قوم عزت نہیں پاسکتی جب تک تعلیم ایک مقدار مناسب سے اس میں رائج نہ ہو، غرض سرسید نے اپنی دوراندیشی کے عوض مسلمانوں کو حال کی بدحالیوں سے واقف کرایا اورتمام اہلِ اسلام کی برائیوں کو نہایت سچی محبت اور دل دوزی سے بیان کر دیا۔ اور سمجھا دیا کہ جو محبِّ اسلام اپنی محبتِ قلبی کے سبب عیوبِ اہلِ اسلام کو چھپاتے ہیں اور ظاہر کرنے والوں سے ہشت مشت کرنے کو تیار ہوتے ہیں وہ ایسے زخم کو نہاں کرتے ہیں کہ جو آئندہ ناسور بن جائے گا۔ اس لئے چاہیے کہ قوم اپنے گریباں میں جھانکے اور وسیع النظری سے کام لے۔

روشن خیالی:

سرسید احمد خان نے قومی غفلت و جمود اور متعصّبانہ مزاحمت میں جو کامیابی حاصل کی وہ ان کی روشن خیالی کی دلیل ہے نیز اس کے متعدد اسباب ہیں۔ جس میں خود ان کی علمیت شامل ہے۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے جو ذہن و دماغ کی قوتیں عطا کی تھیں اور مختلف قسم کی قابلیتیں ودیعت کی تھیں وہ موقع موقع پر نمایاں ہوتی رہیں۔ وجاہت صوری، خطابت پرزور، پردرد تحریر، خوش مزاجی، استقلال، کردار وگفتار میں ہم آہنگی، وقت کی ضرورتوں کا اندازہ، انتہائی انہماک اور دل کا درد قومی درحقیقت ان کے روشن خیالات کی تعبیر تھے۔

قوم کی کامرانی اور خوش حالی کے لئے وہ وسیع النظری کو اہم جانتے تھے۔ 1857 کی بغاوت کے بعد مسلمانوں کی حالت نحیف ہو چکی تھی۔ صاف نظر آرہا تھا کہ یہ قوم تھوڑی مدت میں عملاً ختم ہو جائے گی۔ حکومت چھن چکی تھی۔ ریاست وامارت کے نشان مٹ چکے تھے۔ نئے حاکموں کے دل میں نفرت کی آگ پنپ رہی تھی۔ جن وسائل پر لاکھوں لوگوں کی زندگی موقوف تھی وہ قبضے سے نکل چکے تھے۔ حکومت میں حصہ داری، نظم ونسق میں حصہ داری پر موقوف ہوتی ہے۔ نظم ونسق میں شامل ہونے کے لئے جن صلاحیتوں کی ضرورت تھی مسلمان اس سے بے بہرہ تھے۔ عجیب بات یہ تھی کہ حالات میں جو تغیر پیدا ہو چکا تھا اس کے حدود ونتائج کا اکثر لوگوں کو احساس تک نہ تھا۔ تخت وتاج چھن چکا تھا لیکن اس کی برتری دماغوں میں بدستور قائم تھی۔ پھر اپنے ہی طور طریقوں پر رہنا شرطِ ایمان سمجھا جاتا تھا۔ انگریزی ایجادات، اور تعلیم کا استعمال کفر میں شامل کیا جاتا تھا۔ ہر بدیسی شئے کا بائیکاٹ کیا جاتا اور دقیانوسیت کے در کھولے جاتے تھے۔ یہ حالات تھے جب سرسید نے روشن خیالی پر آواز بلند کی۔ عوام کے جذبات کو متحرک کیا، سوتوں کو اٹھایا اور جاگتوں کو مزید جگایا۔ تعلیم کی حصولیابی کے لئے عوام سے اپیل کی۔ کئی عوامی جگہوں پر خطبے دئے۔ گورنمنٹ سے اسکول، مدارس اور کالجس کی اجازت حاصل کی۔ اخبارات جاری کئے، مضامین لکھے اور لکھوائے نیز تصنیف وتالیف کا کام کیا۔ ابتدا میں سرسید اکیلے تھے ان کے سوا سب کی

زبانیں گنگ، ہاتھ شل، اور قلوب وذہن ماوف تھے۔ اندھی تقلید اور روایت پسند مسلمان تبدیلی کو روتے تھے۔ ایسے میں سرسید نے انہیں سنبھالنے کا بیڑہ اٹھایا۔ اس مقصد نے علی گڑھ میں اس مشہور درس گاہ کے قیام کا لباس پہنا۔ جس نے بہت جلد عالمگیر شہرت حاصل کر لی۔

انیسویں صدی میں ہندوستان کے مسلمانوں میں سب سے نمایاں شخصیت سرسید احمد خان کی تھی۔ غدر کے دب جانے کے بعد مسلمانوں نے انگریزوں کے ہاتھوں سب سے زیادہ مصیبت اٹھائی۔ اچھے اچھے خاندان تباہ ہو گئے اور شمالی ہندوستان کے بہت سے حصوں میں مسلمانوں کی حالت بڑی مایوس کن ہو گئی۔ جہالت اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ مسلمان سب فرقوں سے بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ جس شخص نے اس مایوسی کا طلسم توڑا وہ سرسید احمد خان تھا۔ ان جیسا دیو قامت ہی مشکلات پر قابو پا سکتا تھا راستے سے ایسی دشواریوں کو ہٹانا اور فنڈ جمع کرنا ایک غیر انسانی کام تھا۔ اور اس سے بھی بڑا کام توہمات اور تنگ نظری کی مخالفت۔ اس المناک دور میں خدا کے اس روشن ذہن اور وسیع النظر بندے نے فلاکت اور تباہی کو دور کرنے کے علاج ڈھونڈنے شروع کئے۔

انیسویں صدی کا آخری نصف حصہ اکثر مشرقی ممالک کی طرح ہندوستان میں بھی ایک طرح کا انتقالی دور تھا۔ اس دور میں ملک کی دماغی زندگی کے پرانے سانچے ٹوٹ رہے تھے اور نئے سانچے ڈھلنا شروع ہو گئے تھے۔ پرانے ہندوستان کی مٹی ایک نئے ہندوستان کا ڈھانچہ تعمیر کر رہی تھی اور پرانے موسم کا اختتام ایک نئے موسم کی آمد کا اعلان تھا۔ اس روشن خیال پس منظر کے مصور سرسید احمد تھے۔

سیاسی جذبات:

سرسید احمد خان کو قدرت نے جو دماغی اور ذہنی صلاحیتیں عطا کی تھیں وہ 1856 تک مختلف تصنیف و تالیف اور قانونی فیصلوں سے نمایاں تھیں۔ لیکن 1857 کے ہولناک غدر میں جرات و ہمت اور ملک و قوم کی ہمدردی میں خاص طور سے ظاہر ہوئیں۔ 1859 میں جب سرسید نے اسبابِ بغاوتِ ہند لکھ کر گورنر جنرل اور وزراتِ ہند کو بھیجا تو متذکرہ صفات کو دامن میں لئے ہوئے ایک اعلی سیاست دانی اور تدبر کی صفتوں کا بھی اظہار ہوا۔ اس رسالے میں جہاں اسبابِ بغاوت ہند بیان کئے گئے ہیں وہیں ضمناً اس حقیقت کو بھی بتایا گیا ہے کہ اس ملک میں ہندو اور مسلمان دو جدا گانہ قومیں ہیں۔

یہ بات ہمیں یاد رکھنی چاہیے کہ اگرچہ سرسید نے ملک کی سیاسی تحریک کی مخالفت کی تھی لیکن ان کی مخالفت میں ہندو مسلم سوال کا کوئی رنگ نہیں تھا۔ انہوں نے اپنی مخالفت کی سرگرمیوں میں مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کو یکساں طور پر شریک کیا تھا۔ وہ مدت العمر ہندو مسلم یگانگت کے حامی رہے اور ہمیشہ ایسی باتوں کی مخالفت کرتے رہے جس سے دونوں جماعتوں کے باہمی اتفاق و یک جہتی میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہوتا تھا۔ انہوں نے اپنی تقریروں میں بار بار خوب صورت استعارہ دہرایا تھا کہ مادرِ ہند کی دو آنکھیں ہیں۔ ایک ہندو ایک مسلمان۔ اگر

دونوں میں سے کوئی ایک آنکھ بھی بگڑ جائے گی تو اس کے چہرے کا سارا حسن بگڑ جائے گا۔

استقلال:

سر سید احمد خان کے استقلال وہمت کی مثالیں ان کے مشہور و معروف کارناموں سے ظاہر ہیں لیکن عام مخالفت کا جو اثر ان کی طبیعت پر ہوتا تھا وہ ضرور حیرت انگیز ہے۔ابتدا میں جب انہوں نے اصلاحی مضامین لکھنا شروع کئے اور سفر یورپ کے حالات بغرض اشاعت بھیجے تو ہندوستان میں ان پر سخت اعتراضات ہوئے۔اس وقت سر سید کا اس کا ملال ہوا تھا جس کی باعث انہوں نے سفر نامہ لکھنا بند کر دیا تھا۔لیکن اس کے بعد کبھی ایسا نہیں ہوا کہ انہوں نے اپنے مخالفین کا کچھ اثر لیا ہو۔یہاں تک کہ ان کے پاس گمنام خطوط پہنچے اور قتل کی دھمکیاں دی گئیں۔دو چار ان کے ہمدردوں اور احباب نے نہایت سنجیدگی سے کہا کہ آپ کی جان کو خطرہ ہے لیکن سر سید نے ان باتوں کو ہمیشہ ہنسی میں ٹال دیا۔

سر سید کی مخالفت کی سب سے بڑی وجہ ان کے مذہبی عقائد تھے جو روش عام سے بالکل جدا تھے۔اس کی حمایت میں انہوں نے علاوہ تفسیرِ قرآن کے متعدد رسائل و مضامین لکھے ہیں۔بعض لوگوں نے ان کو 'لا مذہب یا دہریہ' کہا اور بعض نے' کافر و ملحد' قرار دیا۔اکثر علمائے اسلام نے ان پر کفر کے فتوے بھی دے دئے لیکن سر سید کے پائے استقلال کو جنبش نہ ہوئی۔

لیکن ان باتوں سے زیادہ موثر اور قابلِ ذکر ان کا جذبہ قومی اور ولولہ خدمت تھا جس نے تمام عمر ان کو چین سے بیٹھنے نہ دیا۔اٹھتے بیٹھتے ،سوتے جاگتے وہ ہر وقت قومی ترقی کے خیال اور دھن میں لگے رہتے ،جس کام کے لئے آگے بڑھتے اس کو پورا کئے بغیر نہ چھوڑتے۔سر سید کا انہماک وشغف ان کا ولولہ اور جوش ان کی عمر کے ساتھ ثابت قدم رہا۔آثار الصنادید کی تصنیف میں سر سید نے بارہا اپنی جان کو خطرہ میں ڈالا اور پرانے کھنڈروں اور بلند مقامات کے کتبے خود جا کر حاصل کئے۔تبئین الکلام لکھتے وقت مہینوں رات کو پوری نیند سونا نصیب نہ ہوا۔سائنٹیفک سوسائٹی کو ہزاروں روپے کا اپنا سرمایہ دے دیا۔مذہبی تصانیف کی بدولت ایک عالم کی مخالفت گوارا کی اور قوم کی اصلاح،ترقی وتعلیم کی خاطر اپنا وطن ،عزیز و اقربا،دوست احباب ،وقت اور اثاثہ سب کچھ قربان کر دیا۔باوجود ان تمام قربانیوں کے سر سید کے قدم ڈگمگائے نہیں بلکہ عمر کے ساتھ ساتھ ان کا جذبہ استقلال دوبالا ہوتا گیا۔ان کے اوصاف میں خسروانہ مزاج تھا۔آندھیوں میں انہوں نے چراغ جلائے رکھا تھا۔ماحول خلاف تھا اس کے باوجود ارادوں کو جنبش نہیں ہوئی۔انہوں نے سب کے لئے بالخصوص مسلمانوں کے لئے علم اور اس کے حصول پر بہت زور دیا۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ جو دشواری نئے تعلیم کے حامی سر سید کو پیش آئی تھی وہ یہ تھی کہ انہیں قوم کو صرف ایک نیا راستہ ہی دکھانا نہیں تھا بلکہ قدم قدم پر اس راستے میں لڑنا بھی تھا۔چونکہ ان کی راہ قدامت پرستی کی

بے شمار قووتوں سے رکی جا رہی تھی۔صدیوں کے اوہام وتعصّبات ہر طرف چھائے ہوئے تھے۔طرح طرح کے دماغی عقائد اور جذباتی رجحانات برسرِ پیکار تھے۔مخالف قووتوں کے ہاتھ میں ایک ہتھیار مذہب کا بھی تھا۔مذہب کی راہ اصلاًعلم اور عقل کی راہوں کے خلاف نہیں ہے لیکن اسے بنالیا گیا تھا۔دراصل یہ جنگ فکرِ انسانی کی تاریخ کا ایک خاصہ تھی۔بالآخر وقت کے تقاضے فتح مند ہوئے اور قدامت پرستی کو اپنی ہار مان لینی پڑی۔اس فیصلہ کن جنگ کا مردِ میداں، استقلال کی عمدہ مثال، سرسید احمد تھا۔

سرسید کے تعلیمی افکار:

سرسید نے تعلیم وتربیت کے متعلق جو نظریات قائم کئے ان میں ہندو اور مسلمانوں کی کوئی تفریق نہیں تھی۔لیکن ان کی دور بین نگاہوں نے دیکھ لیا تھا کہ ہندو اپنے ماضی کی احیا کے لئے تیزی سے اٹھ رہے ہیں۔انہوں نے مستقبل کے حالات کا اندازہ پہلے ہی کرلیا تھا۔اس لئے جس زمانے میں سرسید کا قیام بنارس میں تھا،انھوں نے مسلمانوں کی تعلیم وتربیت پر زیادہ توجہ دینے کی ابتدا کی۔اس وقت چونکہ خصوصا مسلمانوں کی حالت ابتر تھی اس لئے سرسید کا مسلمانوں کی تعلیم وتربیت پر خصوصی توجہ کا مرکوز ہونا کوئی عجیب بات بھی نہیں تھی۔اس کے باوجود سرسید کے نظریات تعلیم وتربیت سے متعلق بے پناہ وسعت کے حامل ہیں۔

سرسید کے خیال میں نہ صرف تعلیمی ترقی کی خاطر بلکہ سیاسی ،سماجی اور معاشرتی ومذہبی اعتبار سے بھی انگریزی تعلیم حاصل کرنے کی سخت ضرورت ہے۔اہلیانِ ہند میں برادرانِ وطن نے اس ضرورت کو محسوس کرلیا اور انگریزی تعلیم حاصل کرکے بہرہ مند ہو رہے ہیں لیکن مسلمان انگریزی سے متنفر نظر آتے ہیں۔ان کی یہ نفرت ترقی کے راستے میں مزاحمت بن گئی ہے۔سرسید نے انگریزی تعلیم کی اشاعت کے خاطر اور اسے اپنانے کے لئے یہ استدلال پیش کیا کہ حکمراں قوم کی زباں سیکھنے میں بھی ترقی ہوتی ہے۔بنوامیہ اور بنوعباس کے زمانے میں عربی زبان کا رواج تھا، ہندوں کے عہد میں سنسکرت براجمان تھی اور مسلمانوں کے دورِ حکومت میں فارسی کا دوردورہ تھا ،اور اب ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت ہے اس لئے انگریزی زبان ترقی پر ہے۔لیکن مسلمانوں نے انگریزی زبان سیکھنے میں کوتاہی کی ہے جو ان کی بڑی غلطی ہے۔

سرسید احمد خان کی تعلیم سے دلچسپی عملی طور پر 1857 کے بعد سے شروع ہوئی لیکن ان کے افکار و خیالات آہستہ آہستہ پروان چڑھنے لگے۔اور برسوں بعد ان کے تعلیمی افکار نے تعلیمی تحریک کی شکل اختیار کرلی۔انہوں نے اس تعلیمی تحریک کا اغاز عملی طور پر 1859 میں ایک فارسی ذریعہ تعلیم مدرسے سے کیا اور یہ فارسی مدرسہ تحصیل اسکول کے قائم ہوتے ہی اس کا حصہ بنایا گیا۔سائنٹیفک سوسائٹی کا قیام غازی پور میں 1863 میں عمل میں آیا جو سرسید کی تعلیمی تحریک کا دوسرا سنگِ میل ہے۔اور غازی پور سے علی گڑھ میں تبادلہ ہوتے ہی انہوں نے اس سوسائٹی کا سنگِ بنیاد 1864 میں علی گڑھ میں رکھا اور اس عمارت میں اب طیبہ کالج مسلم یونیورسیٹی علی

گڑھ ہے۔اور یہ امارت آج بھی امراضِ انسانی کی دوا کا مرکز بنی ہوئی ہے۔اس سوسائٹی کے بنیادی مقاصد میں ایک مقصد یہ بھی تھا کہ ادبی اور علمی کتب و رسائل انگریزی زبان سے اردو میں ترجمہ کروائیں اور عوام میں مغربی علوم کا مذاق پیدا کیا جائے حتی کہ سائنسی علوم کی واقفیت کے لئے اخبار ''علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ'' کے نام سے ایک اخبار جاری کیا۔اس اخبار کا ایک کالم اردو میں اور ایک کالم انگریزی میں ہوا کرتا تھا۔سرسید کی تعلیمی تحریک کے بڑھاوے میں اس اخبار کی اہمیت وافادیت سے ہرگز انکار نہیں کیا جاسکتا۔

سائنٹیفک سوسائٹی کے مقاصد میں یہ بھی شامل تھا کہ ہندوستان میں کاشتکاری کے مروجہ طریقوں میں تبدیلی لائی جائے تاکہ اک طرف کاشتکار اور صنعت کار کی معاشی حالت بہتر ہوتو دوسری طرف حکومت کی آمدنی میں اضافہ ہو۔سرسید نے اعلی پیمانے پر جدید قسم کی درسگاہیں اور تعلیمی ادارے قائم کرنے کے لئے انگلستان کے سفر کو ضروری سمجھا تاکہ وہاں کے طرزِ تعلیم سے واقفیت حاصل کریں اور اس کی روشنی میں مسلمانوں کے لئے درسگاہوں کا منصوبہ بناسکیں۔اس کام کی منصوبہ بندی کے لئے سرسید نے انگلستان جانے کا ارادہ کرلیا اگرچہ ان کی مالی حالت اس کی اجازت نہیں دیتی تھی۔تاہم محسن الملک نواب سید مہدی علی کے الفاظ میں:

''جب سید احمد خان لندن جانے کو تھے تو مالی مشکلات اس قسم کی تھیں کہ اگر کوئی دوسرا شخص ہوتا تو اس ارادے کو پورا نہ کرسکتا تھا۔انہوں نے اپنے کتب خانے کو بیچا، گھر اور کوٹی کو رہن رکھا اور سفر کی تیاری کی۔انھوں نے مجھ سے اس بارے میں بیشتر ذکر کیا تھا کہ میرا مقصود پورا نہیں ہوسکتا، جب تک میں بذاتِ خود اس اصول وطرزِ تعلیم سے واقفیت حاصل نہ کرلوں۔''

1872 میں کالج کا ایک خاکہ تیار کیا گیا۔ابتدا میں اس کا قیام ایک مدرسے کی شکل میں عمل میں آیا تھا۔لیکن اس کے مقاصد بہت عظیم تھے۔لہذا یہی اسکول نے ترقی پاکر یونیورسیٹی کا مقام حاصل کرلیا جس سے ہزاروں لاکھوں طلبا و طالبات علم سے فیض یاب ہوتے آرہے ہیں۔سرسید اس ادارہ کو آکسفورڈ اور کیمبرج کی طرز پر مزین کرنا چاہتے تھے۔اس کا اظہار وہ خطباتِ احمدیہ میں لکھتے ہیں:

''اے میرے عزیزو! میری یہ آرزو ہے کہ میں اپنے قوم کے بچوں کو آسمان کے تاروں سے اونچا اور سورج کی طرح چمکتا ہوا دیکھوں۔۔پس میں چاہتا ہوں کہ میرے تمام بچے طالب علم جو کالجوں میں پڑھتے ہیں اور جن کے لئے میری یہ آرزو ہے کہ وہ یورپ کے سائنس اور لٹریچر میں کامل ہوں اور تمام دنیا میں اعلی شمار کئے جائیں اور کلمہ طیبہ کو نہ بھولیں۔''

پروفیسر ضیاالرحمٰن صدیقی اپنے مضمون ''سرسید بحیثیت تعلیمی مدبر'' میں لکھتے ہیں کہ

''سرسید تعلیمی نظریہ یعنی Educational Theorist تھے۔وہ مسلمانوں میں جدید تعلیم اور مغربی علوم کے ساتھ نظریہ تعلیم کو فروغ دینے میں بھی دلچسپی رکھتے تھے۔جو سائنسی علوم سے متعلق تلاش وتحقیق پر مبنی ہو اس

مقصد کی تکمیل کے لئے انہوں نے اصلاحی اور اخلاقی نوعیت کے مضامین بھی قلم بند کئے ۔مزید برآں سرسید نے مغربی تعلیم کو مشرقی طرزِ فکر میں ڈھال کر اس کے نفاذ کی کاوشیں بھی کیں ۔سرسید کو شدید احساس تھا کہ حصولِ علم کے طریقے فرسودہ اور بے اثر ہو چکے ہیں ۔وقت کا تقاضہ ہے کہ لایعنی فلسفیانہ، بحث ومباحث کی دنیا سے قطع نظر علوم وادبیات کی تدریس کے نئے زاویے تلاش کئے جائیں ۔''

مصلح قوم:

سرسید احمد خان ہماری قوم کے بہت بڑے مصلح گزرے ہیں ۔انہوں نے اصلاح کا بیڑا اس وقت اٹھایا جب کہ قوم کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ یہ عظیم انسان اپنی قوم میں ہزاروں نیکیاں دیکھتا تھا۔جن میں دلیری، جرات،قومی استقلال،صبر قناعت سب کچھ تھا مگر بے موقع ۔کیونکہ اس کے ساتھ کوئی تعلیم وتربیت شامل نہیں تھی ۔جس کے بغیر دنیا بھر میں انسانی جوہر وشرافت کی علامت تصور کی جانے والی مذکورہ بالا خوبیاں اپنا رنگ نہیں دکھا سکتی تھیں ۔جب کہ اہلِ امت کے احوال حد درجہ ناسازگار،قوم کے قوائے احساس ماوف،صلاحیتِ فکر ونظر معطل اور سیلِ حوادث کی لہریں تیز وتند تھیں،ان حالات میں سرسید نے قوم کی کشتی کو بچانے کے لئے قدم اٹھایا۔معاملہ دو چار، دس بیس یا ہزار دو ہزار افراد کا نہ تھا بلکہ کروڑوں انسانوں کا تھا جو اس لاکھوں مربع میل سرزمین کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے تھے ۔سرسید تنہا تھے ۔نہ احساسات میں کوئی ان کا ساتھی تھا نہ ہم نوا، نہ محنت ومشقت میں رفیق، نہ دعوتِ اصلاح کے شدید مصائب کے تحمل میں پائداری واستواری کا کوئی خوگر۔سب کی زبانیں گنگ تھیں، ہاتھ شل اور قلب ماوف ۔سرسید یہ سب تنِ تنہا نہ سہتے تو قوم کا محافظ کون تھا؟

قوم کے اس محسن کے کتابِ زندگی کا ہر صفحہ قابلِ احترام ہے۔آپ کا شمار جدید ہندوستان کے ان عظیم المرتبت معماروں میں ہوتا ہے جن میں ہندوستان کی قومیت کا تصور، سیکولرزم کی اہمیت، آزادی کی حفاظت، حریت کا صحیح احترام، جمہوری اقدار کی سربلندی، اور قومی تعلیم کا وسیع اور واضح نصب العین جیسے اعلیٰ پیمانے کے افکار و نظریات سے ملک وقوم کو مالا مال کیا۔

سرسید ایک وسیع النظر اور مختلف الجہات آدمی تھے ۔ان کی سیاسی ،سماجی، تعلیمی ،سیاسی اور ادبی خدمات سے قطعی انکار نہیں کیا جا سکتا۔اس زمانے میں ان کی خدمات کو شک کی نگاہ سے بھی دیکھا گیا۔لیکن سرسید دھن کے پکے تھے ۔مخالفوں کی بھیڑ میں بھی وہ اپنے مشن کو آگے بڑھاتے رہے ۔1857 کے واقعات نے ان کے پورے وجود کو ہلا کے رکھ دیا تھا تو انھوں نے انقلاب اور اس کے اسباب پر سنجیدگی سے غور کیا، نتیجے میں ''اسبابِ بغاوتِ ہند'' رقم کی ۔بقول حالی:

''سرسید کو اس بات کا دل سے یقین تھا کہ انگریزوں نے بغاوت کو سمجھنے میں غلطی کی ہے وہ کہتے تھے کہ انگریزوں کا یہ سمجھنا کہ غدر ایک مکمل بغاوت تھی اور اس کی بنیاد انگلش گورنمنٹ کی حکومت اٹھا دینے کے لئے کسی

سازش پر تھی محض غلط ہے۔اوراسی غلطی کا نتیجہ تھا کہ وہ ملک کے ساتھ اس طرح پیش آئے کہ جیسا باغی ملک کے ساتھ پیش آنا چاہیے۔ یہ نہ ملکی بغاوت تھی اور نہ سازش ،بس سپاہیوں کی حکم عدولی تھی۔ان تمام باتوں کو مدلل انداز میں سرسید نے اسباب بغاوت ہند میں لکھا ہے۔

سرسید نے ہمیشہ انگریزوں سے مفاہمت کی کوشش کی ، وہ جانتے تھے کہ انگریز ہندوستانیوں کا استحصال کررہے تھے۔اس کے باوجود مصلحت سے کام لیتے ہوئے انہوں نے ہمیشہ ایسے سیاسی اقدامات اٹھانے پر زور دیا،جس سے ملک اورقوم دونوں کی بھلائی ہو۔چونکہ قوم کو وہ زوال کی پستی سے نکالنا چاہتے تھے۔اس لئے ان کا خیال تھا کہ سیاسی آزادی سے زیادہ ضروری حصولِ تعلیم ہے۔بغیر تعلیم کے سیاسی آزادی قائم نہیں رکھی جاسکتی۔سر سید نے ہندوستان میں ایسے کام کا خواب دیکھا تھا جو سائینسی نقطہ نظر،آزادی رائیاورقومی یگانگت پر مشتمل ہو۔

قوم کو ہر سطح سے کامیاب دیکھنے کے لئے سر سید نے حلقہ احباب کی انجمن بنائی جس کو ٹوٹے ہوئے تاروں اور بکھرے ہوئے موتیوں سے آراستہ کیا۔اوران کو دور دراز فاصلوں سے اٹھا کر ایک جگہ جمع کیا۔محسن الملک ، وقارالملک ،مولانا حالی ،مولانا شبلی ،نذیر احمد،اورسمیع اللہ خان اس بزم کے آفتاب تھے۔قوم کی فلاح و بہبود کے لئے ان روشن ستاروں سے کام لئے گئے۔

قوم کی اصلاح اور ذہنی بیداری کے لئے مضامین لکھے گئے ،رسائل شائع کیے،ان میں سب سے مشہور ''تہذیب الاخلاق'' ہے۔اس پرچے کی تمہید میں سرسید کہتے ہیں کہ:

''اس پرچہ کے اجرا کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجہ کی سویلائزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جائے تا کہ جس حقارت سے سویلائزڈ یعنی مہذب قو،یں ان کو دیکھتی ہیں وہ رفع ہواور وہ بھی دنیا میں معزز اور مہذب قوم کہلائیں۔''

عصری تعلیم کی غرض سے سرسید نے جو کالج کا قیام کیا تھا اس کے طلبا و طالبات پر اکثر پھبتیاں کسی جاتی تھیں۔سرسید نے قوم کے مستقبل نونہال بچوں کو اس محبت سے خطاب کیا کہ قوم کے اصلاحی کاوشوں کے باب میں یہ نصیحت ہمیشہ زندہ رہے گی۔

''اے میرے عزیز بچو!تم اس کی مطلق پروانہ کرو کہ لوگ تم کو کیا کہتے ہیں تم اپنے کام میں مصروف رہو یعنی دل لگا کر پڑھو اور قابلیت حاصل کرو کہ جو لوگ آج تم کو حقارت سے دیکھتے ہیں وہ خود تم کو دیکھ کر ذلیل و شرمندہ ہو جائیں۔''

یہ اسی کالج کا طفیل تھا کہ انگریزی تعلیم سے تعصب اور نفرت میں کمی آگئی،مختلف صوبوں کے طلبا کے ایک جگہ رہنے سے مسلم قومیت اوراسلامی اخوت کی تعریف سمجھی،ان میں امدادِ باہمی کا جذبہ پیدا ہوا۔

حقیقی عظمت کا اگر کوئی انسان مستحق ہوسکتا ہے تو یقیناً سرسید احمد خان اس کے مستحق تھے۔بہت کم لوگوں

میں حیرت انگیز لیاقتیں اور اوصاف جمع ہوتے ہیں۔ وہ ایک ہی وقت میں اسلام کا محقق ،علم کا حامی ،قوم کا سوشل رفارمر، مصنف ،نقاد، خطیب اور مفکر تھا۔ سرسید کا اثر اس عالم کا نہ تھا جو گوشہ تنہائی میں بیٹھ کر اپنی تحریروں سے لوگوں کے دل اکسائے ۔ بلکہ وہ علانیہ دنیا کے سامنے لوگوں میں لوگوں کا رہبر بن کر اس لئے آیا کہ سچ کو پھیلائے اور حق کی آواز بلند کرے۔ بقول مولوی عبدالحق:

سرسید کی زندگی اوران کی خدمات ہمارے لئے صحیفہ ہدایت ہے۔اس برِاعظم کے مسلمانوں میں بڑے بڑے مجاہد، ذی علم وفضل ، پاک نفس بزرگ اور مصلح گزرے ہیں۔ان کا دائرہ عمل محدود تھا۔لیکن سرسید کا میدانِ عمل قومی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی تھا۔ایسا جامع صفات اور جامع حیثیات ، بے لوث اور بےنفس، پرعزم و استقلال، سراپا خلوص وصداقت اور ہمہ تن ایثار مصلح ہمیں نہ اس سے پہلے نصیب ہوا اور نہ اس کے بعد، اس نے ایک مایوس اور افسردہ قوم میں نئی روح پھونکی اور ایسا قومی جذبہ پیدا کیا جو اب تک کام کر رہا ہے۔''

4.4 آپ نے کیا سیکھا

اس اکائی میں آپ کو

☆ سرسید احمد خان کے سوانحی کوائف اور ابتدائی تعلیم وتربیت سے واقفیت ہوئی۔

☆ سرسید کے عقائد واعمال اور مذہب ومعاشرت سے آگاہی حاصل ہوئی۔

☆ سرسید احمد خان کی سیرت کے نمایاں پہلو کا علم ہوا۔

☆ سرسید احمد خان کے علمی مشاغل کی معلومات ملی۔

4.5 اپنا امتحان خود لیجیے

ا۔سرسید کا پورا نام اور سن ولادت بتایے؟

2۔سرسید احمد خان کی زندہ دلی ،شوخی وظرافت کا سیر حاصل جائزہ لیجیے؟

3۔سرسید کے جذبہ محبت وصداقت کو قلم بند کیجیے؟

4۔سرسید ایک مصلح قوم یا سوشل ریفارمر پر نوٹ لکھیے ؟

4.6 سوالات کے جوابات

1۔سرسید احمد خان 17 اکتوبر 1817 کو دہلی میں پیدا ہوئے۔

2۔ بہت لگتا ہے دل صحبت میں اس کی وہ اپنی ذات سے ایک انجمن ہے

سرسید جس طرح اپنی دوسری خوبیوں کی وجہ سے اپنے ہم عصروں میں امتیاز رکھتے تھے اسی طرح اپنی ذاتی صفات میں ممتاز تھے۔خلوص ومحبت ،اولوالعزمی ، بلند خیالی ،استقلال وہمت ، جذبہ ایثار اور ظرافت ان کی ذات میں جمع تھے۔سرسید احمد خان میں شوخی وظرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔انتہا کے زندہ دل اور خوش طبع تھے۔ان کی بے

تکلف صحبتیں، ہنسی مذاق اور چھیڑ چھاڑ کی وجہ سے ہمیشہ پر لطف رہتی تھیں۔ان کو اپنے احباب مخلصین کے ساتھ ہمیشہ وہ تعلق رہا جو دوسروں کو اپنے عزیزوں سے بھی نہیں ہوتا۔

سید مہدی علی خان کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

کو اپنے خدا سے معاملہ ہے جس کے ہاتھوں سے ایسے تنگ آئے ہیں کہ کچھ بیان نہیں ہوسکتا۔جو کام کرتے ہیں وہ دیکھتا ہے، جو بات کہتے ہیں سن لیتا ہے، جو بات دل میں لاتے ہیں جان لیتا ہے، ایسا پیچھے چمٹا ہے کہ نہ جہاز میں چھوڑے ہے نہ زمین پر نہ رات کو الگ ہو نہ دن کو، نہ غیر ذبح مرغی کھاتے وقت پیچھا چھوڑے۔''

تہذیب الاخلاق کے پرچے میں مسلمانوں کو بیدار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''سوتوں کو جھنجوڑتے ہیں کہ جاگ اٹھیں اگر اٹھ کھڑے ہوئے تو مطلب پورا ہوگیا اور نیند میں اٹھانے سے کچھ بڑبڑائے، کچھ جھنجلائے، ادھر ہاتھ جھٹک دیا، ادھر پیر جھٹک دیا اور اینڈے پڑتے سوتے رہے تو بھی توقع ہوئی کہ تھوڑی دیر بعد جاگ اٹھیں گے۔شاید ہمارے بھائیوں کی اس اخیر درجہ تک نوبت آگئی ہے، اگر یہ خیال ٹھیک ہو تو ہم کو بھی زیادہ نہ چھیڑنا چاہیے۔بچے اٹھاتے وقت کہ اٹھتے ہیں کہ ہم کو اٹھائے جاؤ گے تو ہم اور پڑے رہیں گے۔تم ٹھہر جاؤ۔ہم آپ ہی کھڑے ہوں گے۔بچہ کڑوی دوا پیتے وقت منہ بسور کر ماں سے کہتا ہے کہ بی! یہ مت کہے جاؤ کہ شاباش بیٹا! پی لے، پی لے۔تم چپ رہو میں آپ ہی پی لوں گا۔لو بھائیو! اب ہم بھی نہیں کہتے کہ اٹھو اٹھو پی لو پی لو۔''

سرسید کے مزاج اور طبیعت میں جو زندہ دلی، شوخی و ظرافت تھی اس نے ان کی تحریروں کو نہایت دلچسپ بنا دیا ہے۔ہنسی مذاق میں جو بات وہ ذہن میں ڈال دیتے ہیں پھر نکالے نہیں نکلتی۔

3۔محبت والفت کا مادہ سرسید احمد خان میں دیگر لوگوں کی نسبت بہت زیادہ تھا۔اور اسی لئے ان کے تمام تعلقات میں محبت کا ظہور بدرجہ غایت پایا جاتا ہے۔وہ اپنے ایک دوست کو دوسرے دوست کی نسبت جس سے کچھ شکر رنجی ہوگئی ہے لکھتے ہیں ''وہ دوستی و محبت کے معاملات و برتاو سے ناواقف ہیں۔کسی پر وہ عاشق نہیں ہوئے، کسی سے انہوں نے دل نہیں لگایا، ان کو مزہ دوستی اور محبت کا مطلق علم نہیں، سچ یہ ہے کہ جس شخص نے ایک گھڑی بھی عشق نہیں برتا نہ وہ خدا کی دوستی کا مزہ جانتا ہے نہ انسان کی دوستی کا اور نہ محبت کے لائق ہے۔''

یہ سرسید کی محبت کا ہی دام تھا کہ جس کے باعث رفیقانِ سرسید علامہ شبلی نعمانی، مولانا الطاف حسین حالی، نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک، مولوی چراغ علی، ڈپٹی نذیر احمد جیسی عبقری شخصیات ان کی محبت میں گرفت تھے۔محسن الملک کو سرسید کا دستِ راست کہا جاتا ہے، انہوں نے قدم قدم پر سرسید کا ساتھ دیا۔ان کا اصل نام سید مہدی علی تھا۔آپ ایک بہترین مقالہ نگار، قانون کی اچھی سمجھ رکھنے والے اور ماہر سیاست تھے۔سرسید خود بھی ان سے متاثر رہتے اور ان کی تعریف کرتے تھے۔کچھ قلم کاروں نے انہیں سرسید کا محبّ اور محبوب بتایا ہے۔مولانا

الطاف حسین حالی اور سرسید کی محبت وصداقت کا بہترین نمونہ ''مسدس مدو جزر اسلام'' ہے۔ جسے حالی نے سرسید احمد خان کے اسرار اور محبت کے تقاضے کی بنا پر تحریر کیا تھا۔علامہ شبلی نعمانی سرسید احمد خان سے چالیس سال چھوٹے تھے باوجود اس کے وہ ایک دوسرے کے قدردان تھے۔شبلی سرسید کے کچھ معاملات سے اتفاق نہیں رکھتے تھے لیکن یہ سرسید کی محبت کا اثر ہی تھا کہ مولانا شبلی خود کو سرسید سے الگ نہ کر سکے۔

4۔سرسید احمد خان ہماری قوم کے بہت بڑے مصلح گزرے ہیں۔انہوں نے اصلاح کا بیڑا اس وقت اٹھایا جب کہ قوم کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔یہ عظیم انسان اپنی قوم میں ہزاروں نیکیاں دیکھتا تھا۔جن میں دلیری، جرات، قومی استقلال، صبر قناعت سب کچھ تھا مگر بے موقع۔کیونکہ اس کے ساتھ کوئی تعلیم وتربیت شامل نہیں تھی۔جس کے بغیر دنیا بھر میں انسانی جوہر وشرافت کی علامت تصور کی جانے والی مذکورہ بالا خوبیاں اپنا رنگ نہیں دکھا سکتی تھیں۔جب کہ اہلِ امت کے احوال حد درجہ ناسازگار، قوم کے قوائے احساس ماوف، صلاحیتِ فکر ونظر معطل اور سیلِ حوادث کی لہریں تیز وتند تھیں، ان حالات میں سرسید نے قوم کی کشتی کو بچانے کے لئے قدم اٹھایا۔معاملہ دو چار، دس بیس یا ہزار دو ہزار افراد کا نہ تھا بلکہ کروڑوں انسانوں کا تھا جو اس لاکھوں مربع میل سرزمین کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے تھے۔سرسید تنہا تھے۔نہ احساسات میں کوئی ان کا ساتھی تھا نہ ہم نوا، نہ محنت ومشقت میں رفیق، نہ دعوتِ اصلاح کے شدید مصائب کے تحمل میں پائداری واستواری کا کوئی خوگر۔سب کی زبانیں گنگ تھیں، ہاتھ شل اور قلب ماوف۔سرسید یہ سب تنِ تنہا نہ سہتے تو قوم کا محافظ کون تھا؟

4.7 فرہنگ

لفظ	معنی
مستند	سند ، تصدیق
سفاک	ظالم
بذلہ سنجی	خوش طبعی
حلیم الطبع	نرم طبیعت
خوگر	کسی بات کی عادت ہونا ، عادی
استوار	مستحکم ، مضبوط
تدارک	روک تھام
عبوس	ناپسندیدہ
دقیقہ فروگداشت	کسی قسم کی کمی نہ کرنا
خندہ زن	خوشی ، ہنستا ہوا

آثارالصنادید — بزرگوں اور عظیم ہستیوں کی نشانیاں

موشگافیاں — پوشیدہ

4.8 کتب برائے مطالعہ

ا۔ سرسید احمد خان اور ان کا عہد — ثریا حسین — ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ
1999

2۔ سرسید احمد خان: شخصیت اور فن — جمیل یوسف — اکادمی ادبیات، پاکستان
1999

3۔ حیاتِ جاوید — مولانا الطاف حسین حالی — انجمن ترقی اردو ہند، دہلی
1939

4۔ سرسید احمد خان: حالات و افکار — مولوی عبدالحق — اردو مرکز، دہلی
1996

5۔ فکر و نظر (سرسید: بحیثیت ایک تعلیمی مدبر) — پروفیسر ضیاالرحمٰن صدیق — علی گڑھ مسلم یونیورسیٹی، علی گڑھ
2023

6۔ تذکرہ سرسید — مولوی محمد امین اللہ زبیری — یونائیٹڈ لمیٹیڈ، انارکلی، لاہور
1961

7۔ سرسید کے مذہبی، سیاسی اور ادبی افکار — شان محمد — سرسید اکاڈمی، علی گڑھ

8۔ سرسید اور اردو زبان و ادب — قمرالہدی فریدی — ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ
2017

بلاک 2 سرسید احمد خاں کی تصانیف اور معاصرین

اکائی ۵: سرسید احمد خاں کے معاصرین اور رفقا

اکائی ۶: سرسید احمد خاں کی تصنیف۔''اسباب بغاوت ہند'' کا تنقیدی مطالعہ

اکائی ۷: سرسید احمد خاں کی تصنیف۔'' آثار الصنا دید'' کا تنقیدی مطالعہ

اکائی ۸: سرسید احمد خاں کی تصنیف۔''خطبات احمدیہ'' کا تنقیدی مطالعہ

اکائی ۹: تہذیب الاخلاق کا اجرا اور اس کی سماجی و ادبی اہمیت

اکائی 5: سرسید احمد خاں کے معاصرین اور رفقا

ساخت

05.1 اغراض ومقاصد

05.2 تمہید

05.3 سرسید کے معاصرین اور رفقا

05.3.1 سرسید کے معاصرین

05.3.2 سرسید کے رفقا

05.4 آپ نے کیا سیکھا

05.5 سوالوں کے جوابات

05.6 فرہنگ

05.7 کتب برائے مطالعہ

05.1 اغراض ومقاصد

1۔ طلبہ سرسید کی سماجی وادبی خدمات سے واقف ہوں گے۔

2۔ طلبہ سرسید کے کاموں اور سرگرمیوں کا علم ہوگا۔

3۔ طلبہ سرسید کے رفقا کے کردار سے واقف ہوں گے۔

4۔ طلبہ سرسید کے معاصرین کی خدمات سے متعارف ہوں گے۔

05.2 تمہید

سرسید احمد خاں کا شمار ۱۹ویں صدی کے عظیم رہنماؤں میں کیا جاتا ہے۔جنھوں نے مسلم معاشرے کے متوسط طبقے کو ایک نیا تاریخی موڑ دینے کا کام انجام دیا۔انہوں نے نہ صرف مسلمانوں کی بلکہ عام ہندوستانی عوام کے لئے جو خدمات انجام دی ہیں وہ ہماری تاریخ کا روشن باب ہیں۔یہ وجہ ہے کہ ان کا شمار احمد یہ جدید ہندوستان کے معماروں میں کیا جاتا ہے۔۱۹ویں صدی کی تہذیبی نشاۃ ثانیہ کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے والی شخصیات کے سرسید کے گہرے روابط تھیان میں سے ایک قابل لحاظ تعداد غیر مسلم حضرات کی بھی تھی۔اور سرسید نے ان کی خدمات کا تہہ دل سے اعتراف کیا ہے۔

05.3 سرسید کے معاصرین اور رفقا

05.3.1 سرسید کے معاصرین

سرسید کے غیر مسلم معاصرین میں راجہ رام موہن رائے، دادا بھائی نوروجی، سر سریندر ناتھ بنرجی، کیشپ چندسین، دیانندسرسوتی، لالہ لاجپت رائے، راجہ شیو پرساد، راجہ شمبھو نارائن، راجہ جے کشن داس اور بھارتیندر ہریش چندر کے نام ہندوستان کی تاریخ میں محتاج تعارف نہیں ہیں۔

سرسید اپنے معاصرین میں راجہ رام موہن رائے کے افکار ونظریات سے سب سے زیادہ متاثر تھے۔ جوخود ایک روشن خیال اور فارسی کے عالم تھے۔ ہندو دھرم کی قدیم روایات سے کسی حد تک منقطع ہوکر اپنے نئے سلسلۂ خیال کی بنیاد رکھی۔ سرسید نے اپنے معاصرین میں ہر سماج کے دوسرے قائد کیشپ چندر سین کے افکار و نظریات کے واضح طور پر تعریف کی ہے اوران دونوں کو روشن خیال اور ملک کے مفادات کا تحفظ کرنے والا تصور کیا ہے۔

سرسید نے ایک سوچی سمجھی حکمت عملی کے تحت مسلمانوں کی تہذیبی، لسانی، معاشرتی اور مذہبی تشخص کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے معاصرین انگریزوں اور ہندوؤں کے ساتھ ملکی اور ملّی مصالحانہ کوششوں کوفروغ دیا اوراس مقصد کے حصول کے لئے ملکی اور ملّی مفادات کے لئے زندگی وقف کردی۔

گارساں دتاسی (Garcin de Tassy) انیسویں صدی کا ممتاز فرانسیسی مستشرقین تھا، جوسرسید احمد خاں کا معاصر تھا، جس نے سرسید کی کتاب 'آثارالصنادید' کا ۱۸۶۱ء میں فرانسیسی زبان میں ترجمہ کرکے اہل یورپ میں مشتہر کیا۔ ساتھ ہی اس کتاب کی ایک جلد سرسید کو بھی بھیجی تھی۔ اسی ترجمہ سے متاثر ہوکر لندن کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے سرسید کواس سوسائٹی کا آنریری فیلومقرر کرکے سرسید کی عزت افزائی کی۔

گارساں دتاسی ۱۷۹۴ء میں پیدا ہوا۔ اردوادب کی تخلیقات میں پوری زندگی وقف کی۔ وہ پیرس یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے منسلک تھا۔ اس کے مختلف کلچر اور ماحول میں رہ کر اردوزبان وادب اور تاریخ کے عصری حالات پر لکھنے کے ساتھ ساتھ تحقیق کے ایسے گوشے دریافت کئے جو اہل زبان کی نظروں سے پوشیدہ تھے۔

سرسید گارساں دتاسی کو علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ بھیجا کرتے تھے۔ گارساں نے ایک خط سرسید کو اس وقت لکھا تھا جب وہ لندن میں تھے۔ گارساں نے ان کو سی ایس آئی کی مبارکباد دی تھی۔ اپنے خط میں گارساں نے سرسید کو پیرس آنے کی دعوت دی تھی۔

'آثارالصنادید' میں دہلی کی عمارتوں کے حالت اور کتبے سرسید احمد خاں نے بہت کاوش کے ساتھ تحریر کئے۔ اس لحاظ سے کتبہ شناسی کے فن میں وہ پہلے ہندوستانی تھے جنہوں نے آثار قدیمہ اور کتبہ شناسی پر کام کیا۔

گارساں دتاسی کے بیان کے مطابق کلکتہ یونیورسٹی نے آثارالصنادید کو ۱۸۷۲ء میں ایک تاریخی اور عصری کتاب کی حیثیت سے بی اے کے نصاب میں شامل کیا تھا۔

گارساں دتاسی نے ۱۸۵۶ء میں سرسیداحمد کی آ ثارالصنادید پر مفصل تبصرہ کیا جو پیرس ایشیاٹک جرنل میں شائع ہوا تھا اس کا اردو ترجمہ اس طرح ہے:

''گذشتہ چند سالوں میں ہندوستانی (اردو) میں جو مفید ترین تخلیقات شائع ہوئیں ان میں یقیناً سرسید احمد خاں کی کتاب ''دہلی'' سے متعلق بھی شامل ہے۔ وہ دہلی میں مجسٹریٹ ہیں اور کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں جو اسی زبان میں چھپیں جن میں پیش نظر کتاب ہے۔ یہ ہندوستان کے شمال مغربی علاقے کی عام بول چال کی زبان ہے۔

سرسید احمد کی یہ کتاب اس قابل ہے کہ اس سے واقفیت حاصل کی جائے اور میں اپنے ارادہ پر قائم ہوں کہ جیسے ہی موجودہ کاموں سے فرصت ملے گی فوراً اس کے ترجمے کی طرف متوجہ ہوں گا۔''

اپنے دعوے کے مطابق اس نے آ ثارالصنادید کا فرانسیسی ترجمہ ۱۹۴ صفحات میں لیتھو پر مطبع شاہی پریس سے ۱۸۶۰ء میں شائع کیا۔ نظر ثانی کا کام فلیکس بوترو، پرنسپل دلّی کالج نے کیا۔ شروع کے چار صفحوں کے دیباچہ کی ابتدا میں وہ لکھتا ہے کہ ''جب سے دہلی پر سر آرچ ڈیل ولسن نے حملہ کر کے قبضہ کیا ہندوستان کے اس پرانے پایۂ تخت میں سوائے کھنڈروں کے اور کچھ نظر نہیں آ تا۔

فرانس کے مشہور اور پمفلٹ گارساں دتاسی 'خطبات گارساں دتاسی' (۱۸۵۰ء۔۱۸۷۷ء) میں وہ ہر تعلیمی سال کے آغاز پر ہندوستان کی ادبی وثقافتی سرگرمیوں کے بارے میں لیکچر دیتا تھا۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے :

''پچھلے برسوں میں ہندوستان میں جو علمی وادبی انجمنیں قائم ہوئیں وہ برابر اپنا کام کر رہی ہیں۔ ان میں سے اہم علی گڑھ انجمن ہے جس کے بانی ایک ممتاز مسلمان سید احمد خاں صدرالصدور بنارس ہیں۔ سرسید کی سائنٹیفک سوسائٹی کے بارے میں وہ مزید اطلاع فراہم کرتا ہے کہ :

''اس انجمن سائنٹیفک سوسائٹی نے اہم انگریزی تصانیف کے اردو ترجمے کا انتظام کیا ہے۔ اس کے علاوہ اخبار انسٹی ٹیوٹ گزٹ پابندی سے نکلتا ہے۔ اس پرچہ سے سالانہ خطبہ کی تیاری میں مدد ملتی ہے اور اس میں ایسا مدرسہ کھولنے کی تجویز ہے جہاں اعلیٰ تعلیم کا انتظام ہوگا۔ یہ خوش خبری بھی سناتا ہے کہ ۸/ جنوری ۱۸۷۷ء کو وائس رائے ہند لارڈ لٹن نے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی بنیاد رکھی۔''

۱۸۸۳ء کے لیکچر میں سرسید کی تفسیر کی نسبت لکھتا ہے کہ ''ایک نئی کتاب جس کی طرف میں توجہ دلانا چاہتا ہوں وہ سید احمد خاں کی تصنیف ہے جو زمانۂ حال کے ہندوستانی مصنفوں میں سب سے زیادہ مشہور مصنف ہیں۔ یہی وہ مصنف ہے جس کی کتاب 'آ ثارالصنادید' کا میں نے پیرس کے ایشیاٹک جرنل میں ترجمہ کیا تھا۔ میں نے اس کتاب (یعنی تبیین الکلام) کے عنقریب چھپنے کے پہلے خبر دی تھی اور اب میں خوشی سے اطلاع دیتا ہوں کہ اس کا حصہ چھپ گیا ہے جس کی ایک کاپی میرے پاس موجود ہے جو مصنف نے مہربانی کر کے مجھے

ہدیۃً بھیجی ہے۔ اس کتاب سے صرف یہی نہیں پایا جاتا کہ سید احمد خاں کو قرآن شریف اور ہماری کتاب مقدسہ کا پورا پورا علم ہے بلکہ بہت سی ایشیائی تصنیفات اور طرفہ گریہ کی بہت سی یورپین تصانیف سے ان کو پوری واقفیت ہے۔ حقیقت میں یہ کتاب وسیع علم کا نتیجہ ہے۔

خواجہ حالی نے لکھا ہے کہ 'آثار الصنادید' کا ترجمہ گارساں دتاسی جو فرانس کا مشہور مستشرقین میں سے تھا وہ بھی لندن ہی میں سرسید سے خط و کتابت اور شوق ملاقات رکھتا تھا۔

پروفیسر ثریا حسین کے مطابق ''وہ ہندوستانیوں سے ملنے کا خواہاں تھا۔ ۱۸۷۴ء میں جب سید محمود پیرس آئے تو ان سے مل کر بڑا خوش ہوا۔ اپنے گھر مدعو کیا اور سرسید احمد خاں کے لئے بطور تحفہ اپنی کتاب ''تاریخِ ادبیات ہندوی و ہندوستانی'' بھیجی۔ گارساں دتاسی کی وفات ۲ر ستمبر ۱۸۷۵ء کو پیرس میں ہوئی اور مارسیلز کے آبائی قبرستان میں دفن کیا گیا۔

سرسید کے ایک دوسرے ہم عصر سوامی دیانند سرسوتی نے آریہ سماج کی تشکیل کی اس سلسلے میں وہ کئی مرتبہ وارانسی اور پریاگ راج بھی گئے کیونکہ یہ دونوں شہر سناتن دھرم کے سب سے بڑے مرکز تھے۔ دھرم کی نگری بنارس کو فتح کرنے کے لئے سوامی جی ۹ مرتبہ بنارس تشریف لائے تھے اور مہینوں قیام کیا۔ سرسید ان دنوں بنارس میں ملازم تھے۔ انہوں نے اپنی رہائش گاہ پر ہندو، مسلمان، عیسائی اور پارسیوں کا ایک جلسہ منعقد کیا جہاں ویدوں کا مطلب اور اہمیت کو سمجھانے کے لئے سوامی دیانند سرسوتی کو مدعو کیا۔

مہارشی سوامی دیانند سرسوتی انیسویں صدی کی سماجی تحریکات کے اولین مفکر، مدبر اور سماجی مصلح تھے جنھوں نے ہزاروں دیوی دیوتاؤں کی پوجا کے خلاف آریہ سماج کی تحریک شروع کی جس کے وہ بانی قرار پائے۔

سوامی دیانند نے ہندوؤں میں ''سورمائیت'' یا ہندو عصبیت کی روح بیدار کرنے کی غرض سے آریہ سماج کی تشکیل کی۔ ہندوئیت کی یہ نئی شکل ایک دودھاری تلوار سے مشابہ تھی جس کے ذریعہ ہندوؤں کو یہ بتایا گیا کہ دنیا کی بہترین تعلیم ہندو مذہب سے حاصل ہوتی ہے اس لئے ہندومت کی برتری کا احساس پیدا کیا۔ اس تحریک کی زد عیسائیت کے علاوہ اسلام پر بھی پڑی تھی۔

۱۹ویں صدی کی ہندوستانی نشاۃ ثانیہ میں آریہ سماج سب سے طاقتور اور بااثر تنظیم تھی۔ ہندو مذہب کے مارٹن لوتھر کہے جانے والے گجراتی سنیاسی دیانند سرسوتی نے ہندو مذہب میں چاروں طرف پھیلی برائیوں، اندھی تقلید اور ہزاروں دیوی دیوتاؤں کی مورتیوں کو اکھاڑ پھینکنے کا بیڑہ اٹھایا تھا۔ ہندو مذہب کو ہر طرح کی آلودگی سے پاک کرنے اور مختلف طبقات میں تقسیم اس مذہب کو خالص ویدوں کی بنیاد پر از سرِ نو نئی زندگی دینے کی تحریک برپا کی لیکن ان کی اس آریہ سماج تحریک کو ہندوستان کے دو مشہور مقامات بنارس اور الہ آباد میں کوئی خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی کیونکہ یہ دونوں شہر سناتن دھرم کے سب سے بڑے مرکز تھے اور یہاں سناتن دھرم کی جڑیں بے حد

مضبوط تھیں۔ سناتن دھرم کو بنارس اور الہ آباد کے نریشوں کی سرپرستی حاصل تھی۔ سناتن دھرم کے ماننے والے آریہ سماج کو قریب قریب اُدھرم کی نگری بنارس کو فتح کرنے کے لیے سوامی جی نو مرتبہ بنارس تشریف لائے تھے اور مہینوں قیام کیا تھا۔

جب انہیں اپنے مشن میں کسی بھی طرح کی کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ ایسی صورت میں سرسید احمد خاں نے بنارس میں اپنی رہائش گاہ پر ہندو، مسلمان، عیسائی اور پارسیوں کا ایک جلسہ منعقد کیا، جہاں ویدوں کا مطلب اور اہمیت کو سمجھانے کے لیے سوامی دیانند سرسوتی کو مدعو کیا تاکہ بنارس کے عوام آریہ سماج کی اس نئی تحریک سے متعارف ہوسکیں اور اپنی اپنی طرح سے اس پر اپنے ردعمل کا اظہار کرسکیں۔ اسی دوران ستارۂ ہند راجہ شیو پرساد اور ہندی نثر کے معمار اول بھارتیندو ہریش چندر دونوں نے دیانند سرسوتی کے نظریہ اور سرسید احمد خاں کی مہمان نوازی کو تنقید کا نشانہ بنایا اور کسی مسلمان کے گھر ویدوں کے منتروں کو پڑھنے کی جدت کی سخت مخالفت کی اور سناتن دھرم کے خلاف اس سازش کو نفرت اور حیرانی کی نگاہ سے دیکھا۔

بنارس میں ہی کرنل الکاٹ اور تھیوسوفیکل سوسائٹی کے لیکچر میں راجہ شیو پرساد نے کہا کہ پیچھے سوامی دیانند نے ویدوں کا ڈنکا بجایا لیکن جب میں نے ان کو یہاں ایک قابلِ احترام مسلمان دوست (سرسید احمد خاں) کے مکان پر تیس چالیس مسلمانوں کے سامنے وید پر لیکچر دیتے اور وید پڑھتے دیکھا اور سنا' ایشور کی مایا یاد آئی۔''

سرسید نے لکھا ہے کہ بنارس اور دوسرے مقامات پر عالم پنڈتوں کے ساتھ عام مباحثوں میں عام طور پر انہیں فاتح سمجھا جاتا تھا اگرچہ ان کے مغلوب دشمنوں کے حملوں سے انہیں بچانے کے لیے اکثر پولیس کی مدد طلب کرنی پڑتی تھی۔

دیانند سرسوتی کے معاصر اردو ہندی کے ادیب بھارتیندر نے لکھا ہے کہ آپ نے جو کتاب شائع کرائی ہے اس میں ویدوں کے منتر ہیں۔ سو ویدوں کے منتر شودروں اور ملیچھوں کے ہاتھ میں دینے سے آپ کو حقارت محسوس وئی کہ نہسیں۔''

ایک مرتبہ سرسید احمد خاں نے انہیں اپنے یہاں کھانے پر مدعو کیا جس پر انہوں نے معذرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ آپ کے گھر میں کھانا کھانے کے لئے مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن بعض مفاد پرست اور گمراہ کن لوگوں نے یہ افواہ پھیلا رکھی ہے کہ میں مسلمانوں اور عیسائیوں کا سفیر ہوں اور ہندو دھرم کو بھرشٹ کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کے گھر آ کر کھانا کھایا تو انہیں ایک نیا حربہ مل جائے گا۔

سوامی جی ۱۸۷۸ء میں بھی علی گڑھ تشریف لائے تھے۔ سوامی سیتانند کے مطابق ایک دن مہاراج خط لکھوا رہے تھے کہ سرسید ان سے ملنے کے لئے تشریف لائے۔ ان کے ہمراہ چار پانچ اور لوگ بھی تھے۔ سرسید نے کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا تو سوامی جی اپنے کام میں مصروف تھے۔ اس لئے وہ وہیں برآمدے میں

ٹھہر گئے اوران کے چیلے ادھوسنگھ نے سرسید مہاشے کو دیکھ کر سوامی جی کو مطلع کیا تبھی انہوں نے اودھوسنگھ سے کہا کہ جایئے ان کو باعزت طریقے سے اندر لے آ یئے۔ جب سرسید اندر گئے تو سوامی جی نے کہا کہ یہاں کرسی نہیں ہے اس لئے آپ کو فرش پر بیٹھنے میں تکلیف ہوگی۔ جس پر سرسید نے کہا کہ آپ جیسے سنتوں کے پاس فرش پر بیٹھنے کا اپنا الگ ہی لطف ہے۔ کام سے فراغت حاصل کرنے کے بعد وہ سرسید کی طرف متوجہ ہوئے اور دونوں کے درمیان مذہبی امور پر گفتگو شروع ہوگی۔

سوامی جی سرسید احمد خاں کی بہت تعظیم کرتے تھے اور انہیں مہاشے کہہ کر خطاب کرتے تھے۔ سرسید نے ہندوؤں میں ہون کے بارے میں ان سے سوال کیا جس پر انہوں نے ہون کے بہت سے فائدے بتا کر کہا کہ آپ کے ہاسٹل میں کتنے لوگوں کا کھانا بنتا ہے جس پر سرسید نے جواب دیا، سوامی جی نے پھر سوال کیا کہ آپ کے یہاں دال کتنے سیر (کلو) پکتی ہے انہوں نے اس کا بھی جواب دیا۔ سوامی جی نے پھر سوال کیا کہ اتنی دال میں ہینگ کا چھونکا دیا جاتا ہوگا؟ سرسید نے کہا کہ ماشہ بھر سے کم تو ہینگ نہ ہوگی۔ اس کے بعد سوامی جی نے کہا کہ تھوڑی سی ہینگ پوری دال کا ذائقہ بول دیتی ہے اور خوشبودار بنا دیتی ہے۔ اسی طرح یہ ہون بھی ماحول کو تروتازہ کر دیتا ہے اور آلودگی سے نجات دلا دیتا ہے۔ سرسید سوامی جی کی بات سے بہت متاثر ہوئے اور گھر لوٹ آئے۔

پنجاب کیسری لالہ لاجپت رائے (۱۸۶۵۔۱۹۲۸ء) سے سرسید کے مراسم تھے۔ وہ سرسید کے رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' کا بہت ہی دلچسپی سے مطالعہ کرتے تھے اور سرسید کو ۱۹ ویں صدی کا پیغمبر مانتے تھے۔ سرسید کی اصلاحی تحریک کا اثر ہندوؤں پر بھی پڑا تھا جس میں لالہ لاجپت رائے بھی شامل تھے۔ لالہ لاجپت رائے سرسید کی تصنیف اسباب بغاوت ہند سے بے حد متاثر تھے اور خاص کر ۱۸۵۷ء کی جنگ کی ناکامی کے اسباب کے تجزیے سے اس کتاب کو سرسید کی قابل قدر کارنامہ تصور کرتے تھے۔

ستارۂ ہند راجہ شیو پرساد اردو، ہندی، سنسکرت اور فارسی کے ایک ممتاز عالم ودانشور تھے۔ ساتھ ہی ماہرِ تعلیم کی حیثیت سے انہوں نے جو خدمات انجام دی ہے اس سے متاثر ہو کر سرسید احمد خاں نے ۹ رجنوری ۱۸۶۴ء کو سائنٹیفکٹ سوسائٹی کا رکن مقرر کیا تھا۔ سرسید اور بابو شیو پرساد کے درمیان گہرے روابط تھے۔۔ دونوں ہی ۱۸۵۷ء کے حالات، واقعات اور حادثات کے گواہ تھے۔ بنارس میں ملازمت کے دوران سرسید احمد خاں اور راجہ شیو پرساد کے درمیان ملاقاتوں کا سلسلہ قائم تھا۔ لیکن اردو اور ہندی کے متنازعہ کو لے کر دونوں کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے تھے۔

حالانکہ راجہ شیو پرساد اردو کے شاعر تھے اور وہبی تخلص تھا۔ ۱۸۸۰ء میں ان کا مجموعہ ''کلیاتِ وہبی'' کے عنوان سے شائع ہوا۔

۲۹ رجولائی ۱۸۷۲ء کو بابو شیو پرساد نے انگریزی میں سرسید احمد خاں کو خط لکھا تھا جس میں ان کے مجوزہ

کالج کے لئے کچھ شرائط کے ساتھ ایک ہزار روپے کا چندہ دینے کا وعدہ کیا تھا جس میں ایک شرط یہ تھی کہ مجوزہ کالج الہ آباد میں قائم ہو۔ راجہ شیو پرساد نے اس خط کی نقل لفٹیننٹ گورنر کے پرائیویٹ سکریٹری کو بھی ارسال کی تھی۔ کیونکہ لفٹیننٹ گورنر بھی الہ آباد میں کالج قائم کرنے کے لئے دس ہزار روپیہ عطیہ کے طور پر دینے کا وعدہ کیا تھا۔

۱۸۸۷ء میں سر سید اور راجہ شیو پرساد دونوں وائسرائے کونسل کے رکن مقرر ہوئے اور یہ بھی محض اتفاق ہے کہ سر سید اور راجہ شیو پرساد دونوں الہ آباد یونیورسٹی کے فیلو بھی تھے۔

محکمۂ تعلیم میں ان کی نمایاں اور شاندار خدمات کے اعتراف میں اور حکومت وقت کے تئیں ان کی وفاداری کا صلہ دیتے ہوئے سرکار نے ۲۰/مارچ ۱۸۷۴ء میں انہیں 'ستارہ ہند' کے خطاب سے نوزا۔ ۱۶/فروری ۱۸۸۷ء میں انہیں راجہ کے خطاب کے ساتھ ایک ہزار ایکڑ کی اراضی دی گئی۔ وہ تقریباً ۲۲ سال محکمہ تعلیمات سے وابستہ رہے۔ بنارس کے راجہ کے مالی تعاون سے شیو پرساد نے ہر سال پچاس ہزار ردوپیہ جمع کئے جس سے تقریباً ایک ہزار اسکول کھولے گئے جن میں تیس ہزار سے زائد بچے تعلیم حاصل کرنے لگے۔ انہوں نے پچاس اسکول الگ سے قائم کئے۔

راجہ شیو پرساد جیسی عہد ساز شخصیت نے ۱۹ویں صدی کے مغربی شمال ریاست میں نہ صرف ہندی کو ذریعہ تعلیم بنایا بلکہ ریاست کے مختلف علاقوں میں سیکڑوں اسکول کھولے اور ان اسکولوں کے لیے درسی کتابیں بھی تیار کیں۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے اردو میڈیم میں پڑھائی جانے والی کتابیں بھی تیار کیں۔

شیو پرساد واضح طور سے مسلم مخالف تھے اور انہیں کی طرح ان کے فکری رہنما اور مغربی صوبہ میں محکمہ تعلیمات کے ڈائرکٹر تھامس کیمپسن بھی مسلم مخالف تھے۔ ان کی تاریخ کی کتاب اتہاس تمر ناشک ہندوستان میں پہلی ایسی درسی کتابیں تیار کیں۔ اس کے ساتھ ی انہوں نے اردو میڈیم میں پڑھائی جانے والی کتابیں بھی تیار کیں۔

شیو پرساد واضح طور سے مسلم مخالف تھے اور انہیں کی طرح ان کے فکری رہنما اور مغربی صوبہ میں محکمہ تعلیمات کے ڈائرکر تھامس کیمپسن بھی مسلم مخالف تھے۔ ان کی تاریخ کی کتاب اتہاس تمر ناشک ہندوستان میں پہلی ایسی دریسی کتاب تھی جس نے تاریخ کیس کتاب میں فرقہ پرستی کے بیج بوئے اور علیحدگی پسندی کے رجحان کو فروغ دیا۔ شیو پرساد نے آئینہ تاریخ تما کے عنوان سے اس کتاب کا اردو ایڈیشن بھی تیار کیا جس کا انگریزی ترجمہ خود ان کے حاکم اعلیٰ مسٹر کیمپسن یے کیا تھا۔ ان کی مسلم مخالف اس کتاب میں ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی تواریخ میں صرف بادشاہوں کے ظلم واستبداد میں ہی ہے بلکہ صدیوں سے ایک ساتھ رہتے ہوئے ہندو مسلمانوں کے درمیان مشترکہ تہذیب پر جلی حملہ تھا۔ انہوں نے ہندوستان میں ترک، افغان اور اور مغل حکومت کو ایک خاص

رنگ میں رنگتے ہوئے تاریخی صداقت کے برعکس ان کے عہد حکومت کو صرف زوال پزیر حکومت کی شکل میں پیش کیا گیا۔

ہندوستان کی تاریخ میں درسی کتابوں کا بھگواکرن کرنے کی یہ پہلی کوشش تھی۔ لندن میں مقیم سرسید احمد خاں کو جب اس کتاب کے بارے میں پتہ چلاتو انہوں نے ۳۰/اپریل ۱۸۶۹ء کولندن سے بابوگنگا پرساد کوایک خط میں ان سے درخواست کی کہ وہ بابوشیو پرساد کی ہندوستان میں اردو تاریخ کے ساتھ ساتھ ان کی دوسری کتاب آئینۂ تاریخ نما کا انگریزی ترجمہ کیمپسن نے کیا ہے، روانہ کریں۔ ساتھ ہی ان سے متعلق انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع ان کے مضمون کی کاپی بھی لندن بھیج دیں۔ اس بات کا خاص خیال رکھیں کہ یہ کتابیں انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی لائبریری سے یا خرید کر روانہ کریں۔

لندن سے سرسید نے اپنے بہت سے خطوط میں راجہ شیو پرساد کا ذکر کیا ہے۔ محسن الملک کے نام ۹/اپریل ۱۸۷۰ء کے خط میں سرسید نے لکھا کہ ایک اور خبر ملی ہے جس کا مجھ کو کمال رنج وفکر ہے کہ بابوشیو پرساد کی تحریک سے عموماً ہندولوگوں کے دِل میں جوش آیا ہے کہ زبان اردو خط فارسی کو جومسلمانوں کی نشانی ہے مٹادیا جائے۔ میں نے سنا ہے کہ انہوں نے راجہ جے کشن اور سائنٹیفک سوسائٹی کے ہندوممبروں سے تحریک کی ہے کہ بجائے اخبار اردو ہندی ہوترجمہ کتب بھی ہندی میں ہو۔ یہ ایک ایسی تدبیر ہے کہ ہندو مسلمان میں کسی طرح اتفاق نہیں رہ سکتا۔

۱۸۹۵ء میں راجہ شیو پرساد کا جب انتقال ہو گیا تو سرسید نے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں ایک تعزیتی پیغام میں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا کہ ہم کاس خبر کے سننے سے نہایت تعزیتی پیغام میں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا کہ ہم کواس خبر کے سننے سے نہایت افسوس ہے کہ راجہ شیو پرساد بہادرسی ایس آئی نے بائیسویں مئی ۱۸۹۵ء کو بوقت شب اس جہان سے انتقال فرمایا۔ راجہ صاحب ایک نہایت مشہور اور نامور شخص تھے اور متعدد عہدہ ہائے سرکاری پر مامور رہے تھے اور لارڈ رپن کے زمانہ میں وائسرائے کی کونسل کے ممبر مقرر ہوئے تھے۔ ان کی لائف اور ان کی زندگی کی کاروائیاں اس قدر مشہور ہیں کہ تمام لوگ جواب زندہ ہیں، بخوبی واقف ہیں۔ زیادہ تر ان کی عمر کا حصہ تعلیم کے معاملات میں گزرا ہے۔ چند کتابیں بھی ان کی تصنیف کی بہت مشہور ہیں۔ نہایت خاص اور مشہور شخص تھے۔ ایسے مشہور اور نامی لوگوں کا دنیا سے اٹھ جانا بلاشبہ افسوس ورنج کا مقام ہے۔ ایسی نام آوری حاصل کرنی جیسے کہ راجہ صاحب نے حاصل کی تھی نہایت مشکل اور دلیل ان کی نہایت لائق اور دانائی کی ہے۔

ہندی ادب کی تاریخ میں معمار اول کے طور پر تسلیم کئے جانے والے بھارتیندو بابو ہریش چندر جواردو میں رسؔا تخلص رکھتے تھے، سرسید کی قائم کردہ سائنٹیفک سوسائٹی کے رکن تھے۔ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے قلمی

معاونین میں شامل تھے۔ان کا رسالہ ''ہریش چند چندریکا'' علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے اجراء کے ایک دہائی بعد ۱۸۷۵ء میں پہلی بار شائع ہوا۔

انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے قلم کاروں میں محمد حسین آزاد، مولوی ذکاءاللہ، ڈپٹی نذیر احمد، خواجہ الطاف حسین حالی، سراج الدین احمد، سید کرامت حسین (جج ہائی کورٹ الہ آباد) وائٹر ریلے، وحیدالدین سلیم، مولانا شبلی نعمانی کے ساتھ ساتھ ہندی نسل کے بانی بابو ہریش چندر بھی شامل تھے۔

05.3.2 سرسید کے رفقا

سرسید کے رفقاء اور ہم عصروں میں ایک قابل قدر نام راجہ جے کشن داس (۱۹۰۵ء۔۱۸۵۷ء) کا ہے جو مرادآباد کے رہنے والے تھے۔ وہ حکومت برطانیہ کے ملازم کے طور پر پہلے تحصیلدار، اور پھر ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر فائز رہے اور علی گڑھ، الہ آباد اور دیگر مقامات پر تعینات رہے۔

۱۸۶۰ء میں مرادآباد میں قحط کے دوران راجہ جے کشن داس کی سرسید سے ملاقات ہوئی اور بلاتفریق و مذہب سرسید کی شاندار خدمات سے متاثر ہو کر سرسید کے گہرے دوست بن گئے۔

۱۵/اگست ۱۸۶۷ء کو جب سرسید کا تبادلہ بنارس ہوگیا تب سرسید نے سائنٹیفک سوسائٹی کا سارا کام اپنے سب سے عزیز دوست راجہ جے کشن داس کے سپرد کر دیا جو ان دنوں علی گڑھ میں ڈپٹی کلکٹر تھے اور اس طرح سرسید کی غیر موجودگی میں سائنٹیفک سوسائٹی کے سکریٹری کے فرائض انجام دیتے رہے اور یہ سلسلہ سرسید کی آخری سانس تک جاری رہا۔ ۳۰/اپریل ۱۹۰۵ء کو جب راجہ جے کشن داس کا انتقال ہوا تو مدرسۃ العلوم میں ان کے انتقال پر ایک دن کا سوگ منایا گیا اور کالج بند رہا۔ موجودہ سلیمان ہال میں ایک ہاسٹل جے کشن داس ہاسٹل ان کی یاد میں بنایا گیا۔ ساتھ ہی اسٹریچی ہال جو یونیورسٹی کی سب سے قدیم ترین بلڈنگ ہے وہاں بھی ان کے نام کا کتبہ نصب ہے۔

اردو کے ممتاز شاعر اور دانشور مرزا اسداللہ خاں غالب بھی سرسید پر بزرگانہ شفقت رکھتے تھے اور سرسید غالب کو چچا کہتے تھے۔ چچا غالب کا لقب سرسید کا دیا ہوا ہے۔ مقالاتِ سرسید میں مولانا اسماعیل پانی پتی نے غالب کو سرسید کا دوست قرار دیا ہے۔ غالب اپنے عہد کے تمدن اور روایات کے ترجمان تسلیم کیے جاتے ہیں۔ غالب کا سب سے پہلا دیوان بھی سرسید کے بڑے بھائی سرسید خاں کے لیتھوگرافک پریس میں ۱۸۴۱ء میں شائع ہوا۔ غالب نے سرسید کی فرمائش پر آئینِ اکبری کی تقریظ لکھی تھی جو سرسید کو پسند نہیں آئی، اس تقریظ میں غالب سرسید کو مشورہ دیتے ہیں کہ نئے خیالات کو اپنانا ہوگا۔ اور مغربی علوم کو اپنے طریقہ تعلیم میں جگہ دینی ہوگی۔

سرسید احمد خاں نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں، اس وقت معاشرے اور تہذیب ہی نہیں بلکہ ادب اور آگہی، جذبے اور شعور کی سمت و رفتار بدل رہی تھی۔ عجب اتفاق ہے کہ جب مغلیہ سلطنت کا چراغ ہمیشہ کے

لئے گل ہونے والا تھا۔ بڑے بڑے عالم اور شاعر دہلی میں جمع تھے۔ امام بخش صہبائی، مرزا اسداللہ خاں غالب، داغ دہلوی، ذوق، مومن اور نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ جیسے شاعر آسمان ادب پر چھائے ہوئے تھے۔ سرسید کو انہیں بزرگوں کی صحبت نصیب ہوئی اور ان شاعروں اور دلی کے مشاعروں نے قوم، ملک اور شعروادب کے میدان میں جو خدمات انجام دیں وہ اچھے سے اچھا دارے سے کم خدمات نہیں تھیں۔

غالب سے پہلے کسی نے اردو نثر کو قابل اعتنا نہیں سمجھا۔ رلکھنے والے کی یہی کوشش ہوتی کہ اس کی نثر کہاں تک شاعری سے قریب تھی۔ سرسید غالب کی نثر سے متاثر تھے جس کا اظہار خود سرسید نے غالب پر لکھے اپنے مضمون میں بھی کیا ہے۔ ''سرسید نے اردو نثر کی اہمیت اور اس کے مقصد و معیار کو بغیر کسی قسم کا اعلان یا اظہار کئے اس طرح واضح کیا اور اس کے نمونے پیش کئے کہ بیشتر لکھنے والے علمی، سماجی، قومی اور ملکی مسائل کو سادہ دل نشیں اور پرزور نثر میں پیش کرنے اور ہر طبقہ کو متاثر کرنے اور بڑا قومی اور موثر آلہ سمجھنے لگے۔ شاعری کے برعکس نثر نگار غالب کا ظہور انقلاب ستاون کے بعد ہوا۔ حقیقتاً یہ زمانہ (۱۸۶۹ء۔۱۸۵۷ء) مرزا غالب کی اردو نثر کا تھا۔

سرسید کے بزرگ رفیق مرزا اسداللہ خاں غالبؔ کے یہاں اردو شاعری میں فکر کا عنصر سب سے زیادہ ملتا ہے اور اردو میں غالب ہی پہلے شاعر ہیں جنہوں نے شاعرانہ جذبہ میں مفکرانہ گہرائی پیدا کی۔ اچھا شاعر وہ ہے جو زندگی کی گوناگوں حقائق کو سامع اور قاری کے دل میں اس خوبی اور خوبصورتی سے اتار دے کہ وہ بھی اپنے کو اچھا اور بڑا سمجھنے لگیں۔

غالب کے نزدیک دہلی کی تباہی صرف دلی کی تباہی نہ تھی بلکہ تہذیب عالم کی تباہی تھی۔ انہیں مغلیہ سلطنت کے لٹنے کا غم تھا لیکن وہ فاتح قوم کی اعلیٰ صلاحیت اور بہتر کردار کے مداح تھے کہ سرسید کی معرکۃ الآرا کتاب ''آئین اکبری'' کی تصحیح پر ٹوکا اور مغربی علوم کو پھیلانے کی ترغیب دی۔ انھیں سرسید اور ان کے رفقاء سے کہیں زیادہ اس بات کا اندازہ تھا کہ ہندوستانی قوم کو ترقی کرنے بلکہ آنے والے دنوں میں باعزت زندگی بسر کرنے اور اقتدار و اختیار میں حصہ داری کے لئے پرانے خیالات کو پرانے طرز کی زندگی کو ترک کرنا ہوگا اور مغربی علوم کو اپنے طریقۂ تعلیم میں جگہ دینی ہوگی۔ اس طرح غالب سرسید سے زیادہ مستقبل شناس نظر آتے ہیں۔

اردو کے ممتاز طنز و مزاح کے شاعر اکبر الہ آبادی (۱۹۲۱ء۔۱۸۴۶ء) بھی سرسید کے ہم عصر تھے۔ اکبر الہ آبادی کے طنز کا شکار جتنا ہوا اپنی جدید فکر، وسیع القلبی، مذہبی رواداری اور انگریزوں سے مصلحت پسندی کے رویّہ سے ناخوش تھے ایسا کوئی دوسرا نہیں تھا۔

اکبر سرسید اور علی گڑھ تحریک ہی کے مخالف نہیں تھے وہ جدید علوم اور مغربی تہذیب سب پر تنقید رواں

رکھتے تھے۔ان کی تنقید کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ انہوں نے اپنے تنقیدی افکار دلچسپ اور ظریفانہ انداز میں نثر کیئے ہیں ۔

سمیع اللہ خاں دہلی کے رہنے والے تھے اور سرسید سے ان کی دور کی قرابت داری تھی۔۱۸۳۴ء میں دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔مولوی مملوک علی اور مفتی صدرالدین خاں سے بھی علم حاصل کیا۔ ۱۸۵۶ء میں انہوں نے قانونی تعلیم کی طرف توجہ کی اور امتحان وکالت ار منصفی میں پاس ہوئے۔۱۸۵۷ء میں وہ رکھ لے کر سرسید کے گھر پہنچے اور اس میں ان کی بیوی اور بچوں کو سوار کرا کر بستی نظام الدین پہنچایا۔ان کے جانے کے بعد سرسید کے ماموں وحیدالدین خاں اور ماموں زاد بھائی ہاشم علی خاں شہید ہوئے۔۱۸۵۸ء میں مولوی سمیع اللہ خاں کو کانپور کا منصف بنایا گیا۔ چار سال بعد ملازمت ترک کر کے وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔۱۸۶۲ء سے لے کر ۱۸۷۲ء تک نہایت شہرت کے ساتھ اس پیشہ سے وابستہ رہے۔۱۸۷۲ء میں جب سید محمود لندن سے واپس آئے اور الہ آباد میں بیرسٹری کا کام شروع کیا۔ سمیع اللہ خاں نے اس کام سے ان کو واقفیت کرائی۔۱۸۷۳ء میں سمیع اللہ خاں کو علی گڑھ کا صدرالصدور بنایا گیا۔ سمیع اللہ خاں کی علی گڑھ میں موجودگی سے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے تمام کاموں کو تقویت ملی۔علی گڑھ کی سب کمیٹی میں انہوں نے جان ڈال دی چنانچہ سب سے زیادہ چندہ بھی اسی سب کمیٹی نے کیا۔

علی گڑھ سے ان کا تبادلہ مرادآباد ہوا۔ وہاں بھی انہوں نے بڑے پیمانے پر چندکا کام شروع کیا۔ مرادآباد ضلع میں کانٹ وغیرہ سے بھی انہوں نے چندہ کروایا۔۳۰/مارچ ۱۸۸۰ء کو انہوں نے مرادآباد میں ایک بڑا جلسہ کیا۔اس جلسہ میں سرسید بھی شریک تھے۔مرادآباد کے جج ولی ینگ نے اس جلسہ کی صدارت کی بہت بڑی تعداد میں ن لوگوں نے چندہ دیا۔

۱۸۸۰ء میں انگلینڈ تشریف لے گئے۔۱۸۸۴ء میں لاڈ رنا تھ بروک کے ساتھ مصر گئے تھے۔ واپسی پر ان کو سی۔ایم۔جی کا خطاب ملا اور ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کے عہدہ پر ان کی تقرری ہوئی۔ان کی قدر آور شخصیت سے کالج کا یورپین اسٹاف خائف تھا۔اسٹاف کو یقین تھا کہ اگر سرسید نے اپنی زندگی میں آئندہ کے لیے سکریٹری شپ کا کوئی انتظام نہیں کیا تو سرسید کے بعد مولوی سمیع اللہ خاں ضرور سکریٹری ہوں گے۔ٹرسٹی بل میں جب سرسید کے جانشین کی حیثیت سے سید محمود کا نام شامل کیا گیا اس پر سمی اللہ خاں نے اعتراض کیا۔کالج فنڈ کمیٹی کے ممبران نے سرسید کی تائید کی چنانچہ سمیع اللہ خاں نیچ کالج سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔مولوی سمیع اللہ خاں نے بعد میں الہ آباد یونیورسٹی میں مسلم بورڈنگ ہاؤس قائم کیا اور ان کے صاحبزادے حمیداللہ خاں کے نام پر الہ آباد یونیورسٹی کا حمیدیہ پوسٹ گریجویٹ کالج قائم ہے۔

سرسید جدید تعلیم اور جدید طرز معاشرت کو مسلمانوں کی فلاح و بہبود اور ترقی کا موثر ریعہ تصور کرتے تھے

جبکہ اکبرالہ آبادی مشرقی تہذیب کے دلدادہ تھے۔مغرب کی ہر چیز کو وہ مشکوک نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ان کو ہر وقت یہ خطرہ تھا کہ قوم کا تہذیبی سرمایہ ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی کے الفاظ میں اکبر کی نظر، قوم کی میراث اور قوم کی تقریر پر تھی۔ان کی شاعری کے ایک بڑے حصہ میں علی گڑھ تحریک پر بھر پور طنز ہے۔

سلیم احمد اکبر کی تنگ نظری کے عنوان سے اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں ''اکبر تنگ نظر تھے، نیک نیتی کے باوجود ان کے دل میں وسعت نہ تھی اس لئے انہوں نے خوبیوں کا اعتراف نہ کیا۔ان کے مزاج میں جذباتیت تھی حقیقت پسندی نہ تھی، اسی لئے انہیں ماضی سے عقیدت اور لگا تھا اور حال سے نفرت اور بیزاری۔۔ وہ تغیر کو، زندگی کی تبدیلیوں کو، مستقبل اور اس کے امکانات کو شک وشبہ کی نظروں سے دیکھتے تھے، اس لئے آگے بڑھنے والوں کا مذاق اڑا کر رہ گئے ان کی رہنمائی نہ کر سکے۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے سرسید اور اکبر کے عنوان سے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ'' سرسید ایک انقلاب لانا چاہتے تھے لاکر رہے۔اکبر اس انقلاب کے زور کو کم کرنا چاہتے تھے کم کر کے رہے، ظاہر کہ اپنے مشن میں دونوں کامیاب رہے اور دونوں کے مشن سے ہماری تہذیبی اور سیاسی زندگی متاثر ہوئی بلکہ اگر ہم برصغیر کی سیاسی زندگی متاثر ہوئی بلکہ اگر ہم برصغیر کی سیاسی وملّی تحریکوں اور تعلیمی وتہذیبی تنظیموں کا مطالعہ کریں تو اندازہ ہوگا کہ ان پر جتنا گہرا اثر اکبر کے مسلک کا ہے، سرسید کے مسلک کا نہیں ہے۔مولانا شبلی، حالی، علامہ اقبال، حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خاں، مولانا آزاد، مولانا محمد علی جوہر اور سید سلیمان ندوی جنہوں نے مسلمانوں کے دینی وملّی شعور پر گہرا اثر ڈالا ہے، سب کے سب سرسید سے کہیں زیادہ اکبر کے خیالات سے متفق ومتاثر ہیں۔

اردو ہندی تنازعہ کو لے کر سرسید احمد خاں نے ۹ر دسمبر۱۸۷۳ء کو الہ آباد میں ایک جلسہ کیا جس کا مقصد مسلمانوں کو ہوشیار کرنا تھا تا کہ اردو کی جگہ ہندی دیوناگری کی تحریک سے مسلمانوں کی رائے عامہ کو بیدار کیا جائے اور اسی مقصد کے حصول کے لئے سرسید نے الہ آباد میں ایک کمیٹی بھی تشکیل دی تھی کیونکہ الہ آبادی ہی صوبہ کا دارالخلافہ تھا۔اردو کی سب سے زیادہ مخالفت بنارس اور الہ آبد کے لوگ ہی کر رہے تھے۔سرسید چاہتے تھے کہ الہ آباد کی سنارل کمیٹی کے ماتحت ہر ضلع میں اسی طرح کی کمیٹیاں قائم کی جائیں تا کہ دیوناگری رسم خط کے خلاف اردو والوں سے دستخط کرا کر گورنمنٹ کے سامنے پیش کیا جا سکے۔اکبرالہ آبادی نے اس اجلاس میں شرکت کی تھی۔

سید ظہور حسین، سید امداد علی کے بیٹے تھے اور مراد آباد کے محلّہ مغلپورہ میں ان کی رہائش تھی۔سرسید کی سائنٹیفک سوسائٹی کے اولین ممبوروں میں سے تھے اور ۹ر جنوری ۱۸۶۴ء کو ہی اس کے ممبر بن گئے تھے اس وقت وہ صدر کورٹ آگرہ میں وکیل تھے۔سائنٹیفک سوسائٹی کی عمارت کی تعمیر کے لیے انہوں نے تین سو روپے، لائبریری کے لئے ایک مخطوطہ شاہ نامہ کا اور میوزیم کے لیے ایک دوربین دی تھی۔اس دوربین کی قیمت اس وقت پانچ سو

روپے تھے۔ ۱۸۶۹ء میں جب سرسید انگلستان جا رہے تھے اس وقت انہوں نے سرسید کو چاندی کی ایک بہت عمدہ گھڑی دی تھی۔ سرسید سے بہت زیادہ محبت کرتے تھے سرسید نے خطبات احمدیہ کی چھپائی کے لیے جب اپنے دوستوں سے چندہ طلب کیا۔ اس سلسلے میں انہوں نے محسن الملک سید مہدی علی کو یکم اکتوبر ۱۸۶۹ء کو لکھا کہ :
''......میں نے میر ظہور حسین صاحب سے سو روپے چندہ کے طلب کیے ہیں گو وہ کہتے ہیں کہ تنگ ہوں مگر ضرور بھیجیں گے۔ وہ میری بات سے کبھی انکار نہیں کرنے کے......'' ایک اور خط میں ۱۰ر جنوری ۱۸۷۰ء کو لکھا کہ ''......میر ظہور حسین نے ۱۵۰ روپے بھیجا ہے۔'' سید ظہور حسین کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان کے بھی ممبر تھے۔ اور انہوں نے اس کمیٹی کو تیس روپے بھی دیے تھے۔ ۱۲رمئی ۱۸۷۲ء کو ان کو محمڈن اینگلو اورینٹل کالج فنڈ کمیٹی کا ممبر بنایا گیا اور بحیثیت ممبر کالج فنڈ کمیٹی انہوں نے محمڈن کالج کو مراد آباد میں قائم کرنے کی رائے دی تھی جب کہ ۵۵ ممبروں میں سے ۴۷ ممبروں نے محمڈن کالج کو علی گڑھ میں قائم کرنے کی رائے دی تھی۔

اردو کی حمایت میں سرسید نے جب ۹ر دسمبر ۱۸۷۳ء کو ایک صدر کمیٹی الہ آباد میں قائم کی تھی ظہور حسین اس کمیٹی کے بھی ممبر تھے۔ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میں عمارتوں کی تعمیر کے لیے انہوں نے چار ہزار ایک سو روپے (۲۰۱۳ء کے تقریباً بارہ لاکھ تین ہزار روپے) دیئے تھے۔ مدرسۃ العلوم کی تعمیر کے لیے سب سے اولین چندہ دینے والوں میں شامل تھے۔ کالج میں جنوبی دروازے کی تعمیر کے لیے ۱۵۰۰ روپے الگ سے دیئے اور وہ دروازہ آج بھی ظہور حسین گیٹ کے نام سے مشہور ہے۔ احاطے کی جنوبی دیوار کی دو جالیوں پر بھی ان کا نام لکھا ہوا ہے۔ ملکہ وکٹوریہ نے جب امپریس آف انڈیا کا بھی خطاب اختیار کیا تو اس کی مبارکباد دینے کے لیے سرسید نے شمالی ہندوستان کے ۵۲ معزز مسلمانوں پر مشتمل ایک وفد وائسرائے اور ملکہ وکٹوریہ کو مبارکباد دینے کے لیے منتخب کیا تھا جس میں ظہور حسین بھی شامل تھے۔

۸ر جنوری ۱۸۷۷ء کو ہندوستان کے وائسرائے لارڈ لٹن کالج کی بنیاد کا پتھر رکھنے علی گڑھ تشریف لائے سرسید نے ان کا علی گڑھ ریلوے اسٹیشن پر استقبال کیا اور ان کو ساتھ لے کر اپنی کوٹھی پر تشریف لائے۔ یہاں انہوں نے اپنے یورپین دوستوں اور محمڈن اینگلو اورینٹل کالج فنڈ کمیٹی کے چند ممبران کو وائسرائے سے ملوایا جن میں ظہور حسین بھی شامل تھے۔ فاؤنڈیشن کی جگہ پر جب لارڈ لٹن تشریف فرما ہوئے اس وقت وہ ر لوگ ان کے اردگرد کھڑے تھے جو کمیٹی مدرسۃ العلوم کی جانب سے مصاحبین حضور وائسرائے قرار پائے تھے ان میں ظہور حسین بھی شامل تھے۔

۶ر فروری ۱۸۹۱ء کو ان کا اچانک انتقال ہوا۔ انہوں نے اپنی ساری منقولہ جائیداد محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے نام کر دی تھی۔ ان کی وفات کے بعد سرسید نے ان کے دوستوں کو لکھا کہ سید ظر ہور حسین نہایت رحم دل تھے اور چھوٹے بچوں پر عموماً نہایت مہربانی اور رحم دلی کرتے تھے۔ پس چھوٹی عمر کے لڑکوں کے رہنے کے لیے ان

کی یادگار میں مکان بنانا نہایت مناسب ہوگا۔ کالج میں ظہور حسین وارڈ کی عمارت ان کی جائیداد منقولہ کی قیمت اور ان کے دوستوں کی اعانت سے تعمیر کی گئی۔ ان کے انتقال پر تعزیت کرتے ہوئے سرسید نے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں لکھا کہ: ان کو مہمان نوازی سے زیادہ خوش کرنے والی نہ تھی۔ ان کے دوستوں اور ملاقاتیوں میں کوئی شخص ایسا نہ ہوگا جو کسی نہ کسی طرح سے ان کا ممنون احسان نہ ہو۔

سرسید احمد خاں کے اپنے معاصرین علماء سے بھی اچھے تعلقات تھے۔ دارالعلوم دیوبند کے بانی مولانا محمد قاسم نانوتوی (۱۸۳۲ء۔۱۸۸۰) ایک عہد ساز شخصیت کے مالک تھے۔ برصغیر ہندوستان اور پاکستان میں دینی مدارس کا جو جال بچھا ہوا ہے وہ قافلہ سالار تھے اور یہی دینی مدارس آج اسلام مذہب کے سبب سے بڑے قلعے اور ملتِ اسلامیہ کی آرزوؤں کا مرکز تصور کئے جاتے ہیں۔

مولانا قاسم نانوتوی اور سرسید احمد خاں دونوں ہی ۱۸۵۷ء کے حالات، واقعات اور حادثات کے پروردہ تھے۔ مولانا قاسم نانوتوی کے شاگرد رشید شیخ الہند مولانا محمود حسن نے ۲۹/ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو محمڈن کالج، علی گڑھ کی جامع مسجد میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی یومِ
تاسیس کے موقعہ پر خطبہ پیش کیا۔

مولانا عبدالحئ فرنگی محلی (۱۸۴۸ء۔۱۸۸۶ء) کا شمار اپنے وقت کے ممتاز علماء میں ہوتا تھا۔ سرسید کی اصلاحی تحریک سے وہ بے حد متاثر تھے مگر سرسید کے مذہبی فکر اور اعتقادات کے مخالف تھے اور سرسید کے خلاف کفر کا فتویٰ دینے والوں میں مولانا عبدالحئ فرنگی محلی بھی شامل تھے جو سرسید کو دائرۂ اسلام سے خارج قرار دیتے تھے۔

آپ نے کیا سیکھا

1۔ طلبہ سرسید کی سماجی وادبی خدمات سے واقف ہوئے۔

2۔ طلبہ سرسید کے کاموں اور سرگرمیوں کا علم ہوا۔

3۔ طلبہ سرسید کے رفقا کے کردار سے واقف ہوئے۔

4۔ طلبہ سرسید کے معاصرین کی خدمات سے متعارف ہوئے۔

اپنا امتحان خود لیجئے۔

(۱) گارساں دتاسی نے سرسید کی کس کتاب کا ترجمہ کیا؟

(۲) سوامی دیانند کون تھے؟

(۳) سرسید کو الہ آباد میں کالج بنانے کی پیش کش کس کس نے کی؟

(۴) راجہ شیو پرساد سرسید کی کس سوسائٹی کے رکن تھے؟

(۵) ہندی ادب کے معمار بھارتیندر ہریش چند سرسید کے کس رسالے کے لئے لکھتے تھے؟

سوالوں کے جوابات۔

جواب1: آثارالصنادید

جواب2: مہارشی سوامی دیانند سرسوتی انیسویں صدی کی سماجی تحریکات کے اولین مفکر، مدبر اور سماجی مصلح تھے۔

جواب3: بابوشیو پرساد نے۔

جواب4: سائنٹیفک سوسائٹی۔

جواب5: تہذیب الاخلاق۔

فرہنگ :

لفظ	معنی
معاصرین	ہم عمر
نشاۃ ثانیہ	زوال کے بعد دوبارہ عروج
تشخص	پہچان
قحط	خشک سال (اکال)
یومِ تاسیس	افتتاحی دن
خطبہ	خطاب (تقریر)

کتب برائے مطالعہ :

(۱) **حیاتِ جاوید**: خواجہ الطاف حسین حالی، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی

(۲) **شناسانِ سرسید**: ساجد نعیم، سرسید اکیڈمی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

(۳) **مسافرانِ لندن**: اصغر عباس، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ

(۴) **سرسید کی تعزیتی تحریریں**: اصغر عباس، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ

(۵) **سرسید احمد خاں اور ان کے معاصرین**: راحت ابرار، رفلکشنز پرنٹرس اینڈ پبلشرس، علی گڑھ

(۶) **سرسید کی سائنٹیفک سوسائٹی**: مرتبہ اصغر عباس، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ

(۷) **رفقاءِ سرسید**: افتخار عالم خاں، براؤن پبلی کیشنز، نئی دہلی

(۸) **سوانح سرسید: ایک بازدید**۔ شافع قدوائی، براؤن پبلی کیشنز، نئی دہلی

اکائی 6 سرسید احمد خاں کی تصنیف ''اسباب بغاوت ہند'' کا تنقیدی مطالعہ

اکائی کی ساخت

06.1 اغراض ومقاصد

06.2 تمہید

06.3 اسباب بغاوت ہند کا تنقیدی مطالعہ

06.3.1 ۱۸۵۷ء کی بغاوت کا پس منظر

06.3.2 اسباب بغاوت ہند-تعارف و تجزیہ

06.4 خلاصہ

06.5 آپ نے کیا سیکھا

06.6 سوالوں کے جوابات

06.7 فرہنگ

06.8 کتب برائے مطالعہ

06.1 اغراض ومقاصد

1۔ طلبہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور اس کے نتائج سے واقف ہوں گے۔

2۔ طلبہ کو ۱۸۵۷ء کے دوران سرسید کے کاموں اور سرگرمیوں کا علم ہوگا۔

3۔ طلبہ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے کردار سے واقف ہوں گے۔

4۔ طلبہ سرسید کی تصنیف اسباب بغاوت ہند سے متعارف ہوں گے۔

5۔ طلبہ اسباب بغاوت ہند کی اہمیت وافادیت سے واقف ہوں گے۔

06.2 تمہید

سرسید احمد خاں بیک وقت ایک مصلح، دانشور، ماہر تعلیم، مفسر، ادیب، صحافی ہونے کے علاوہ مورخ، محقق اور دوراندیش بھی تھے۔ ان کی نظر حالات حاضرہ پر بہت گہری تھی اور وہ زمانہ میں موجود امکانات سے بھی بھرپور طریقے سے واقف تھے۔ وہ زمانہ کی رفتار اور ہر رخ کو اچھی طرح پہچانتے تھے۔ لہٰذا انھوں نے مذہب اور تفسیر میں اجتہاد کی صورت پیدا کی، جدید تعلیم کو فروغ دیا، انگریز حکومت کی مثبت ترقیوں اور فیصلوں کا خیر مقدم کیا اور مسلمانوں کو اسے اپنانے کی تلقین کی اور اصلاح معاشرت کے لیے ہر قدم اٹھایا مگر اسی طرح جب جب انہیں انگریزوں کے اٹھائے گئے منفی اقدامات یا منفی تصورات کا اندازہ ہوا تو انھوں نے اس کی بے باکی سے مخالفت کی اور اپنے موقف پر ڈٹے رہے اور غلط کو غلط ثابت کر کے مانے۔ اس کی عمدہ مثال رسالہ ''اسباب بغاوت ہند'' ہے، جس میں انھوں نے انگریزوں کے ذریعہ ہونے والے ہندوستانیوں پر ظلم وستم، استحصال، تعصب ومنافرت کی نشاندہی کی اور اسے حقائق کے ذریعہ ثابت بھی کیا۔

06.3.1 ۱۸۵۷ء کی بغاوت کا پس منظر

۱۸۵۷ء کی ہندوستانی بغاوت برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کے خلاف ایک بڑی جنگ تھی، جسے ہندوستانی بغاوت یا ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ ۱۸۵۷ء ہندوستان کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ قدیم وجدید کے درمیان یہی وہ کڑی ہے جس کے ذریعے ماضی کے نقوش کا مطالعہ اور مستقبل کا جائزہ لیا جاسکتا ہے۔

نواب سراج الدولہ کی جنگ پلاسی اور میر قاسم وشاہ عالم کو بکسر میں شکست اور ۱۷۹۹ء میں ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی مختلف علاقوں میں پھیلنے لگی۔ اس کمپنی کو یہاں تجارت کی غرض سے بنایا گیا تھا لیکن انگریزوں نے اس کمپنی کے ذریعے یہاں کے سیاسی وسماجی معاملات میں دخل دینا شروع کردیا اور رفتہ رفتہ اس ملک پر قابض ہوگئے اور ہندوستانی عوام کو ذہنی، نفسیاتی، سماجی تمام اعتبار سے غلام بنانے لگے اور ہندوستانی مزدوروں، کاریگروں پر ظلم جبر اور تشدد کرنے لگے اور انہیں سے ہندوستان کی زرخیز سرزمین پر افیون، ڈرگس وغیرہ کی کھیتی کرانے لگے اور سارا مال وساری دولت انگلستان لے جانے لگے جس کی وجہ سے ہندوستان کے اقتصادی حالات خراب ہوگئے اور اسی حالت زار کے باعث ہندستانی عوام کو بھوک وقحط کا سامنا کرنا پڑا۔ انگریزی حکومت نے ہندوستان کی معیشت پر گہرے اثرات ڈالے، عوام کے ریوں اور اخلاقی اقدار میں تبدیلیاں ہونے لگیں اور ان کی زندگی بدحالی کی طرف مائل ہوتی چلی گئی اور ہندوستانی عوام کے دلوں میں انگریزی حکومت کے خلاف بے چینی واضطراب کی کیفیت دن بدن بڑھتی جارہی تھی جو ۱۸۵۷ء میں بغاوت کی شکل میں رونما ہوئی۔ سرسید احمد خاں نے ''اسباب بغاوت ہند'' میں اس کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''بہت سی ایسی باتیں ایک مدت دراز سے لوگوں کے دل میں جمع ہوتی جاتی ہیں اور بہت بڑا میگزین جمع ہوگیا تھا۔ صرف اس کے شتابے میں آگ لگانی باقی تھی کہ سال گزشتہ میں فوج کی بغاوت نے اس میں آگ لگادی۔'' (سرسید احمد خاں، رسالہ اسباب بغاوت ہند، مفصلائٹ گزٹ پریس آگرہ ۱۸۵۹ء، ص ۳)

۱۸۵۷ء کا سانحہ وجود میں آیا اس سے صرف سیاسی نظام کا خاتمہ ہی نہیں ہوا تھا بلکہ قرون وسطیٰ کے ہندوستان کا تہذیبی سرمایہ بھی نیست ونابود ہوگیا اور علم وہنر کے مراکز تباہ وبرباد ہوگئے، جیسا کہ غالب نے اس حالت زار کو اپنے خط میں بیان کیا ہے:

> ''دلی واللہ اب شہر نہیں یہ کیمپ ہے، چھاؤنی ہے، نہ قلعہ نہ شہر نہ بازار، نہ نہر۔'' (خطوط غالب، غلام رسول مہر، غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ص: ۲۶۸)

اس جنگ کے خاتمے کے بعد انگریز حکمرانوں نے عوام کو یہ یقین دلایا کہ ان کے مذہب اور رسم ورواج کا لحاظ کیا جائے گا اور ہر شخص کو اس کی تعلیم وقابلیت کے مطابق نوکری دی جائے گی، غرض یہ کہ ان کا کہنا تھا کہ اب وہ عوام کے کسی بھی معاملات میں دخل اندازی نہیں کریں گے مگر اس کے ساتھ ہی انگریزوں نے حکومت کرو اور پھوٹ ڈالو کی پالیسی

اختیار کی اور عوام میں محبت و ہمدردی، بھائی چارگی جیسے احساسات و جذبات کا خاتمہ کیا جس کے باعث عوام میں نفرت کا جذبہ پروان چڑھنے لگا تا کہ عوام پھر سے متحد نہ ہو اور ۱۸۵۷ء جیسی بغاوت وجود میں نہ آئے۔

06.3.2 اسباب بغاوت ہند کا تنقیدی مطالعہ

سرسید احمد خاں اپنے عہد کے ممتاز مفکر، ادیب، سماجی مصلح اور تاریخ داں بھی تھے۔ سرسید کی پوری زندگی قوم کی بھلائی اور ملک کو جمہوری طور پر مستحکم کرنے میں صرف ہوئی۔ سرسید احمد خاں کی پوری شخصیت ہی قومی ہمدردی اور حب الوطنی سے عبارت ہے۔ ان کی حب الوطنی اور قومی ہمدردی کی مثال ان کی ایک کتاب ''اسباب بغاوت ہند'' ہے، جس کی اشاعت ۱۸۵۸ء میں مفصلیت گزٹ آگرہ سے ہوئی۔ اس کتاب میں ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کے اسباب و علل کو تفصیل سے پیش کیا گیا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کی اصل وجوہات کو انگریزوں کے سامنے کافی مدلل انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ سرسید نے ہندوستانی عوام کو بے قصور بتاتے ہوئے بغاوت کے پس پشت عموماً ہندوستانی عوام اور خصوصاً مسلمانوں پر کیے جانے والے مظالم کی روک تھام کی زبردست سعی کی ہے۔

سرسید کی کتاب ''اسباب بغاوت ہند'' کے نام سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ سرسید ۱۸۵۷ء کی جنگ کو بغاوت مانتے تھے، جب کہ بہت سے ہندوستانیوں نے اسے پہلی جنگ عظیم یا آزادی کی پہلی لڑائی کہا ہے۔ کارل مارکس نے بھی اپنی کتاب ''دی فرسٹ انڈین وار آف انڈیپنڈینس'' میں ۱۸۵۷ء کی لڑائی کو جنگ آزادی کا نام دیا ہے حالانکہ ۱۸۵۷ء کی لڑائی کو بغاوت اور جنگ آزادی کا نام دینے میں بہت فرق ہے یعنی بغاوت کی شکل میں ہم اس کو صحیح نہیں مانتے جب کہ جنگ آزادی کی شکل میں ہم اس کے حمایتی بن جاتے ہیں۔

انگریز انیسویں صدی کے آغاز سے ہی ہندوستان کی تجارت پر قابض ہو گئے تھے، صرف تجارت ہی نہیں سیاست میں بھی مضبوط ہو گئے تھے اور اپنی فتوحات کے بعد وہ ہندوستان پر حکومت کرنے کا خواب دیکھنے لگے اور اپنے اس خواب کی تکمیل کے لیے انھوں نے مختلف طرح کے طریقے و حربے آزمائے اور نوابوں اور رؤسا سے ان کی جاگیریں ضبط کیں۔ ان کے ساتھ بدعہدی کا معاملہ کیا، ہندوستانی عوام کا استحصال کیا، کاریگروں و مزدوروں پر ظلم کی انتہا کر دی، پرانے نظام کو تبدیل کر دیا، تعلیمی نظام میں اصلاحات کے نام پر اختراعات/ ایجادات کیں۔ مذہبی امور میں دخل اندازیاں کیں، جس کی وجہ سے عوام میں اضطراب اور انگریزوں سے بیزاری میں اضافہ ہوتا گیا جس کے نتیجے میں ۱۸۵۷ء کی بغاوت رونما ہوئی، لیکن یہ بغاوت ناکام ہوئی اور انگریز حکمرانوں نے ہندوستانی عوام بالخصوص مسلمانوں پر ظلم ڈھانے لگے اور سر بازار لوگوں کو پھانسیاں دینے لگے۔ یہ وہ دور تھا جب اشارے و کنایے میں بات کرنے پر موت کی سزا دی جاتی تھی اور مسلمانوں کی زندگی دشوار کر دی گئی تھی۔ سرسید احمد خاں نے اس تباہی و بربادی کا جو ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد ہوئی، اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا۔ بقول حالی:

> ''وہ مجبور ہیں مسلمانوں کی تباہی اپنی آنکھ سے دیکھ کر آئے تھے، جب مراد آباد میں پہنچے تو ان کی تباہی و بربادی کا اور بھی زیادہ عبرت انگیز نقشہ ان کی نظر سے گزرا جس سے ایک اور چوٹ ان کے

دل پر لگی۔'' گورنمنٹ کا غصہ خاص کر مسلمانوں کے حال پر بدستور جاری تھا۔ مسلمانوں سے دل کھول کھول کر بدلے لے رہے تھے۔ مسلمانوں کو مجرم قرار دینے کے لیے کوئی ثبوت درکار نہ تھا، ان کا مسلمان ہونا ہی اس کے مجرم ٹھہرانے کے لیے کافی تھا۔'' (حیات جاوید، الطاف حسین حالی، انجمن ترقی اردو (ہند)، دہلی، ۱۹۳۹ء، ص: ۷۵-۷۶)

اس صورت حال سے سرسید غم زدہ ہو گئے اور انہیں ہی فکر لاحق ہو گئی کہ کسی طرح انگریزوں کے اس رویے کو بدلنے کی سعی کرنی چاہیے۔ سرسید نے تحقیق کی اور بغاوت ہند پر لکھی گئی کتابوں کا تفصیلی مطالعہ کیا اور اسی کے پیش نظر اپنی کتاب ''اسباب بغاوت ہند'' لکھی۔ اس کتاب کو سرسید نے مراد آباد میں صدر الصدور کے عہدے پر فائز ہونے کے بعد لکھا تھا۔ یہیں انہیں غدر کے باغیوں کے خلاف قائم کیے گئے کمیشن کا ممبر مقرر کیا گیا تھا اور اسی ممبرشپ کی بنا پر سیکڑوں بے گناہ مسلمانوں کو چھوٹے مقدمے و الزامات سے رہائی ملی۔

انگریزوں کا ماننا تھا کہ اس بغاوت کے پیچھے مسلمانوں کی کوئی سازش چل رہی ہے۔ لہٰذا سرسید انگریزوں سے اس غلط خیال کو دور کرنے میں لگ گئے اور اس کتاب کی تصنیف کی اور جب اس کو لکھ چکے تو ان کے دوست ماسٹر رام چندر کے چھوٹے بھائی رائے شنکر داس جو اس وقت مراد آباد میں منصف اور سرسید کے دوست تھے، انھوں نے کہا کہ ان تمام کتابوں کو جلا دو اور ہرگز اپنی جان کو معرض خطر میں نہ ڈالو۔ تب اس وقت ہمارے قومی رہنما سرسید نے جواب دیا وہ حب الوطنی کی مثال ہے۔ سرسید نے کہا:

''میں ان باتوں کو گورنمنٹ پر ظاہر کرنا ملک اور قوم اور خود گورنمنٹ کی خیر خواہی سمجھتا ہوں۔ پس اگر ایسے کام پر جو سلطنت اور رعایا دونوں کے لیے مفید ہو مجھ کو کچھ گزند بھی پہنچ جائے تو گوارا ہے۔''

(حیات جاوید، الطاف حسین حالی، نامی پریس کانپور، ۱۹۰۱ء، ص: ۸۶)

سرسید نے اس کتاب کو لکھنے کے بعد عام نہیں کیا تھا۔ اس کتاب کی ۵۰۰ کاپیاں شائع ہوئیں لیکن اس کی ایک بھی کاپی ہندوستانیوں کو نہیں دی بلکہ ہندوستانی گورنمنٹ کو ایک کاپی بھجوائی اور بقیہ تمام کاپیاں ولایت روانہ کر دی گئیں اور جب گورنمنٹ انڈیا میں اس کتاب کا انگریزی ترجمہ پہنچا تو وہاں کے ایک افسر مسٹر بیڈن کو یہ کتاب خاصی ناگوار لگی اور انھوں نے اسے سرسید کا باغیانہ مضمون قرار دیا لیکن دوسرے صاحب رائے لوگ اور عہدیداران نے سرسید کی اس تحریر کو صحیح واقعات کی پردہ دری اور حکومت کی خیر خواہی پر محمول کیا اور جب یہ کتاب برطانیہ پہنچی تو وہاں کے لوگوں نے سرسید کی سیاسی بصیرت کی داد دی۔

سرسید اس کتاب کے ذریعے انگریزی حکومت کو یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ ہندوستانی باشندوں کے ساتھ جو غیر منصفانہ رویہ انگریز حکمران نے برتا ہے اسی کی وجہ سے یہ بغاوت ہوئی ہے اور انگریز حکمرانوں نے ہندوستانیوں کو لیجسلیٹو کونسل میں شامل نہیں کیا، جس کی وجہ سے عوام گورنمنٹ کی افادی اسکیموں اور اچھے ارادوں کو سمجھنے سے قاصر رہی۔ سرسید نے اپنی کتاب میں جن اسباب کا ذکر کیا ہے جن کی وجہ سے ہندوستان میں سرکشی کی شروعات ہوئی۔ سرسید نے لکھا ہے کہ:

''۱۸۵۷ء کی سرکشی کسی ایک بات سے نہیں ہوئی بلکہ بہت سی باتوں کا مجموعہ تھا۔'' (اسباب بغاوت ہند، ص:۷۲)

اس قول سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ عوام کی ناراضگی یا بغاوت کسی ایک سبب کی بنا پر نہیں تھی۔ اگر حکومت عوام کے حالات سے واقف ہوتی تو ان کی ناراضگی کو ضرور جان لیتی۔

سرسید احمد خاں نے اس کتاب میں بغاوتِ ہند کے پانچ اسباب بتاتے ہوئے اس کے تدارک کی تجویز بھی پیش کی ہیں۔ سرسید کا ماننا تھا کہ اسباب بغات میں ہندوستانیوں کو اعلیٰ مقام و مرتبہ سے دور رکھا اور ان کے رسم و رواج کے خلاف قوانین کی تشکیل اور حکومت برطانیہ کی عوام کے حالات سے ناواقفیت تھی۔ اسباب بغاوت ہند میں سرسید کی پیش کردہ تجاویز میں سے مختلف تجاویز پر انگریز حکومت نے عمل کیا۔ مثلاً سرسید کی تجویز پر ۱۸۶۱ء میں ہندوستانیوں کو قانون ساز مجلس کا ممبر بنایا گیا اور ۱۸۶۲ء کے اجلاس میں پہلی بار مہاراجہ نریندر دیو (پٹیالہ) راجہ دیونرائن سنگھ رئیس بنارس اور راجہ دنکر راؤ دیوان ریاست گوالیار بحثیت رکن شریک ہوئے۔ اس کے علاوہ سرسید نے ہندوستانی عوام کو اعلیٰ عہدہ نہ ملنے کی بھی شکایت درج کی تھی تو ۱۸۶۲ء میں پہلی بار شمبھوناتھ ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے۔

سرسید کو انگریز بہت عزیز رکھتے تھے۔ سرسید کے دل میں بھی ان کے تئیں ایک نرم گوشہ موجود تھا۔ انگریزوں نے ہی سرسید کو 'سر' کا خطاب دیا اور سرسید نے بھی کئی موقعوں پر ان سے اپنی محبت اور وفاداری کا ثبوت دیا تھا، جس کی وجہ سے اس وقت کے قومی رہنماؤں نے سرسید کو انگریزوں کا ہمدرد بھی کہا، لیکن اس کتاب کو لکھتے وقت سرسید کے جی میں یہ خیال ضرور آیا ہوگا کہ انگریز ان کی باتوں کا برا کیوں مانیں گے۔ حالانکہ انھوں نے ماضی میں اپنی وفاداری ثابت کردی تھی۔ سرسید اس کتاب کے ذریعہ انگریزوں سے جھگڑا نہیں مول لینا چاہتے تھے۔ سرسید نے اس پُرآشوب دور کے تمام الزامات جو لوگوں کے خیال میں گورنمنٹ پر عائد ہوتے تھے نہایت دلیری و بہادری کے ساتھ بیان کیے اور جو اسباب انگریزوں کے دلوں میں پوشیدہ تھے ان کی تردید کی۔

سرسید نے اپنی کتاب ''اسباب بغاوت ہند'' کو پانچ فصلوں میں تقسیم کیا ہے اور ہر فصل میں ذیلی عنوانات کے تحت ان اسباب پر گفتگو کی ہے، جس کی وجہ سے یہ بغاوت رونما ہوئی۔

فصل اول۔ تجاویز حکومت سے متعلق رعایا کی غلط فہمی۔

اس وقت عیسائی مذہب کا غلبہ تھا اور پادری بنا کسی ڈر کے دوسرے مذاہب اور مذہبی مقاموں کی تضحیک کرتے تھے۔ مشنری اسکولوں میں کم عمر بچوں سے یہ سوال کیا جاتا تھا کہ تمہارا خدا کون ہے؟ وغیرہ۔

تو جب وہ عیسائی مذہب کے مطابق جواب دیتے تو انہیں انعام و اکرام سے نوازا جاتا تھا۔ اور دیہاتی مکاتب قائم کیے جس کے لیے کالا پادری کو متعین کیا۔ ان مکاتب میں صرف اردو کی تعلیم دی جاتی تھی، لیکن عوام الناس کا خیال تھا کہ ان مکاتب میں پڑھ کر ہمارے بچے اپنے مذہب، اعتقادات، مسائل و احکام اور رسم و رواج وغیرہ سے ناآشنا ہی رہ جائیں گے اور عیسائی مذہب اختیار کرلیں گے نیز لڑکیوں کے اسکول کا اجرا کر کے انگریز حکمراں چاہتے تھے کہ لڑکیاں بے پردہ ہوکر تعلیم حاصل کریں۔ یہ چیز ہندوستانیوں کو پسند نہیں آئی اور جب جیل میں ایک ہی شخص کے ہاتھ کا بنا ہوا کھانا کھانے کی

تجویز ہوئی تو ہندوؤں کو مسئلہ ہوا اور عوام کو لگا کہ اب سب کا مذہب خطرے میں ہے اور جب ۱۸۵۵ء میں پادری ایڈمنڈ نے چٹھیات کا اجرا کیا اس وقت برقی تار سے تمام خبریں ملنے لگی تھیں اور ریلوے سڑک سے ہر جگہ کی آمد و رفت ایک ہوگئی تو ان کا کہنا تھا کہ مذہب بھی ایک ہونا چاہیے اس لیے زیادہ مناسب ہے کہ تم لوگ عیسائی مذہب قبول کر لو۔ مثلاً:

> ''اب وقت آ گیا ہے کہ اس مضمون پر سرگرمی کے ساتھ غور کیا جائے (کذا) کہ سب لوگوں کو ایک ہی مذہب اختیار کرنا چاہیے یا نہیں...... سرسید نے اپنی کتاب میں اس چٹھی کا ترجمہ بھی شامل کر لیا تھا۔'' (رسالہ اسباب بغاوت ہند، ص ۸۵۵-۸۰۳، حیات جاوید ضمیمہ نمبر ۴، ص: ۸۴۷)

لہٰذا اس فرمان کے بعد عوام کے دلوں میں خوف طاری ہو گیا اور انھیں یہ محسوس ہونے لگا کہ اب عیسائی بننا پڑے گا۔ مگر جب جناب معلی القاب نواب لفٹیننٹ گورنر بہادر بنگال کا اشتہار جاری ہوا تو لوگوں کے دلوں کو اطمینان ملا۔ اور جب گورنمنٹ نے مسلمانوں کے مذہبی امور میں مداخلت کی تو یہ بات مسلمانوں کو ناگوار گزری جس کی وجہ سے ہندوؤں کی بنسبت مسلمانوں کا زیادہ تعداد میں بغاوت میں شریک ہونا بنتا تھا اور یہی ہوا بھی۔ یہی وہ غلط فہمیاں تھیں جو رعایا میں عام تھیں اور رفع نہ ہوئیں۔

فصل دوم: ہندوسانی سیاسی نظام اور یہاں کے عوام کے رسم و رواج کے برخلاف اصول و قانون اور سیاسی نظام کا نفاذ۔

انگریزوں کا ایسے قوانین نافذ کرنا جس میں عیسائی مذہب کو قبول کرنے کی ترغیب اور بیوہ عورتوں کو مذہبی رسوم کو ادا کرنا عوام الناس کو ناگوار گزرا۔ عورتوں کی فعل مختاری، ضبطی اراضی کا خراج۔ یہ ہندوستانی حکومت کے لیے مضر تھا یعنی یہ وہ چیز تھی جس کی وجہ سے رعایا ناراض اور گورنمنٹ سے بدخواہ ہوگئی تھی۔ اس زمانے میں باغیوں نے جو اشتہارات عوام کو ہنگامے کے لیے جاری کیے ان میں چیزیں یکساں تھیں یعنی مداخلت مذہبی اور ضبطی معافیات، جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ یہ دونوں باتیں ہندوستانیوں کی ناراضی کا سب سے بڑا سبب تھیں، جن سے مسلمانوں کو زیادہ نقصان پہنچا۔ اور نیلام زمینداری کی بے ترتیبیوں نے ایسا زور پکڑا کہ تمام ملک الٹ پلٹ ہو گیا اور جب ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت نے تمام زمینوں پر ٹیکس لگا دیا تو کاشتکاروں کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کی زراعت میں کمی آ گئی جس کی وجہ سے زمینداروں کی عیش و عشرت مفلسی میں تبدیل ہوگئی اور اودھ کے تعلق دار جو حکمراں بنے ہوئے تھے ان کی شکست بھی بغاوت کا سبب تھی اور پھر اسٹامپ کا جاری کرنا اور رفتہ رفتہ اس کی قیمت میں اضافہ کرنا یہ ہندوستانی مفلس عوام کے لیے مناسب نہیں تھا۔ جو ۱۸۲۹ء کا قانون دہم تھا اور دیوانی عدالت جو پریسیڈنسی بنگال اور آگرہ میں ہے اس کا انتظام پنجاب سے اچھا تھا مگر اس میں بھی اصلاح ضروری تھی کیونکہ اس کے اکثر اصول و ضوابط ہندو اور مسلمان کے مذہبی امور کے مخالف تھے۔

فصل سوم: رعایا کے رسم و رواج، عادات و اطوار، ان کی بدحالی اور مصائب سے حکومت کی ناواقفیت۔

انگریز حکمراں ہندوستانی عوام کے حالات سے واقف نہیں تھے کیونکہ کسی کو جاننے کے لیے ان سے اختلاف و رسم و راہ ضروری ہے اور انگریز حکمراں نہ کبھی ان سے ملے اور نہ کبھی ان کے حالات کا جائزہ لیا اور رعایا کو اپنے برے حالات بتانے کا اختیار نہیں تھا، ہر کوئی ان سے ڈرتا تھا صرف ان کی خوشامد کرتا تھا اور پھر حکومت کی طرف سے رعایا سے حالات

بذریعہ حکام اضلاع کی صورت میں نکلا جونا کافی تھا اور ہندوستان میں خاص کر مسلمانوں میں بے روزگاری بڑھتی گئی اور رعایا نے ایک آنہ، ڈیڑھ آنہ، یومیہ یا سیر بھر اناج پر باغیوں کی نوکری اختیار کر لی۔اس کے بعد انگریزوں نے خیراتی پنشن اور انعام بند کر دیے جس کی وجہ سے رعایا محتاج ہوگئی اور کمپنی لوٹ سے ملک کی مفلسی یعنی قرض اور سود حاصل کرنے کی تدبیر ملک سے ہی ہوتی تھی۔ یہی وہ اسباب تھے جن کی وجہ سے مفلس رعایا عملداری میں ایسی تبدیل چاہتی تھی جو ان کے حق میں بہتر ہو اور جس کے ذریعے ان کی مفلسی دور ہو۔

فصل چہارم: اچھی حکومت کے لیے حاکم اور رعایا میں اچھے روابط جیسے لازمی امور کو ترک کر دینا اور قانون ساز کونسل میں ہندوستانیوں کی عدم شرکت۔

انگریز حکمرانوں نے ہندوستانی عوام کو نہ محبت دی اور نہ ہی ان سے رابطہ رکھا حالانکہ حاکم کو اپنی رعایا سے ربط ضبط رکھنا چاہیے۔ جس کے ذریعے وہ اپنی رعایا کا خیال رکھ سکے لیکن جب گورنمنٹ دوسری قوم یا دوسرے مذہب کی ہو تو اتحاد ممکن نہیں۔ بقول سرسید:

’’......اس سے ثابت ہوتا ہے کہ محبت اور اتحاد اور دوستی ہونے کو اتحاد مذہب اور ہم وطن اور ہم قوم ہونا ضروری ہے۔‘‘

اور جب پال کا خط جس میں یہ نصیحت تھی کہ تم آپس میں ایک دوسرے سے محبت کرو جیسا تم کرو گے ویسا ہی پاؤ گے، لیکن انگریزی حکومت نے ہندوستانی رعایا کے ساتھ محبت کا رشتہ نہیں بنایا، جس کی وجہ سے رعایا حکومت سے دور ہوتی چلی گئی۔ اگر گورنمنٹ رعایا سے محبت و اتحاد کا رشتہ قائم کرتی تو رعایا بھی اس کے تابع ہوتی۔ لہٰذا عوام کا ایسا لگا کہ گورنمنٹ نے ان کو بے عزت، بے وقعت کر دیا ہے۔ گورنمنٹ کو مسلمانوں کی بھلائی سے کوئی سروکار نہیں تھا اور مسلمانوں کی قابلیت ولیاقت کے باوجود اعلیٰ عہدوں پر کوئی نوکری نہیں ملتی تھی یعنی جیسی ترقی وہ چاہتے تھے انہیں نہیں ملی اور سرسید نے پہلے حکمرانوں کے بارے میں بیان کیا ہے جو ہندوستان میں فاتح بن کر آئے اور یہاں کی عوام سے رسم وراہ بنایا جس کی وجہ سے دونوں میں میل جول قائم ہوگیا اور حکمراں کو یہاں کے لوگوں کی مشکلات اور حالات کو سمجھنا آسان ہوگیا لیکن انگریزوں کا معاملہ اس کے برعکس تھا۔

فصل پنجم: فوج میں بدنظمی، بے اطمینانی اور ہندو مسلم اتحاد۔

فوج انگلشیہ کی کمی، مسلمانوں اور ہندوؤں کو مخلوط کر پلٹنوں میں نوکر رکھنا، جس کی وجہ سے ان میں آپس میں بھائی چارگی کا جذبہ قائم رہا۔ سرسید کا کہنا تھا کہ اگر مسلمانوں کی پلٹن اور ہندوؤں کی پلٹن جدا جدا ہوتی تو شاید مسلمانوں کو کارتوس کاتنے میں کوئی عذر نہیں ہوتا۔ ہندوستانی فوج انگریزی فوج کو حقیر سمجھتے تھے انہیں اپنی تلواروں پر غرور تھا۔ ان کا ماننا تھا کہ یہ کامیابیاں ہماری وجہ سے ہیں اور جب ۱۸۵۷ء میں میرٹھ کی فوج پر سرکار کا اعتبار نہ رہا اور اس نے سزائیں دینی شروع کر دیں تو ہندوستانی فوجیوں نے سر اٹھایا اور سوائے پنجاب کے ہر جگہ فساد قائم ہوگیا۔

غرض یہ کہ اگر سترہویں اور اٹھارہویں صدی کے ہندوستان کا جائزہ لیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ برطانوی سرکار کا بنیادی مقصد اعتبار کی توسیع تھا تا کہ وہ ہندوستانی دولت کو لوٹ سکیں۔ انہیں نہ تو یہاں کے امور سے دلچسپی تھی اور نہ ہی

ہندستانی عوام سے کوئی ہمدردی۔ ہندوستانی امور سے لاپروائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں کے عوام کی مالی حالت ہی صرف خراب نہیں ہوئی بلکہ ان کی اخلاقی ،تہذیبی زندگی بھی زوال کا شکار ہوگئی۔

6.4 خلاصہ

سرسید احمد خاں نے رسالہ ''اسباب بغاوت ہند'' مرادآباد میں صدرالصدور کے عہدے پر فائز ہونے کے بعد لکھا۔ یہ سرسید کی سیاسی تصنیف ہے جس کی اشاعت پہلی بار ۱۸۵۸ء میں مفصلیٹ گزٹ آگرہ سے ہوئی۔ یہ انیسویں صدی کی بات ہے جب انگریز ہندوستانی تجارت پر مکمل طور پر قبضہ کر چکے تھے اور سیاسی اعتبار سے بھی مضبوط و مستحکم ہوئے تھے۔ انگریز ابتدائی فتوحات کے بعد ہندوستان پر حکومت کرنے کا خواب دیکھنے لگے اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے انھو ں نے مختلف طریقے اپنائے ،زمینداروں اور رؤسا سے ان کی جاگیریں ضبط کیں اور ان کے ساتھ بدعہدی کا معاملہ کیا، عوام کا استحصال کیا، اور عوامی کاریگروں پر ظلم کرنے لگے اور تعلیمی نظام کے نام پر اختراعات کیں، پرانے رسم و رواج اور نظام کو ختم کر دیا اور مذہبی معاملات میں دخل دینے لگے جس سے ہندوستانی عوام بھڑک اٹھی ،جس کے نتیجے میں ۱۸۵۷ء کا واقعہ رونما ہوا۔

سرسید نے ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں مسلمانوں کی حالت زار کو اپنی آنکھوں سے دیکھا، جس کی وجہ سے ان کا دل زخمی ہو گیا اور ان کو یہ فکر لاحق ہوگئی کہ انگریزوں کے اس خیال اور رویے میں تبدیلی لانے کی سعی کرنی چاہیے۔ سرسید کا خیال تھا کہ اگر صحیح واقعات حکومت کے سامنے پیش کر دیے جائیں اور ان کی توجہ ۱۸۵۷ء کے واقعات رونما ہونے کے اسباب پر مرکوز کی جائے تو یہ قومی خدمت ہوگی۔ اسی کے پیش نظر سرسید نے اسباب بغاوت ہند لکھی۔ سرسید نے اس کتاب کو عموماً ہندوستانی عوام اور خصوصاً مسلمانوں کی حمایت میں لکھا۔ سرسید نے اس کتاب کو پانچ فصلوں میں تقسیم کیا ہے جو درج ذیل ہیں:

(۱) غلط فہمی رعایا (۲) اجرائے ضوابط آئین نامناسب

(۳) ناواقفیت گورنمنٹ حال رعایا (۴) نہ کرنا ان باتوں کا جن کا کرنا گورنمنٹ پر واجب تھا

(۵) بدانتظامی اور بے اہتمامی فوج

ان فصلوں میں ذیلی عنوانات بھی ہیں۔ اس کتاب کے ذریعے سرسید نے انگریز حکمرانوں کو یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ اس بغاوت کے ذمے دار صرف ہندوستانی عوام اور مسلمان ہی نہیں ہیں بلکہ انگریز حکمرانوں کی غلط پالیسی بھی ہے، جس کی وجہ سے ۱۸۵۷ء کی بغاوت رونما ہوئی۔

06.5 آپ نے کیا سیکھا

آپ کو ۱۸۵۷ء کے حالات و واقعات کا علم ہوا۔

آپ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے ذریعہ ہونے والے ظلم و ستم سے واقف ہوئے۔

آپ ۱۸۵۷ء کی ہونے والی شورش اور جنگ آزادی کے اسباب وعلل سے واقف ہوئے۔
آپ ۱۸۵۷ء کے حالات میں سرسید کے اہم رول سے واقف ہوئے۔
آپ کو اسباب بغاوت ہند کی دیگر تفصیلات کا علم ہوا۔

06.6 اپنا امتحان خود لیجیے

1۔ ۱۸۵۷ء کے حالات اور پہلی جنگ آزادی کے ہونے کے کیا اسباب تھے؟

2۔ اسباب بغاوت ہند کتنی فصلوں پر مشتمل ہے؟

3۔ سرسید نے کس وجہ سے اور کب اسباب بغاوت ہند لکھی؟

4۔ سرسید نے بغاوت کا ایک سبب عوام کی طرز معاشرت اور بدحالی کی ناواقفیت قرار دیا ہے۔ اس کی وضاحت کیجیے۔

5۔ سرسید نے اسباب بغاوت ہند کی فصل پنجم میں کس اہم سببِ بغاوت کی طرف اشارہ کیا ہے؟

06.7 اپنے جوابات خود دیجیے

1- نواب سراج الدولہ کی جنگ پلاسی اور میر قاسم وشاہ عالم کو بکسر میں شکست اور ۱۷۹۹ء میں ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی مختلف علاقوں میں پھیلنے لگی۔ اس کمپنی کو یہاں تجارت کی غرض سے بنایا گیا تھا لیکن انگریزوں نے اس کمپنی کے ذریعے یہاں کے سیاسی وسماجی معاملات میں دخل دینا شروع کر دیا اور رفتہ رفتہ اس ملک پر قابض ہو گئے اور ہندوستانی عوام کو ذہنی، نفسیاتی، سماجی تمام اعتبار سے غلام بنانے لگے اور ہندوستانی مزدوروں، کاریگروں پر ظلم جبر اور تشدد کرنے لگے اور انہیں سے ہندوستان کی زرخیز سرزمین پر افیون، ڈرگس وغیرہ کی کھیتی کرانے لگے اور سارا مال وساری دولت انگلستان لے جانے لگے جس کی وجہ سے ہندوستان کے اقتصادی حالات خراب ہو گئے اور ہندوستانی عوام کے دلوں میں انگریزی حکومت کے خلاف بے چینی واضطراب کی کیفیت دن بدن بڑھتی جارہی تھی جو ۱۸۵۷ء میں بغاوت کی شکل میں رونما ہوئی۔

2- سرسید نے اس کتاب کو پانچ فصلوں میں تقسیم کیا ہے جو درج ذیل ہیں:
(۱) غلط فہمی رعایا (۲) اجرائے ضوابط آئین نامناسب
(۳) ناواقفیت گورنمنٹ حال رعایا (۴) نہ کرنا ان باتوں کا جن کا کرنا گورنمنٹ پر واجب تھا
(۵) بدانتظامی اور بے اہتمامی فوج

ان فصلوں میں ذیلی عنوانات بھی ہیں۔ اس کتاب کے ذریعے سرسید نے انگریز حکمرانوں کو یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ اس بغاوت کے ذمے دار صرف ہندوستانی عوام اور مسلمان ہی نہیں ہیں بلکہ انگریز حکمرانوں کی غلط پالیسی بھی ہے، جس کی وجہ سے ۱۸۵۷ء کی بغاوت رونما ہوئی۔

3- ۱۸۵۷ء کی بغاوت رونما ہوئی، لیکن یہ بغاوت ناکام ہوئی اور انگریز حکمرانوں نے ہندوستانی عوام بالخصوص

مسلمانوں پر ظلم ڈھانے لگے۔ جب اشارے وکنایے میں بات کرنے پر موت کی سزا دی جاتی تھی اور مسلمانوں کی زندگی دشوار کردی گئی تھی۔ سرسید احمد خاں نے اس تباہی و بربادی کا جو ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد ہوئی، اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا۔ اس صورت حال سے سرسید غم زدہ ہوگئے اور انہیں ہی فکر لاحق ہوگئی کہ کسی طرح انگریزوں کے اس رویے کو بدلنے کی سعی کرنی چاہیے۔ سرسید نے تحقیق کی اور بغاوت ہند پر لکھی گئی کتابوں کا تفصیلی مطالعہ کیا اور اسی کے پیش نظر اپنی کتاب ''اسباب بغاوت ہند'' لکھی۔ اس کتاب کو سرسید نے مرادآباد میں صدرالصدور کے عہدے پر فائز ہونے کے بعد لکھا تھا۔ یہیں انہیں غدر کے باغیوں کے خلاف قائم کیے گئے کمیشن کا ممبر مقرر کیا گیا تھا اور اسی ممبرشپ کی بنا پر سیکڑوں بے گناہ مسلمانوں کو جھوٹے مقدمے والزامات سے رہائی ملی۔

4- انگریز حکمراں ہندوستانی عوام کے حالات سے واقف نہیں تھے کیونکہ کسی کو جاننے کے لیے ان سے اختلاف ورسم وراہ ضروری ہے اور انگریز حکمراں نہ کبھی ان سے ملے اور نہ کبھی ان کے حالات کا جائزہ لیا اور رعایا کو اپنے برے حالات بتانے کا اختیار نہیں تھا، ہر کوئی ان سے ڈرتا تھا صرف ان کی خوشامد کرتا تھا اور پھر حکومت کی طرف سے رعایا سے حالات بذریعہ حکام اضلاع کی صورت میں نکلا جو ناکافی تھا اور ہندوستان میں خاص کر مسلمانوں میں بے روزگاری بڑھتی گئی اور رعایا نے ایک آنہ، ڈیڑھ آنہ، یومیہ یا سیر بھر اناج پر باغیوں کی نوکری اختیار کرلی۔ اس کے بعد انگریزوں نے خیراتی پنشن اور انعام بند کردیے جس کی وجہ سے رعایا محتاج ہوگئی اور کمپنی لوٹ سے ملک کی مفلسی یعنی قرض اور سود حاصل کرنے کی تدبیر ملک سے ہی ہوتی تھی۔ یہی وہ اسباب تھے جن کی وجہ سے مفلس رعایا عملداری میں ایسی تبدیل چاہتی تھی جو ان کے حق میں بہتر ہو اور جس کے ذریعے ان کی مفلسی دور ہو۔

5- فوج انگلشیہ کی کمی، مسلمانوں اور ہندوؤں کو مخلوط کر پلٹنوں میں نوکر رکھنا، جس کی وجہ سے ان میں آپس میں بھائی چارگی کا جذبہ قائم رہا۔ سرسید کا کہنا تھا کہ اگر مسلمانوں کی پلٹن اور ہندوؤں کی پلٹن جدا جدا ہوتی تو شاید مسلمانوں کو کارتوس کاٹنے میں کوئی عذر نہیں ہوتا۔ ہندوستانی فوج انگریزی فوج کو حقیر سمجھتے تھے انہیں اپنی تلواروں پر غرور تھا۔ ان کا ماننا تھا کہ یہ کامیابیاں ہماری وجہ سے ہیں اور جب ۱۸۵۷ء میں میرٹھ کی فوج پر سرکار کا اعتبار نہ رہا اور اس نے سزائیں دینی شروع کردیں تو ہندوستانی فوجیوں نے سر اٹھایا اور سوائے پنجاب کے ہر جگہ فساد قائم ہوگیا۔

06.8 فرہنگ

اضطراب	بے چینی	خراج	ٹیکس
گزند	نقصان	توسیع	پھیلانا
حالت زار	بری حالت، بحالی	زراعت	کھیتی
مفلسی	غریبی	تجاویز	تجویز کی جمع،

مشورہ، صلاح، رائے

اصلاح	ٹھیک کرنا، درست کرنا	تردید کرنا	رد کرنا، قبول نہ کرنا
اضلاع	ضلع کی جمع	مضر نقصان دہ	نفاذ نافذ ہونا
شکست	ہار	یکساں	ایک جیسی، برابر
اسباب وعلل	وجہیں		

06.9 کتب برائے مطالعہ

1۔ رسالہ اسباب بغاوت ہند، سرسید احمد خاں، مفصلائٹ گزٹ پریس آگرہ، ۱۸۵۹ء

2۔ حیات جاوید، الطاف حسین حالی، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی ۱۹۳۹ء

3۔ سرسید اوران کا عہد، ثریا حسین

4۔ سرسید اوران کے نامور رفقاء، سید عبداللہ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ

5۔ سرسید احمد خاں، محمد علی جوہر/ آفتاب عالم نجمی، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۲۰۲۱ء

اکائی 07 سرسید احمد خاں کی تصنیف ''آثار الصنادید'' کا تنقیدی جائزہ

ساخت

7.1 اغراض ومقاصد

7.2 تمہید

7.3 سرسید احمد خاں کی تصنیف ''آثار الصنادید'' کا تنقیدی جائزہ

7.3.1 سرسید احمد خاں کا سوانحی تعارف اور حالاتِ زندگی

7.3.2 سرسید احمد خاں کی تاریخی وتحقیقی خدمات

7.3.3 سرسید احمد خاں کی تصنیف ''آثار الصنادید'' کا تنقیدی جائزہ

7.4 آپ نے کیا سیکھا

7.5 اپنا امتحان خود لیجیے

7.6 سوالات کے جواب

7.7 فرہنگ

7.8 کتب برائے مطالعہ

7.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ

- o سرسید احمد خاں کے حالاتِ زندگی سے واقف ہوں گے۔
- o سرسید احمد خاں کی قومی وملی خدمات کو جان سکیں گے۔
- o سرسید احمد خاں کی تعلیمی واصلاحی خدمات کو سمجھ سکیں گے۔
- o سرسید احمد خاں کے علمی کارناموں سے روشناس ہوں گے۔
- o سرسید احمد خاں کی تاریخی وتحقیقی خدمات سے متعارف ہونے کا موقع ملے گا۔
- o سرسید احمد خاں کی تصنیف ''آثار الصنادید'' کے مضامین سے واقفیت ہوگی۔

7.2 تمہید

عزیز طلبہ! جیسا کہ آپ کے علم میں ہے کہ سرسید احمد خاں کثیر الجہات اور مجموعہ صفات شخصیت کے حامل تھے۔ وہ نہ صرف ممتاز صحافی، مدبر، مفکر، دانشور اور مصلح قوم تھے بلکہ اُن کی شخصیت کا ایک نمایاں پہلو علم و ادب کی نشر و اشاعت بھی تھا۔ سرسید کو تاریخ نویسی سے گہری دلچسپی تھی۔ اُنھوں نے اپنی ابتدائی تصنیفی خدمات

کے زمانے میں سب سے پہلے تاریخ کے موضوع پر ہی قلم اُٹھایا۔ دیگر علوم کی نسبت تاریخ نویسی ایک مشکل فن ہے، مگر پھر بھی سرسید نے اِس موضوع پر قلم اُٹھایا اور اِس کے ساتھ انصاف کرنے کی کامیاب کوشش کی۔

اُن کے علمی کاموں پر اگر نظر ڈالیں، تو ایک طرف اُن سے منسوب مذہبی کتب و رسائل، جلاء القلوب بذکر المحبوب (1841ء)، قولِ متین در ابطالِ حرکتِ زمین (1848ء)، کلمۃ الحق (1849ء)، تبئین الکلام (1862ء)، خطباتِ احمدیہ (1887ء) اور تفسیر القرآن نظر آئیں گے، تو وہیں دوسری طرف تاریخ کے میدان میں جامِ جم (1840ء)، آثار الصنادید (1847ء)، سلسلۃ الملوک (1852ء)، آئینِ اکبری (1856ء)، تاریخِ سرکشیِ ضلع بجنور (1858ء)، اسبابِ بغاوتِ ہند (1858ء)، تاریخِ فیروز شاہی (1862ء) اور توزک جہانگیری (1863ء) جیسے اُن کے تاریخی کارنامے قابلِ ذکر ہیں۔ یعنی علمی و ادبی نثر کے حوالے سے ایک مؤرخ و محقق کے طور پر بھی سرسید ایک بلند مقام و مرتبہ رکھتے ہیں۔

7.3 سر سید احمد خاں کی تصنیف ''آثار الصنادید'' کا تنقیدی جائزہ

7.3.1 سر سید احمد خاں کا سوانحی تعارف اور حالاتِ زندگی

سرسید 17 / اکتوبر 1817ء کو دہلی کے ایک علمی خانوادے میں پیدا ہوئے۔ قرآنِ کریم پڑھنے کے بعد فارسی و عربی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی، پھر اپنے ماموں نواب زین العابدین خاں سے ریاضی کی درسی کتابیں پڑھیں۔ بعد ازاں حکیم غلام حیدر خاں سے علمِ طب بھی حاصل کیا۔ 1838ء میں سررشتہ داری کے عہدے سے ملازمت کا آغاز کر کے 1841ء میں مَین پوری کی منصفی پر مقرر ہوئے۔ 1898ء تک مختلف علمی و ادبی، قومی و ملی، تہذیبی و معاشرتی، تربیتی و اصلاحی تحریکوں کو انجام دے کر 27/ مارچ 1898ء کو اِس دارِ فانی سے انتقال کر گئے۔

سرسید کے والد سید محمد متقی ایک آزاد طبیعت کے انسان تھے اور ان کا مغل دربار میں کافی رسوخ تھا۔ سرسید کی والدہ نہایت نیک اور رحم دل خاتون تھیں۔ ان میں قدرتی طور پر غیر معمولی قابلیت و صلاحیت موجود تھی۔ سرسید کو اپنی ملازمت سے جو تنخواہ ملتی تھی وہ والدہ کو ہی دے دیتے تھے اور ان کی والدہ گھر کے سارے مصارف خود اٹھاتی تھیں۔ اس سلسلے میں سرسید کا بیان ہے:

> ''میں اپنی کل تنخواہ والدہ کو دے دیتا تھا۔ وہ اس میں سے صرف پانچ روپے مہینہ اوپر کے خرچ کے لیے مجھ کو دے دیتی تھیں۔ باقی میرے تمام اخراجات ان کے ذمے تھے۔ جو کپڑا وہ بنا دیتی تھیں پہن لیتا تھا اور جیسا کھانا وہ کھلا دیتی تھیں کھا لیتا تھا۔''
>
> (حیات جاوید، خواجہ الطاف حسین حالی، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، 1990ء، ص64)

سرسید ملازمت کی غرض سے ابھی بجنور میں ہی تھے کہ غدر 1857ء ہوگیا۔ اُنھوں ے سارے ہنگامے اپنی آنکھوں سے خود دیکھےاور مرادآباد منتقلی کے بعد انھیں ''تاریخِ سرکشیِ ضلع بجنور'' میں قلم بند کیا۔ غدر کی لڑائی اگر چہ مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ملک کے دوسرے بھائیوں نے بھی مل کر لڑی تھی، مگر اِس کا سارا الزام مسلمانوں پر ہی آیا، جس کے صلے میں مسلمانوں پر اور بری طرح ستم ڈھائے گئے۔ ایک تو پہلے سے ہی اِس قوم کی حالت کچھ زیادہ اچھی نہیں تھی اوپر سے غدر ہوجانے کے سبب یہ اور بُری طرح تباح و برباد ہوئی۔ سرسید کا دردمند دل غدر کے اثرات سے بے حد متاثر ہوا۔ بالآخر اُنھوں نے قوم کا بیڑا اُٹھانے کی ذمہ داری اپنے سر لی۔ اُنھوں نے قوم کی تعلیم وتربیت، ترقی وتہذیب اور اصلاحات کی غرض سے انجمنیں قائم کیں، اخبارات جاری کیے، جن کے ذریعے اُنھوں نے ایک نئے طریقے سے اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہنایا۔ بجنور اور مرادآباد میں قوم کی ابتری حالت اُنھوں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مرادآباد میں اُنھوں نے 1859ء میں ایک فارسی مدرسہ قائم کیا۔ 1863ء میں غازی پور تبادلہ ہوجانے کے بعد اُنھیں یہ احساس ہوا کہ ہندوستانیوں کی ترقی کے لیے تعلیمی بدحالی کو دور کرنا اشد ضروری ہے، جس کے لیے انگریزی تعلیم مددگار ہوسکتی ہے، مگر یہاں یہ دشواری تھی کہ سارا جدید علوم انگریزی کی کتابوں میں درج تھا اور نہ صرف مسلمان بلکہ دوسرے ہم وطن بھی انگریزی تعلیم سے خاصے بدگماں تھے۔ سرسید نے اِس دشواری کو دور کرنے کے لیے 1863ء میں غازی پور میں ''سائنٹفک سوسائٹی'' قائم کی، جس کا مقصد مغربی علوم اور انگریزی کی بڑی بڑی کتابوں کو اردو زبان میں ترجمہ کرانا تھا۔ اِس کے علاوہ 1864ء میں غازی پور میں ہی اُنھوں نے ایک مدرسہ بھی قائم کیا، جس میں اردو، فارسی، عربی، سنسکرت کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان کی تعلیم کا بھی انتظام تھا۔ اِسی سال سرسید علی گڑھ آ گئے۔ اُن کے ساتھ سائنٹفک سوسائٹی کا دفتر بھی علی گڑھ منتقل ہوا۔ یہاں اِس سوسائٹی نے 1866ء میں اپنا ایک اخبار ''سائنٹفک گزٹ'' جاری کیا، بعد میں اِس کا نام ''علی گڑھ اِنسٹی ٹیوٹ گزٹ'' ہوگیا۔ اِس اخبار کی خاصیت یہ تھی کہ اِس میں انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں کالم چھپتے تھے۔ حالی لکھتے ہیں:

> ''......اِس اخبار کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس کا ایک کالم انگریزی میں اور ایک اردو میں ہوتا تھا اور بعض مضامین اردو میں الگ اور انگریزی میں الگ چھاپے جاتے تھے؛ اس لیے اُس سے انگریز اور ہندوستانی یکساں فائدہ اُٹھا سکتے تھے۔ اِس کا خاص مقصد گورنمنٹ اور انگریزوں کو ہندوستانیوں کے حالات اور معاملات اور خیالات سے آگاہ کرنا اور ہندوستانیوں کو انگریزی طرزِ حکومت سے آشنا کرنا اور اُن میں پولٹکل خیالات اور قابلیت اور مذاق پیدا کرنا تھا۔''

(حیات جاوید، خواجہ الطاف حسین حالی، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی،
1990ء،ص131)

اِس اخبار میں مسلسل اصلاحات سے متعلق مضامین چھپتے تھے۔ سرسید نے اپنے اصلاحی و تعلیمی مشن کو آگے بڑھاتے ہوئے مسلمانوں میں تعلیم کو فروغ دینے کی غرض سے ولایت کے سفر کا ارادہ کیا۔ تاکہ وہاں کے تعلیمی نظام کا بچشمِ خود مطالعہ کریں اور یہ دیکھ لیں کہ وہاں پڑھائی کا کیا ماحول ہے اور کس طرح تعلیم کو عام کیا جاتا ہے۔ تاکہ ہندوستان واپس آکر ہندوستانیوں میں انہی تدابیر سے تعلیمی مذاق پیدا کر کے تعلیم کے فروغ میں کام کیا جائے۔ حالاں کہ اِس سفر کے لیے سرسید کی مالی حالت بے حد نازک تھی، مگر اُن کا عزم بہت بلند تھا۔ آخر کار یکم اپریل1869ء کو انھوں نے سفر کا آغاز کر دیا۔ ولایت سے واپس آکر سرسید نے مسلمانوں کی اصلاح اور ترقی کی غرض سے 24/دسمبر 1870ء کو رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' جاری کیا۔ پھر اس کے کچھ سال بعد24/مئی1875ء کو علی گڑھ میں ''مدرسۃ العلوم'' کا افتتاح ہوا اور 1/جون سے جماعتوں کی تعلیم بھی شروع ہوگئی۔ سرسید نے اپنے اِس تعلیمی مشن کو اور مستحکم کرنے کے لیے اپنی ملازمت سے بھی استعفیٰ دے دیا اور مستقل طور پر بنارس سے علی گڑھ آ گئے۔ یہاں آکر وہ بہت جلد کالج کی عمارتوں کی تعمیرات میں مصروف ہو گئے۔ 1877ء میں لارڈلٹن وائسرائے و گورنر جنرل کشورِ ہند نے اپنے ہاتھوں سے ''محمڈن اینگلواورینٹل کالج'' کا سنگِ بنیاد اِسٹریچی ہال کے صدر مقام میں رکھا۔ اِس کالج کے قیام میں سرسید نے مختلف اور گوناگوں تدابیر سے چندہ جمع کیا۔ اِس سلسلے میں بہت سی مشکلات بھی پیش آئیں۔ سب سے بڑی پریشانی اخراجاتِ سفر کی تھی۔ سرسید نے چندہ جمع کرنے کے لیے مختلف شہروں اور دور دراز کے مقامات کا سفر کیا، مگر اِن اسفار کے اخراجات وہ اپنے ذاتی مال سے کرتے تھے کالج کے فنڈ سے نہیں۔ حالاں کہ کچھ دوستوں کا اصرار تھا کہ اُن کے سفر کے اخراجات کالج فنڈ کمیٹی کو دینا چاہئیں، مگر یہ اُنھیں ہرگز گوارا نہیں تھا۔ اِس سلسلے میں مولانا حالی نے سرسید کا بیان درج کیا ہے:

''......مَیں اِس بات کو ہرگز گوارا نہیں کر سکتا، مدرسہ چلے یا نہ چلے، مگر مَیں اُسی حالت میں مدرسہ کے لیے سفر کر سکتا ہوں جب سفر کے کل اخراجات اپنے پاس سے اُٹھا سکوں۔''

(حیات جاوید، خواجہ الطاف حسین حالی، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی،
1990ء،ص198)

چندہ وصول کرنے میں سرسید نے کسی طرح کی تفریق کا پاس نہیں رکھا تھا۔ اِس کام میں انھوں نے اپنی ہستی، پہچان اور شخصیت کو پوری طرح فنا کر دیا تھا۔ انھوں نے چندہ کا مطالبہ ہر ایک سے کیا اور اِس بات کا لحاظ بالکل نہیں رکھا کہ چندہ دینے والا شخص کون ہے اور نہ چندے کی نوعیت اُن کے نزدیک معنی رکھتی تھی۔ بلکہ جو بھی مل

جاتا تھا وہ خوشی خوشی قبول کرتے تھے۔ ایک دفع سر سید نے اپنے دوست مولوی سید زین العابدین خاں سے چندے کا مطالبہ کیا۔ مولوی صاحب نے ذرا بدلے ہوئے انداز میں کہا کہ ''صاحب ہم تو چندہ دیتے دیتے تھک گئے''۔ اِس پر سر سید کا جواب کچھ ایسا تھا کہ جس نے مولوی صاحب کو ہلا کر رکھ دیا اور اُنھوں نے چندے کی رقم فی الفور ادا کی۔ سر سید نے جواب دیا کہ ''ارے میاں اب کوئی دن میں ہم مر جائیں گے، پھر کون تم سے چندہ مانگے گا''۔ سر سید نے اپنے متعلقین، دوست واحباب سے اِس قدر چندہ مانگا اور بار بار مانگا کہ جس کے تعلق سے خود انھوں نے اپنے ایک مضمون میں کہا کہ ''......ہماری صورت ہی اب سوال ہوگئی ہے''۔ حالؔی نے لکھا ہے ''سر سید کے دوست دیتے دیتے تھک گئے، مگر وہ مانگتے مانگتے نہ تھکے''۔

سر سید نے کالج کی بلند قامت عمارتوں کے بنوانے میں یہ طریقہ اختیار کیا کہ کالج کی عمارتوں کو متعدد حصوں میں منقسم کر کے اُن کے تخمینہ کا اشتہار دے دیا کہ جو شخص اتنا چندہ دے گا اُس کا نام متعلقہ عمارت پر لکھ دیا جائے گا۔ کالج کے تین دروازوں کے سلسلے میں یہ طے ہوا کہ جو ایک دروازہ بنوائے گا، وہ دروازہ اُسی کے نام سے موسوم ہوگا۔ کالج کو چندہ دینے والوں کے نام چندے کی رقم کے مطابق عمارتوں پر کندہ کیے گئے۔ اِس کی تفریق مولانا حالی نے اِس طرح درج کی ہے:

> ''......مثلاً کالج کے بڑے احاطے کی سنگین جالیوں کے لیے فی جالی بیس روپیہ قرار دیے...... بورڈنگ ہوس کی پختہ بارک کے لیے فی کمرہ پندرہ سو روپیہ مقرر کیا...... اِسٹریچی ہال کی لاگت کے بہت سے حصے کر کے فی حصہ پانسو روپیہ مقرر کیا اور جتنے آدمیوں نے پان پانسو روپیہ دیے اُن سب کے نام اُس میں سنگ مرمر پر کندہ کرا دیے۔''
>
> (حیات جاوید، خواجہ الطاف حسین حالی، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، 1990ء، ص194)

حسبِ وعدہ چندہ دینے والوں کے نام متعلقہ عمارت پر کندہ کیے گئے۔ جنھیں آج بھی ''محمڈن اینگلو اورینٹل کالج'' کے احاطے اور خاص طور پر سر سید ہال ساؤتھ کی عمارتوں پر دیکھا جا سکتا ہے۔ سر سید نے اپنی اِن تمام کوششوں سے ایک بنجر و ویران زمین کو گلزار و آباد کر دیا۔ حالؔی نے لکھا ہے:

> ''......کیوں کہ اِن تمام عمارتوں کا اِس قدر جلد اور ایسی خوبی کے ساتھ تیار کرا دینا اور ایک ویران قطعۂ زمین کو چند سال میں محض قومی چندہ سے گلزار بنا دینا اور سیکڑوں پردیسی طلبہ کی تمام ضروریات اور آسائش اور تعلیم و تربیت اور ہر قسم کی ریاضت کا سامان مہیا کر دینا یہ بھی سر سید کی

زندگی کے اُنھیں بڑے بڑے کاموں میں سے ایک کام ہے، جن کا ذکر
اُن کی لائف میں کرنا ضرور ہے۔''
(حیات جاوید، خواجہ الطاف حسین حالی، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی،
1990ء، ص206)

سرسید نے ایک معینہ رقم دینے والوں کے نام اور اُن کی یادگاریں تو کالج میں قائم کیں، مگر خود، جواب تک اپنا سب کچھ کالج کے فنڈ میں جمع کرا چکے تھے۔ مثلاً اپنی عمر کا مکمل آخری حصہ، اپنا قیمتی وقت، اپنی ملازمت، اپنی ہستی، اپنی پہچان، اپنی عزت، اپنی دولت، اپنا ایمان غرض کہ اُنھوں نے اپنا سب کچھ کالج کو قائم کرنے کے لیے نچھاور کر دیا تھا۔ اُن کا کوئی دوست اگر اُن کی دعوت کرتا تو دعوت کے بدلے نقد روپیہ لے کر کالج فنڈ میں جمع کر دیتے۔ اِس کے علاوہ سید محمود کی شادی کے موقع پر ولیمے کی دعوت نہ کر کے اُس کے عوض خرچ میں آنے والے پانسو روپے اور پوتے سید راس مسعود کی بسم اللہ کی تقریب میں ملے پانسو روپے تک کالج فنڈ میں جمع کر دیے، مگر حیرت انگیز بات ہے کہ اِتنی قربانیاں دینے کے باوجود اُنھوں نے اپنے نام کا ایک پتھر تک اِس کالج میں نہ لگنے دیا۔ یہ واقعی میں اُن کے اعلیٰ ظرف ہونے کی دلیل ہے۔ وہ ذاتی نمود و نمائش سے بالکل بری تھے۔ اُن پر صرف ایک ہی دھن سوار تھی کہ ذاتی غرض کے بغیر قوم کی تعلیم و تربیت کا بندوبست ہو جائے اور اُنھوں نے اپنے ذہن میں یہ بات اچھی طرح محفوظ کر لی تھی کہ زمانہ چاہیں کتنا بھی مخالف ہو جائے، کتنے ہی الزامات لگا لے، جو چاہے وہ کہہ لے، کتنی ہی رکاوٹیں پیش کرے، مگر مجھے اپنے مقصد کو پورا کرنا ہے۔

یہ بات قابلِ غور و قابلِ ذکر ہے کہ سرسید کو بانیٔ درس گاہ ہونے کا فخر حاصل تھا، مگر بقولِ حالیؔ ''...... ہمیشہ اِس بات سے انکار کیا ہے کہ کالج میں اُن کے نام کا کوئی کتبہ یا نشان خصوصیت کے ساتھ قائم کیا جائے''۔ قیامِ کالج کی ابتدا میں ہی سرسید کے دوستوں نے اِس بات پر اصرار کیا تھا کہ کالج کو اُن کے نام سے منسوب کر کے ''مدرسۂ احمدیہ'' موسوم کر دیا جائے۔ سرسید نے اِس کی بالکل اجازت نہ دی اور اِس بات کے سخت مخالف رہے۔ اِسی طرح سرسید نے حاجی محمد اسمٰعیل خاں کے ذریعے کالج کا ایک دروازہ اُن کی یاد میں بنائے جانے کی بھی مخالفت کی۔

آج پوری دنیا میں پھیلے علی گیرینز اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی طلبہ برادری بڑے ہی جوش و خروش سے سرسید ڈے (Founder's day) مناتی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جب خود سرسید کے زمانے میں ایم۔اے۔او۔ کالج کے بعض مغربی آفیسرز نے مغربی کالجوں کی طرز پر Founder's day منانے کی خواہش کا اظہار کیا، تو سرسید اِس کے لیے بالکل راضی نہ ہوئے اور انھوں نے منظوری نہ دے کر کے یہ تجویز پیش کی کہ Founder's day کی جگہ فونڈیشن ڈے (Foundation day)، کالج کے قائم ہونے کا دن خوشی کے ساتھ منایا جانا چاہیے اور

ایسا ہوا بھی۔ سرسید کی تجویز پر عمل ہوا۔ مولانا حالؔی کی اطلاع کے مطابق Foundation day کی رسم کئی سال تک ادا کی گئی۔ Founder's day منانے کی اجازت نہ دینے کے پیچھے سرسید کی یہ مصلحت پوشیدہ تھی، اُن کا کہنا تھا کہ:

> ''...... ہمارے ملک کی حالت انگلستان کی حالت سے بالکل جداگانہ ہے۔ وہاں ایک ایک شخص لاکھوں کروڑوں روپیہ اپنے پاس سے دے کر کالج قائم کر دیتا ہے اور یہاں سوا اِس کے کہ ہزاروں لاکھوں آدمیوں سے چندہ جمع کر کے کالج قائم کیا جائے اور کوئی صورت ممکن نہیں۔ پس کوئی وجہ نہیں کہ جو کالج قوم کے روپے سے قائم ہو اُس کے کسی خاص بانی کے نام پر ایسی رسم ادا کی جائے، اِس لیے میرے نزدیک بجائے فونڈرز ڈے کے فونڈیشن ڈے (یعنی کالج کی سالگرہ کا دن) مقرر ہونا چاہیے۔''
>
> (حیات جاوید، خواجہ الطاف حسین حالی، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، 1990ء، ص211-212)

یعنی سرسید کی حیات میں ہی فونڈرز ڈے (Sir Syed Day) کی جگہ فونڈیشن ڈے منایا جانے لگا تھا۔ اگر ہم ایم.اے.او.کالج (خصوصاً موجودہ سرسید ہال ساؤتھ) کے احاطے کی قدیم زمانے سے قائم عمارتوں و دروازوں کو دیکھیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اِن میں سے کوئی بھی سرسید کے نام سے موسوم نہیں ہے۔ کالج کا غربی دروازہ ''باب الرحمتہ'' ہے، جنوبی وصدر دروازہ ''وکٹوریہ گیٹ'' (1885ء) ہے، شمالی دروازہ ''بابِ اسحاق'' ہے، اِسٹریچی ہال کے شرق میں واقع دروازہ جارج ہنری لارنس (سابق کلکٹر علی گڑھ) کے نام سے موسوم ہے اور غربی دروازہ خلیفہ سید محمد حسن کی یادگار ہے۔ کالج احاطے کی باؤنڈری کے جنوب وغرب میں واقع دروازہ ''ظہور گیٹ'' (1876ء) ہے، جو مرادآباد کے رئیس سید ظہور حسین کے مخصوص مالی تعاون کی وجہ سے اُن کے نام سے موسوم ہے اور اِسی طرح شرق میں واقع دروازہ ''فیض گیٹ'' (1876ء) ہے، جو پہاسو کے رئیس خان بہادر نواب سر محمد فیض علی (K.C.S.I.) کے خصوصی مالی تعاون سے تیار ہو کر خود اُن کے نام سے موسوم ہے۔ کالج کی عمارتوں کے سلسلے میں سرسید نے ''مجلس خزنۃ البضاعۃ لتاسیس، مدرستہ العلوم'' کے اجلاس منعقدہ 12/نومبر 1875ء بمقام علی گڑھ میں کمیٹی کے سکریٹری کے طور پر جو تجویزات پیش کی تھیں، اُن میں مسجد اہل سنت و جماعت، مسجد شیعہ امامیہ، چاہ، مدرسے کے دروازے، بڑا ہال، بڑے ہال کی دونوں جانب غربی و شرقی دروازے کالج کے ایک چوک سے دوسرے چوک میں جانے کے، کتب خانہ، میوزیم، بڑا کمرہ کھانا کھانے کا، پارک، گھنٹہ گھر، کرکٹ کے میدان میں

بارہ دری وغیرہ وغیرہ کی تعمیر کی تجاویز پیش کی تھیں۔

(روئداد نمبر 23، اجلاس مجلس خزنۃ البضاعۃ لتاسیس، مدرستہ العلوم للمسلمین منعقدہ بارہویں نومبر سنہ 1875ء مقام علی گڑھ، ص2،3 ''کالج فنڈ کمیٹی'')

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ جس طرح سرسید نے اپنے زمانے میں اپنے نام کی شہرت سے منع کر کے ذاتی نمود و نمائش سے انکار کیا ٹھیک اُسی کے الٹ اُن کے چمن کے پھولوں نے کالج کی اہم عمارات کو اُن کے نام سے منسوب کر کے اُن کی یادوں کو ہمیشہ کے لیے زندہ کر لیا۔ یہ سب کچھ سرسید کی اُسی عاجزی وانکساری کے صلے میں اُن کو ملا، جس کا اظہار وہ اپنے تعلیمی واصلاحی مشن کے درمیان کرتے آئے تھے، مگر پھر بھی اِس تفصیل کے بعد اعتراف کرتے ہوئے ہمیں یہ کہنا پڑتا ہے:

''حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا''

7.3.2 سرسید احمد خاں کی تاریخی وتحقیقی خدمات

سرسید نے اپنی عمر کے تقریباً ابتدائی بیس بائیس سال شاہ جہان آباد اور لال قلعے کی قدیم تاریخی عمارتوں کے سایہ میں گذارے۔ اُن کے والد سید محمد متقی کا مغل دربار میں کافی رسوخ تھا۔ آخری مغل تاجدار ابوالمظفر سراج الدین بہادر شاہ ظفرؔ سے اُن کے ذاتی مراسم تھے۔ اپنے والد کی قلعۂ معلیٰ میں آمدورفت کی وجہ سے سرسید کا بھی اُن کے ساتھ آنا جانا رہا اور یہی وہ وقت تھا کہ جب سرسید نے لال قلعے کی تاریخی عمارتوں کو بے حد قریب سے دیکھا۔ 1846ء میں وہ دہلی کے منصف بھی ہوئے۔ ایک لمبے عرصے تک دلّی سے وابستگی کی وجہ سے وہاں کی عمارتوں سے دلچسپی پیدا ہونا لازمی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب سرسید نے قلم وقرطاس کی دنیا میں قدم رکھا، تو اُن کی علمی طبیعت نے تاریخ نویسی کے میدان ہی کو اپنا پسندیدہ موضوع بنایا اور انھوں نے دلّی کی تاریخی عمارتوں کے حالات لکھ کر کتابی شکل میں شائع کیے۔

اپنی تالیف ''جامِ جم'' میں سرسید نے فارسی زبان میں امیر تیمور سے لے کر آخری مغل بادشاہ تک تینتالیس (43) حکمرانوں کے مختصر حالات ایک جدول کی شکل میں جمع کیے ہیں۔ اِس کتاب میں مغلوں کے علاوہ دیگر بادشاہوں کے حالات بھی لکھے گئے ہیں۔ ''جامِ جم'' کی تالیف کے بعد سرسید نے خاص شہر شاہ جہان آباد کے علاوہ بیرونِ شہر دہلی کی قدیم عمارتوں کی تحقیقات کر کے دوسرے حکمراں خاندانوں کے حالات جمع کرنا شروع کیے اور سخت محنت وجاں فشانی کے بعد ''آثارالصنادید'' جیسی نادر ونایاب کتاب رقم کر کے شائع کی۔ آثارِ قدیمہ سے متعلق یہ کتاب، سرسید کی علمی زندگی کا ایک اہم تاریخی وتحقیقی کارنامہ تسلیم کی جاتی ہے۔

سرسید، ''آثارالصنادید'' کے دوسرے ایڈیشن کو جس وقت ترتیب دے رہے تھے۔ اُس وقت اُنھیں پچھلے حکمرانوں کے سلسلۂ حکومت مرتب نہ ہونے کی وجہ سے بڑی دشواری پیش آئی تھی۔ اِس سلسلے میں اُنھوں نے

دہلی کے پانچ ہزار سال پرانے راجاؤں اور بادشاہوں کی ایک فہرست تیار کی تھی۔ یہ فہرست راجہ یدھشٹر سے شروع ہوکر ملکۂ معظّمہ قیصرِ ہند تک 202 راجاؤں و بادشاہوں کے مختصر تحقیقی حالات پر مشتمل تھی۔فہرست مرتب ہوجانے کے بعد اُس کی اہمیت وافادیت کوملحوظ رکھتے ہوئے سرسید کوخیال ہوا کہ اِسے الگ سے کتابی شکل میں تیار ہونا چاہیے۔لہٰذا 1852ء میں اُنھوں نے اپنے اِس تحقیقی کام کو''سلسلتہ الملوک'' کے نام سے بہ اہتمام خواجہ علی حسن، مطبع شرف المطابع، دہلی سے شائع کرادیا۔کتاب کے دیباچے میں اس کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے سر سید لکھتے ہیں:

''......اِس سبب سے مَیں نے خیال کیا کہ اگر وہ فہرست بطریق اسلوب مرتب ہوجاوے اور ایک کتاب بن جاوے تو نہایت مفید ہوگی اور یہ مختصر کتاب وہ فائدہ دے گی، جو بڑی بڑی کتابوں سے بھی حاصل نہ ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے میرے اِس ارادے کو پورا کیا اور رفتہ رفتہ وہ فہرست ایک کتاب بن گئی اور''سلسلتہ الملوک''اُس کا نام رکھا۔''

(دیباچہ از سرسید احمد خاں مشمولہ''سلسلتہ الملوک''، سرسید احمد خاں، شرف المطابع، دہلی، 1852ء، ص 3)

''سلسلتہ الملوک'' کی اشاعت کے بعد سرسید کا تاریخی و تحقیقی شعور مکمل طور پر پختہ ہو چکا تھا اور اگر دیکھا جائے تو اُن کی کاوشوں سے وجود میں آئیں اس عہد کی بیشتر تصانیف و تالیفات کا تعلق تاریخ نویسی سے ہی ہے۔یعنی تاریخ کا موضوع سرسید کی قلمی زندگی کا خاص میدان بن گیا تھا۔یہی وجہ ہے کہ اُن کے اِسی تاریخی ذوق کو دیکھتے ہوئے اہلِ علم حضرات نے اُن سے تاریخی کتب پر تصحیح و تحقیقی کام کرانے کی خواہش کا اظہار کیا۔اِس سلسلے میں''آئینِ اکبری''اور''تاریخِ فیروز شاہی'' کا نام لیا جاسکتا ہے۔''آئینِ اکبری'' کی تصحیح کی فرمائش حاجی قطب الدین دلّی کے ایک تاجر نے سرسید سے اُس وقت کی کہ جب وہ دلّی میں منصف تھے۔اُنھوں نے ابوالفضل کی اس ضخیم تالیف کی ترتیب بڑی ہی محنت و جاں فشانی اور توجہ وانہماک سے دیتے ہوئے کتاب کی تصحیح و تدوین کو مکمل کیا۔''آئینِ اکبری'' کا یہ ایڈیشن مطبع اسمٰعیلی، دہلی سے 1856ء میں شائع ہوا۔مولانا حالؔی اِس کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''آئینِ اکبری اول تو زبان اور طرزِ بیان کے لحاظ سے ایک نئی طرح کی کتاب تھی۔دوسرے جس قسم کے مضامین اُس میں بیان کیے گئے ہیں، فارسی لٹریچر میں کبھی اُس قسم کے مضامین بیان نہیں ہوئے تھے۔اِس لیے اُس کے پڑھنے سے جی الجھتا تھا۔ پھر آئینِ اکبری کے نسخے

کاتبوں کے سہو و خطا سے اکثر مسخ ہو گئے تھے، اِس لیے اس کا صحیح کرنا سخت دشوار تھا۔''

(حیات جاوید، خواجہ الطاف حسین حالی، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، 1990ء،ص72)

کسی بھی کتاب کی تصحیح کرنا کوئی آسان کام نہیں اور اگر یہ کتاب تاریخ کے موضوع سے تعلق رکھتی ہو تو یہ کام اور بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ اِس کے لیے کافی محنت درکار ہوتی ہے،مگر سرسید کے تاریخی شعور نے اُن میں یہ جرآت پیدا کر دی تھی کہ اُنھوں نے ''آئینِ اکبری'' اور ''تاریخِ فیروز شاہی'' جیسی ضخیم و معتبر کتابوں کی تصحیح و تدوین کا کام انجام دیا۔ ''تاریخِ فیروز شاہی''، ضیاالدین برنی کی تالیف کردہ کتاب ہے۔ اِس کتاب کو اپنے مواد کی بنا پر کافی اہمیت حاصل ہے۔ اِس کا آغاز سلطان غیاث الدین بلبن سے ہو کر سلطان فیروز شاہ تغلق تک آٹھ بادشاہوں کے حالات پر ختم ہوتا ہے۔ اِس طرح یہ کتاب ''طبقاتِ ناصری'' (مؤلفہ قاضی منہاج سراج)، کی اگلی کڑی کہی جا سکتی ہے، کیوں کہ ''طبقاتِ ناصری'' میں سلطان ناصر الدین محمود (دوم) پسر سلطان شمس الدین التمش کے عہد تک کے حالات رقم کیے گئے ہیں اور ناصر الدین محمود کے بعد غیاث الدین بلبن کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ خود سرسید نے بھی لکھا ہے کہ ''......حقیقت میں یہ کتاب تتمہ ہے طبقاتِ ناصری کا اور ان دونوں کتابوں کو ملا کر ایک کتاب سمجھنا چاہئیں''۔ رایل ایشیا ٹک سوسائٹی آف بنگال کے سکریٹری نے سرسید سے ''تاریخِ فیروز شاہی'' کو مرتب کرنے کی درخواست کی۔ سرسید نے سوسائٹی کی درخواست قبول کی اور کتاب کی تصحیح و تدوین کا کام انجام دیا۔ سرسید کی تصحیح کردہ یہ کتاب 1862ء میں ایشیا ٹک سوسائٹی آف بنگال کی جانب سے شائع کی گئی۔ کتاب کی تصحیح کے ضمن میں سرسید نے اس کے دیباچے میں لکھا ہے:

''تاریخِ فیروز شاہی، ضیاء برنی بہت کمیاب کتاب ہے۔ بہت تلاش اور تجسس سے مجھ کو ایک نسخہ بہم پہنچا تھا۔ اس کے مقابلے اور صحت میں مجھ کو بہت دقت اُٹھانی پڑی۔ ایک ناقص نسخہ کتب خانۂ شاہ دہلی سے مجھے میسر ہوا تھا اور ایک نسخہ جو مسٹر ایلیٹ صاحب بہادر نے بہم پہنچایا تھا، وہ مَیں نے لیا اور ایک نسخہ ایڈورڈ طامس صاحب بہادر کے پاس تھا، وہ بھی مَیں نے لیا اور ایک نسخہ بنارس سے ہاتھ آیا، اِن چاروں نسخوں سے مَیں نے اپنی کتاب کا مقابلہ کیا اور جہاں تک ممکن تھا، اس کے صحیح کرنے پر کوشش کی، اب ہماری ایشیا ٹک سوسائٹی نے اس نایاب اور عمدہ کتاب کا چھاپنا چاہا اور میری کتاب اور میری صحت اور مقابلہ سے یہ

کتاب چھپی۔"

(دیباچہ از سرسید مشمولہ" تاریخِ فیروز شاہی"، تصحیح کردہ سرسید احمد خاں،
ضیاء الدین برنی، سرسید اکیڈمی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ،
2005ء، ص10-9)

یہ دیباچہ کتاب سے الگ سائنٹفک سوسائٹی کے اخبار کی پہلی جلد میں شائع ہوا تھا (دیکھیے 24 اگست 1866ء، ص346، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ)۔ سرسید نے اِس دیباچے میں ضیاء الدین برنی کا حال لکھنے کے علاوہ اِس کتاب سے پہلے مسلم بادشاہوں کی فتوحات سے متعلق اور اُن کے حالات میں لکھی جانے والی کتب اور اِس کتاب کی تالیف کے بعد فیروز شاہ تغلق سے متعلق لکھی گئی کتب کا حال درج کیا ہے۔

تاریخ و تحقیق کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے سرسید نے 1863ء میں نور الدین جہانگیر بادشاہ کے عہد سے متعلق کتاب "تو زکِ جہانگیری" کی بھی تصحیح و تدوین کی۔ یہ کتاب اُن کے ذاتی پریس، علی گڑھ سے چھپ کر 1864ء میں منظرِ عام پر آئی۔ اولاً اِس کتاب کو سرسید کے بڑے بھائی سید محمد نے مختلف قلمی نسخوں کی مدد سے تیار کر کے اپنے مطبع سید الاخبار، دہلی سے 1843ء میں شائع کیا تھا، بعد ازاں سرسید نے اس کی درستگی کی اور پھر اسے چھپوایا۔ کتاب کا دیباچہ، کتاب سے الگ 1863ء میں ہی غازی پور سے چھپ گیا تھا۔ "تو زکِ جہانگیری" میں جہانگیر نے اپنے حالاتِ زندگی کے علاوہ حکومتی نظام کے طور طریقوں سے متعلق اظہارِ خیال کیا ہے۔

مذکورہ بالا سطور میں پیش کی گئیں کتابوں کا تعلق خاص تاریخ کے موضوع سے ہے، مگر سرسید کے قلم سے دو ایسی کتابیں بھی وجود میں آئیں کہ جو اُس عہد کی صورتِ حال اور سماجی و معاشرتی ابتری کے پیش نظر رقم کی گئی تھیں۔ یہ کتابیں ہمارے لیے آج غدر 1857ء کی آئینہ دار ہیں اور ایک تاریخی مواد کی حیثیت رکھتی ہیں۔ راقم الحروف کی مراد "تاریخِ سرکشیِ ضلع بجنور" اور "اسبابِ بغاوتِ ہند" سے ہے۔

غدر 1857ء کے دوران ملازمت کے سلسلے میں سرسید کا قیام بجنور میں تھا۔ اُنھوں نے سارے ہنگامے بذات خود دیکھے تھے۔ مراد آباد منتقلی کے بعد سرسید نے اِنھیں "تاریخِ سرکشیِ ضلع بجنور" میں قلم بند کیا۔ یہ کتاب 1858ء میں موفوسی لائٹ (Mofussilite) پریس، آگرہ سے شائع ہوئی۔ سرسید نے غدر کے دوران وقوع پذیر ہونے والے تمام حالات و حادثات کو محسوس کیا اور ان کے اسباب و علل تلاش کر کے "اسبابِ بغاوتِ ہند" جیسی تاریخی کتاب رقم کی۔ یہ کتاب 1858ء میں طبع ہو کر منظرِ عام پر آئی۔

سرسید کی مذکورہ بالا سبھی تصانیف و تالیفات پر اگر سرسری نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ تاریخ کے موضوع پر لکھنا اور تحقیق کرنا اُن کا خاص مشغلہ تھا۔ وہ ذاتی طور پر اِس موضوع سے بے حد متاثر تھے۔

سرسید کی مذکورہ بالا تالیفات کے موضوع اور اُن کی ضخامت کو ایک طرف رکھیں اور دوسری طرف اُن کی

ملازمت اور دوسرے تحریری کاموں کو دیکھیں، تو یقیناً اِس بات کا احساس ہوگا کہ لکھنا پڑھنا اُن کا خاص مشغلہ تھا اور وہ بنیادی طور پر ایک مؤرخ تھے۔ تاریخی مواد پر تحقیقی کام کرنا اُن کا دلچسپ موضوع تھا اور یہی وہ موضوع تھا کہ جس کے ایک نسخے سے متاثر ہوکر رایل ایشیاٹک سوسائٹی (لندن) نے 1864ء میں اُن کو سوسائٹی کا آنریری ممبر مقرر کیا۔ سرسید کو یہ عظمت و بلندی اور اعلیٰ مرتبہ اپنے اُسی تاریخی و تحقیقی ذوق کی بدولت ملا کہ جو اُن کی علمی شخصیت کا جزو لاینفک تھا اور جس کے بغیر اُن کی قلمی زندگی کا تصور و خیال ممکن نہیں۔

7.3.3 سرسید احمد خاں کی تصنیف ''آثارالصنادید'' کا تنقیدی جائزہ

سرسید جب دہلی میں منصف تھے، تب انھیں دہلی اور اس کے آس پاس کی تاریخی عمارتوں کی تحقیقات کا خیال ہوا۔ ان کا ارادہ ان عمارات کے حالات جمع کر کے انھیں شائع کرانے کا تھا۔ لہٰذا انھوں نے عمارتوں کی تحقیقات شروع کی اور اکثر چھٹیوں میں بیرون شہر دہلی عمارتوں کی دریافت کے لیے جانے لگے۔ اس سلسلے میں کبھی کبھی وہ رات کو باہر ہی قیام کرتے۔ سرسید کو اس کام میں ان کے دوست مولانا امام بخش صہبائی کی ہمنوائی حاصل رہتی۔

اِس کتاب کی تالیف کے وقت عمارتوں کی تحقیقات کرنا بڑا ہی دشوار گزار عمل تھا، کیوں کہ ان پرانی عمارتوں میں بعض عمارتیں تو پوری طرح منہدم ہوگئی تھیں اور بعض کے کتبے پڑھنا، ان کتبوں تک رسائی کرنا، پھر ان عمارتوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا نہایت مشکل کام تھا۔ پھر بھی سرسید نے ہر ایک عمارت کی پیائش کی۔ ان کی صورتِ حال لکھی اور نہ صرف مصور سے ان عمارات کے نقشے کھنچوائے بلکہ ان کے کتبوں کو بھی اصل خط میں ظاہر کیا۔ ان باتوں سے سرسید کے تحقیقی شعور اور ان کی محنت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ انھیں ان عمارات کی تحقیقات اور ان کے حالات رقم کرنے میں کن کن مراحل سے گذرنا پڑا۔ اس کا احساس ہمیں مولانا حالی کے ان جملوں سے بخوبی ہوتا ہے:

> ''......بیسیوں عمارتیں ٹوٹ پھوٹ کر کھنڈر ہوگئی تھیں۔ اکثر عمارتوں کے نام تک پڑھے نہ جاتے تھے۔ بہت سے کتبوں سے ضروری حالات معلوم نہ ہوسکتے تھے۔ اکثر کتبے ایسے خطوں میں تھے، جن سے کوئی واقف نہ تھا۔ بعض قدیم عمارتوں کے ضروری حصے معدوم ہوگئے تھے اور جو متفرق و پراگندہ اجزا باقی رہ گئے تھے، ان سے کچھ پتا نہ چلتا تھا کہ یہ عمارت کیوں بنائی گئی تھی اور اس سے کیا مقصود تھا، کتبوں میں جن بانیوں کے نام لکھے تھے ان کا مفصل حال دریافت کرنے کے لیے تاریخوں کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت تھی...... ہر ٹوٹی پھوٹی

عمارت کا نقشہ جوں کا توں مصور سے کھنچوانا اوراس طرح کچھ اوپر سوا سو
عمارتوں کی تحقیقات سے عہدہ برآ ہونا فی الحقیقت نہایت دشوار کام
تھا۔''
(حیات جاوید، خواجہ الطاف حسین حالی، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی،
1990ء،ص65)

عمارتوں کی تحقیقات میں جاں فشانی کے ساتھ ساتھ سرسید نے ہمت وحوصلے سے بھی کام لیا۔بعض عمارتوں کے کتبے بلندی پر نصب ہونے کی وجہ سے سرسید بلیوں اور چھینکوں کے سہارے ان کتبوں تک پہنچتے اور پھر اُنھیں نقل کرتے۔ وہ جب تک اوپر اس کام میں مشغول رہتے، اُن کے دوست مولانا صہبائی نیچے کھڑے اُن کی محبت میں بے چین و بے قرار رہتے تھے۔ سرسید کے اس عمل سے اُن کے محققانہ انداز کے ساتھ ساتھ اُن کے تاریخی ذوق کا بھی بلکہ آثار قدیمہ سے اُن کی دلچسپی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔قطب مینار کے بعض کتبے، جو کافی بلندی پر تھے،جنھیں آسانی سے پڑھا نہیں جا سکتا تھا،ان کے ضمن میں سرسید کا بیان ہے:

''قطب صاحب کی لاٹھ کے بعض کتبے جو زیادہ بلند ہونے کے سبب
پڑھے نہ جاسکتے تھے،ان کے پڑھنے کو ایک چھینکا دو بلیوں کے بیچ میں ہر
ایک کتبے کے محاذی بندھوالیا جاتا تھا اور میں خود اوپر چڑھ کر اور چھینکے
میں بیٹھ کر ہر کتبے کا چربا اتارتا تھا،جس وقت میں چھینکے میں بیٹھتا تھا،تو
مولانا صہبائی فرط محبت کے سبب بہت گھبراتے تھے اور خوف کے مارے
ان کا رنگ متغیر ہوجاتا تھا۔''
(حیات جاوید، خواجہ الطاف حسین حالی، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی،
1990ء،ص65-66)

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اِس طرح کی تحقیق، جو سرسید نے تاریخی عمارتوں کی معلومات حاصل کرنے، اُن کے بارے میں جاننے اور اُن کے کتبے پڑھنے کے دوران کی، پہلی بار ہمارے سامنے آتی ہے۔ بلیوں کے سہارے بندھے چھینکے میں بیٹھ کر کتبوں کا مطالعہ کرنا واقعی میں اپنی جان کو خود اپنے ہی آپ خطرے میں ڈالنے کے جیسا ہے۔ حالؔی نے لکھا ہے''......ایسے مفید اور دشوار کاموں میں اُن کا جی بہت لگتا تھا''۔ بہرحال سرسید نے اپنی جان خطرے میں ضرور ڈالی مگر اس کا انھیں صلہ بھی خوب ملا۔اُن کے کام کو سراہا گیا اور ایسا سراہا گیا کہ اس کی شہرت کی گونج ولایت میں سنائی دی۔ سرسید کا یہ کام اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک انوکھا و منفرد کام تھا۔

مولانا حالی کی اطلاع کے مطابق ان تمام تحقیقی مشکلات ودشواریوں کے باوجود سرسید نے صرف ڈیڑھ

سال کے عرصے میں سبھی عمارتوں کے حالات جمع کر لیے تھے۔''آثار الصنادید'' کا پہلا ایڈیشن چار ابواب کے ساتھ 660 صفحات پر مشتمل مطبع سید الاخبار، دہلی سے بہ اہتمام سید عبدالغفور 1847ء میں شائع ہوا۔ اس کتاب کی تالیف کے سلسلے میں سرسید نے لکھا ہے:

> ''مدت دراز سے یہ اندیشہ دامن گیر تھا کہ اگر فلک ناتواں بیں کے پنجے سے کچھ مہلت ہاتھ آئے تو ایک نسخہ عجیب آسمان پیر کی اعانت سے لکھا جائے کہ عمارات سواد حضرات شاہ جہاں آباد اور مکانات درون شہر اور قلعہ مبارک کا حال اور ساکنین شہر کا احوال اس میں مندرج ہو۔''
>
> (دیباچہ از سرسید احمد خاں، مشمولہ ''آثار الصنادید'' (پہلا ایڈیشن)، سرسید احمد خاں، مطبع سید الاخبار دہلی، 1847ء، ص 6)

''آثار الصنادید'' کے چاروں ابواب کی ترتیب و تفصیل اس طرح ہے کہ پہلے باب میں بیرون شہر دہلی کی تقریباً 130 عمارتوں کا حال بیان کیا گیا ہے۔ ان عمارتوں کا تعلق ہندو اور مسلمان دونوں سے ہے۔ ان میں قلعہ تغلق آباد، مقبرہ غیاث الدین تغلق، عمارت ہزار ستون، مندر کالکا، مورت مندر، درگاہ روشن چراغ دلّی، مقبرہ سلطان بہلول لودی، مقبرہ ہمایوں، درگاہ حضرت نظام الدین، چونسٹھ کھمبا، لال محل، پرانا قلعہ، مسجد قوۃ الاسلام، مقبرہ سلطان شمس الدین التمش، مقبرہ سلطان علاء الدین خلجی، مقبرہ سلطان غیاث الدین بلبن، درگاہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اور قلعہ رائے پتھورا وغیرہ شامل ہیں۔ ان میں سے صرف چند کو چھوڑ کر باقی سبھی عمارتوں کے کتبے و نقشے کتاب میں دیے گئے ہیں۔

''آثار الصنادید'' کا دوسرا باب لال قلعہ اور اس کی 32 عمارتوں کے تحقیقی حالات سے متعلق ہے۔ اس میں ان عمارتوں کا حال مع کتبے و نقشے کے رقم کیا گیا ہے۔

کتاب کے تیسرے باب میں 70 حویلیوں، بازاروں، باولیوں، کنوؤں اور ان مساجد و منادر کا بیان درج کیا گیا ہے کہ جن کا تعلق خاص شہر شاہجہان آباد سے ہے۔

چوتھے باب میں ابتداً ان شہروں، قلعوں اور محلوں کا بیان درج ہے کہ جو سمت 404 بکرمی اور اس کے بعد کے دور سے متعلق ہیں۔ پھر دہلی کی آب و ہوا اور اردو زبان کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ آخر میں شہر دہلی کے تقریباً ایکسو بیس (120) ان مشاہیر و نامور حضرات کا تذکرہ کیا گیا ہے کہ جن کا تعلق سرسید یا سرسید سے کچھ پہلے کے زمانے سے ہے۔ ان شخصیات میں مشائخ، علماء، فقرا، مجاذیب، اطبا، شعرا، خوش نویس، مصور اور موسیقار شامل ہیں۔

''آثار الصنادید'' کے مطالعے سے یقیناً ہمیں یہ احساس ہوتا ہے کہ سرسید نے اپنی تحقیقی بصیرت سے

استفادہ کرتے ہوئے قلم کے ذریعے دہلی کی قدیم تاریخی عمارتوں کے ایسے نقشے قرطاس پر اتار دیے ہیں کہ ان عمارتوں کی عظمت و بلندی اور شان و شوکت نظروں کے سامنے گھوم جاتی ہے۔ بلا تکلف سرسید کا یہ کام قابل تعریف و قابل ستائش ہے۔ کیوں کہ آج کے دہلی کو جب آپ دیکھیں گے، تو ''آثار الصنادید'' میں ذکر ہوئی بیشتر عمارتوں کو اس سرزمین سے ناپید پائیں گے۔ سرسید کی کاوشوں سے ''آثار الصنادید'' میں الفاظ و نقشوں کی شکل میں ہی سہی کم سے کم یہ عمارتیں ہمارے سامنے موجود تو ہیں، اگر سرسید یہ کام انجام نہ دیتے تو دنیائے علم و ادب میں بھی ان عمارتوں کا نام و نشان نہ ہوتا۔ ''آثار الصنادید'' کے آخری باب کے تعلق سے مولانا حالی نے لکھا ہے:

''......تعجب ہوتا ہے کہ جس شہر میں پچاس ساٹھ برس پہلے قوم کے اس قدر اہل اللہ، اہل علم اور اہل ہنر موجود تھے آج وہاں چاروں طرف سناٹا نظر آتا ہے۔''

(حیات جاوید، خواجہ الطاف حسین حالی، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، 1990ء، ص 67)

''آثار الصنادید'' کے پہلے ایڈیشن کی اشاعت کے بعد شاہ جہان آباد کے کلکٹر و مجسٹریٹ رابرٹس ولایت جاتے وقت اس کا ایک نسخہ اپنے ساتھ لے گئے اور وہاں رایل ایشیاٹک سوسائٹی کے سامنے یہ نسخہ پیش کیا۔ سوسائٹی کے ممبرز نے اس کتاب کو بہت پسند کیا اور بعض ممبروں نے تو اس کا ترجمہ انگریزی زبان میں کرانے کی خواہش ظاہر کی۔ ولایت سے واپس آنے پر جناب رابرٹس نے سرسید کی شرکت سے ''آثار الصنادید'' کا انگریزی میں ترجمہ کرنا شروع کیا۔ سرسید نے اس موقع کو مناسب جانا کہ ''آثار الصنادید'' کو از سر نو مرتب کیا جائے۔ لہٰذا انھوں نے کتاب میں ترامیم و اضافے کیے، جو کمیاں پہلے ایڈیشن میں رہ گئی تھیں، ان کو یہاں دوسرے ایڈیشن کی ترتیب کے وقت پورا کیا گیا اور زبان بھی پہلے ایڈیشن کے مقابلے میں نہایت ہی سادہ اور سلجھی ہوئی استعمال کی گئی، جبکہ پہلے ایڈیشن کی عبارت میں رنگینی و مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا تھا۔ دوسرے ایڈیشن میں اس طرح کے قدیم طرزِ بیان سے گریز کیا گیا۔ اس ایڈیشن کے لیے سرسید نے نقشے بھی دوبارہ تیار کرائے۔ افسوس یہ نقشے چھپنے سے پہلے ہی غدر میں ضائع ہو گئے۔ مولانا حالی کی اطلاع کے مطابق اس ایڈیشن کے تمام نسخے بھی غدر میں تلف ہو گئے۔ ''آثار الصنادید'' کا دوسرا ایڈیشن 1854ء میں چھپ کر منظر عام پر آیا۔ پہلے ایڈیشن کے چوتھے باب کو طبع ثانی سے باہر رکھا گیا، یعنی اس ایڈیشن کے تین باب مطبع احمدی، دہلی اور دیباچہ و سرورق مطبع سلطانی واقع قلعہ معلیٰ، دہلی سے شائع ہوئے۔ پہلے ایڈیشن میں کی گئی اصلاح کے تعلق سے دوسرے ایڈیشن کے دیباچے میں سرسید لکھتے ہیں:

''......اس وقت یہ بات خیال میں آئی کہ اگر از سر نو یہ کتاب بہت اچھی

> طرح سے مرتب کی جائے اور جو خرابیاں کہ پہلی کتاب میں ہو گئی ہیں، وہ سب درست کی جائیں تو بہت اچھی بات ہے۔ الحمد للہ کہ خدائے تعالیٰ نے اس آرزو کو پورا کیا اور جس طرح کہ دل چاہتا تھا، اسی طرح پر یہ کتاب پوری ہوئی۔ پہلی کتاب سے یہ کتاب بہت باتوں میں اچھی ہے۔''
>
> (دیباچہ از سرسید احمد خاں، مشمولہ ''آثار الصنادید'' (دوسرا ایڈیشن)، سرسید احمد خاں، مطبع سلطانی، قلعہ معلیٰ دہلی، 1854ء، ص 3-4)

جناب رابرٹس نے ''آثار الصنادید'' کا جو ترجمہ شروع کیا تھا، وہ دہلی سے ان کی منتقلی وجہ سے پورا نہ ہو سکا۔ فرانسیسی مستشرق گارساں دتاسی نے 1861ء میں ''آثار الصنادید'' کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا اور اس ترجمے کی ایک کاپی سرسید کو بھی بھیجی۔ اس ترجمے سے متاثر ہو کر رایل ایشیا ٹک سوسائٹی (لندن) نے سرسید کو سوسائٹی کا آنریری ممبر مقرر کیا۔ یہاں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سرسید کو یہ عظمت و بلندی اور یہ اعلیٰ مرتبہ اپنے اسی تاریخی وتحقیقی کام کی بدولت ملا، کہ جسے انھوں نے بڑی ہی جاں فشانی، محنت ولگن اور پوری ایمانداری و دیانت داری کے ساتھ انجام دیا۔

7.4 آپ نے کیا سیکھا

- آپ سرسید احمد خاں کے حالاتِ زندگی سے واقف ہوئے۔
- آپ سرسید احمد خاں کی قومی وملی خدمات سے واقف ہوئے۔
- آپ سرسید احمد خاں کی تعلیمی واصلاحی خدمات سے متعارف ہوئے۔
- آپ سرسید احمد خاں کے علمی کارناموں سے روشناس ہوئے۔
- آپ سرسید احمد خاں کی تاریخی وتحقیقی خدمات سے متعارف ہوئے۔
- آپ سرسید احمد خاں کی تصنیف ''آثار الصنادید'' کے مضامین سے واقف ہوئے۔

7.5 اپنا امتحان خود لیجیے

1۔ سرسید احمد خاں کی پیدائش اور ان کی اہم تصانیف وتالیفات پر مختصراً روشنی ڈالیے۔

2۔ سائنٹفک سوسائٹی کا قیام کب اور کہاں عمل میں آیا، اظہارِ خیال کیجیے۔

3۔ مدرسۃ العلوم کے افتتاح پر مختصراً روشنی ڈالیے۔

4۔ ایم۔اے۔او۔کالج کی عمارات کا مختصراً تعارف کرائیے۔

5۔ آثار الصنادید کی اشاعت پر اظہارِ خیال کیجیے۔

6۔ آثار الصنادید کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالیے۔

7.6 سوالات کے جواب

1۔ سرسید 17 /اکتوبر 1817ء کو دہلی کے ایک علمی خانوادے میں پیدا ہوئے۔ قرآنِ کریم پڑھنے کے بعد فارسی وعربی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی، پھر اپنے ماموں نواب زین العابدین خاں سے ریاضی کی درسی کتابیں پڑھیں۔ بعدازاں حکیم غلام حیدر خاں سے علمِ طب بھی حاصل کیا۔ 1838ء میں سررشتہ داری کے عہدے سے ملازمت کا آغاز کرکے 1841ء میں مَین پوری کی منصفی پر مقرر ہوئے۔ سنہ 1898ء تک مختلف علمی و ادبی، قومی وملی، تہذیبی ومعاشرتی، تربیتی واصلاحی تحریکوں کو انجام دے کر 27/مارچ 1898ء کو اِس دارِ فانی سے انتقال کیا۔

سرسید احمد خاں کے علمی کاموں پر اگر نظر ڈالیں، تو ایک طرف اُن سے منسوب مذہبی کتب ورسائل، جلاء القلوب بذکر المحبوب (1841ء)، قولِ متین در ابطالِ حرکتِ زمین (1848ء)، کلمۃ الحق (1849ء)، تبئین الکلام (1862ء)، خطباتِ احمدیہ (1887ء) اور تفسیر القرآن نظر آئیں گے، تو وہیں دوسری طرف تاریخ کے میدان میں جامِ جم (1840ء)، آثار الصنادید (1847ء)، سلسلۃ الملوک (1852ء)، آئینِ اکبری (1856ء)، تاریخِ سرکشیِ ضلع بجنور (1858ء)، اسبابِ بغاوتِ ہند (1858ء)، تاریخِ فیروز شاہی (1862ء) اور توزکِ جہانگیری (1863ء) جیسے اُن کے تاریخی کارنامے قابلِ ذکر ہیں۔

2۔ 1863ء میں غازی پور تبادلہ ہوجانے کے بعد سرسید احمد خاں کو یہ احساس ہوا کہ ہندوستانیوں کی ترقی کے لیے تعلیمی بدحالی کو دور کرنا اشد ضروری ہے اور جس کے لیے انگریزی تعلیم مددگار ہوسکتی ہے، مگر دشواری یہ تھی کہ سارا جدید علوم انگریزی کی کتابوں میں درج تھا اور نہ صرف مسلمان بلکہ دوسرے ہم وطن بھی انگریزی تعلیم سے خاصے بدگماں تھے۔ سرسید نے اِس دشواری کو دور کرنے کے لیے 1863ء میں غازی پور میں ''سائنٹفک سوسائٹی'' قائم کی، جس کا مقصد مغربی علوم وانگریزی کی بڑی بڑی کتابوں کو اردو زبان میں ترجمہ کرنا تھا۔ 1864ء میں سرسید علی گڑھ آگئے، اُن کے ساتھ سائنٹفک سوسائٹی کا دفتر بھی علی گڑھ منتقل ہوا۔ یہاں اِس سوسائٹی نے 1866ء میں اپنا ایک اخبار ''سائنٹفک گزٹ'' جاری کیا، بعد میں اِس کا نام ''علی گڑھ اِنسٹی ٹیوٹ گزٹ'' ہوگیا۔ اِس اخبار کی خاصیت یہ تھی کہ اِس میں انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں کالم چھپتے تھے۔

3۔ 24/مئی 1875ء کو علی گڑھ میں ''مدرسۃ العلوم'' کا افتتاح ہوا اور 1/جون سے جماعتوں کی تعلیم کا آغاز ہوا۔ سرسید نے اپنے تعلیمی مشن کو اور بھی مستحکم کرنے کے لیے اپنی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور مستقل طور

پر بنارس سے علی گڑھ آ گئے۔ یہاں آ کر وہ بہت جلد کالج کی عمارتوں کی تعمیرات میں مصروف ہو گئے اور بالآخر 1877ء میں لارڈلٹن وائسرائے و گورنر جنرل کشورِ ہند نے اپنے ہاتھوں سے ''محمڈن اینگلواورینٹل کالج'' کا سنگِ بنیاد اِسٹر یچی ہال کے صدر مقام میں رکھا۔

4۔ ایم.اے.او. کالج (خصوصاً موجودہ سر سید ہال ساؤتھ) کے احاطے کی قدیم زمانے سے قائم عمارتوں و دروازوں کو دیکھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ کالج کا غربی دروازہ ''باب الرحمتہ'' ہے، جنوبی و صدر دروازہ ''وکٹوریہ گیٹ'' (1885ء) ہے، شمالی دروازہ ''بابِ اسحاق'' ہے، اِسٹر یچی ہال کے شرق میں واقع دروازہ جارج ہنری لارنس (سابق کلکٹر علی گڑھ) کے نام سے موسوم ہے اور غربی دروازہ خلیفہ سید محمد حسن کی یادگار ہے۔ کالج احاطے کی باؤنڈری کے جنوب و غرب میں واقع دروازہ ''ظہور گیٹ'' (1876ء) ہے، جو مرادآباد کے رئیس سید ظہور حسین کے مخصوص مالی تعاون کی وجہ سے اُن کے نام سے موسوم ہے اور اِسی طرح شرق میں واقع دروازہ ''فیض گیٹ'' (1876ء) ہے، جو پہاسو کے رئیس خان بہادر نواب سر محمد فیض علی (K.C.S.I.) کے خصوصی مالی تعاون سے تیار ہو کر خود اُن کے نام سے موسوم ہے۔ کالج کی عمارتوں کے سلسلے میں سر سید نے ''مجلس خزنتہ البضاعتہ لتاسیس، مدرستہ العلوم'' کے اجلاس منعقدہ 12/نومبر 1875ء بمقام علی گڑھ میں کمیٹی کے سکریٹری کے طور پر جو تجویزات پیش کی تھیں، اُن میں مسجد اہل سنت و جماعت، مسجد شیعہ امامیہ، چاہ، مدرسے کے دروازے، بڑا ہال، بڑے ہال کی دونوں جانب غربی و شرقی دروازے کالج کے ایک چوک سے دوسرے چوک میں جانے کے، کتب خانہ، میوزیم، بڑا کمرہ کھانا کھانے کا، پارک، گھنٹہ گھر، کرکٹ کے میدان میں بارہ دری وغیرہ وغیرہ کی تعمیر کی تجاویز پیش کی تھیں۔

5۔ ''جامِ جم'' کی تالیف کے بعد سر سید نے خاص شہر شاہ جہان آباد کے علاوہ بیرونِ شہر دہلی کی قدیم عمارتوں کی تحقیقات کر کے دوسرے حکمراں خاندانوں کے حالات جمع کرنا شروع کیے اور سخت محنت و جاں فشانی کے بعد ''آثارالصنادید'' جیسی نادر و نایاب کتاب رقم کر کے شائع کی۔ آثارِ قدیمہ سے متعلق یہ کتاب، سر سید کی علمی زندگی کا ایک اہم تاریخی و تحقیقی کارنامہ تسلیم کی جاتی ہے۔ اِس کتاب کی تالیف کے وقت عمارتوں کی تحقیقات کرنا بڑا ہی دشوار گزار عمل تھا، کیوں کہ ان پرانی عمارتوں میں بعض عمارتیں پوری طرح منہدم ہوگئی تھیں۔ بعض کے کتبے پڑھنا، ان کتبوں تک رسائی کرنا، پھر ان عمارتوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا نہایت مشکل کام تھا۔ پھر بھی سر سید نے ہر ایک عمارت کی پیمائش کی۔ ان کی صورتِ حال لکھی اور نہ صرف مصور سے ان عمارات کے نقشے کھنچوائے بلکہ ان کے کتبوں کو بھی اصل خط میں ظاہر کیا۔ مولانا حالی کی اطلاع کے مطابق ان تمام تحقیقی مشکلات و دشواریوں کے باوجود سر سید نے صرف ڈیڑھ سال کے عرصے میں سبھی عمارتوں کے حالات جمع کر لیے تھے۔ ''آثارالصنادید'' کا پہلا ایڈیشن چار ابواب کے ساتھ 660 صفحات

پر مشتمل مطبع سید الاخبار، دہلی سے بہ اہتمام سید عبد الغفور 1847ء میں شائع ہوا۔

6۔ ’’آثار الصنادید‘‘ کے مطالعے سے یقیناً ہمیں یہ احساس ہوتا ہے کہ سرسید نے اپنی تحقیقی بصیرت سے استفادہ کرتے ہوئے قلم کے ذریعے دہلی کی قدیم تاریخی عمارتوں کے ایسے نقشے قرطاس پر اتار دیے ہیں کہ ان عمارتوں کی عظمت و بلندی اور شان و شوکت نظروں کے سامنے گھوم جاتی ہے۔ بلا تکلف سرسید کا یہ کام قابل تعریف و قابل ستائش ہے۔ کیوں کہ آج کے دہلی کو جب آپ دیکھیں گے، تو ’’آثار الصنادید‘‘ میں ذکر ہوئی بیشتر عمارتوں کو اس سرزمین سے ناپید پائیں گے۔ سرسید کی کاوشوں سے ’’آثار الصنادید‘‘ میں الفاظ و نقشوں کی شکل میں ہی سہی کم سے کم یہ عمارتیں ہمارے سامنے موجود تو ہیں، اگر سرسید یہ کام انجام نہ دیتے تو دنیائے علم و ادب میں بھی ان عمارتوں کا نام و نشان نہ ہوتا۔

7.7 فرہنگ

رسائی	پہنچ	منتقل	ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے والا
افتتاح	ابتدا، آغاز	گوناگوں	طرح طرح کا، مختلف
فروغ	ترقی	فی الفور	فوراً، جلدی سے
تاریخ نویس	تاریخ لکھنے والا، مؤرخ	تخمینہ	Estimate
قدیم	پرانا، پرانے زمانے کا	بنجر	ویرانہ، جنگل
گلزار	باغ، چمن	اصرار	ضد
طرز	انداز، طریقہ	تجویز	رائے، تدبیر
مصلحت	بہتری	منقسم	بانٹا ہوا
پوشیدہ	نہاں، چھپا ہوا	منسوب	متعلق، وابستہ
احاطہ	چار دیواری	نمود و نمائش	تشہیر
آمدورفت	آنا جانا، رسم و راہ	قرطاس	کاغذ
منہدم	برباد، گرا ہوا	پیمائش	ناپ، چھان بین
ملحوظ	جس کا خیال رکھا جائے	کاوش	کوشش، تلاش

تالیف	ترتیب، تدوین	تصحیح	درستی، صحیح کرنا				

قلمی	ہاتھ کا لکھا ہوا	قیام	سکونت
مصارف	اخراجات	کتبہ	تختی
آثارِ قدیمہ	پرانی عمارتیں	نوعیت	خصوصیت، خوبی
ولایت	انگلستان	مستشرق	وہ فرنگی جو مشرقی زبانوں اور علوم کا ماہر ہو
مشاہیر	بزرگ اور نامور لوگ	استفادہ	فائدہ اٹھانا
ناپید	غائب، نظروں سے اوجھل	تلف	ضائع، تباہ
بصیرت	سمجھ، فہم	مبالغہ	بڑھا چڑھا کر بیان کرنا
مطبع	چھاپہ خانہ، پریس	دیانت داری	سچائی، صداقت

7.8 کتب برائے مطالعہ

آثارالصنادید، سید احمد خاں، منشی نول کشور، لکھنؤ، 1895ء

آثارالصنادید (دوسرا ایڈیشن)، سرسید احمد خاں، سرسید اکیڈمی اے ایم یو، علی گڑھ، 2007ء

تاریخِ فیروز شاہی، تصحیح کردہ سرسید احمد خاں، ضیاء الدین برنی، سرسید اکیڈمی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، 2005ء

حیات جاوید، خواجہ الطاف حسین حالی، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، 1990ء

سرسید احمد خاں اور اُن کا عہد، ثریا حسین، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1993ء

سرسید: بازیافت، عتیق احمد صدیقی، سرسید اکاڈمی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، 1990ء

سرسید کی نثری خدمات، ڈاکٹر مشتاق احمد، ایجوکیشنل پبلی شنگ ہاؤس، دہلی، 2005ء

سید احمد خاں، خلیق احمد نظامی، ترجمہ اصغر عباس، پبلی کیشنز ڈویژن، وزارتِ اطلاعات ونشریات، حکومتِ ہند، جون 1994ء

علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، سائنٹفک سوسائٹی، علی گڑھ

اِکائی 8 سرسید احمد خاں کی تصنیف ''خطبات احمدیہ'' کا تنقیدی و تحقیقی مطالعہ

ساخت

8.1 اغراض ومقاصد

8.2 تمہید

8.3 سرسید احمد خاں کی سن پیدائش

8.3.1 سرسید احمد خاں کا سوانحی خاکہ

8.3.2 خطبات احمدیہ کا تعارف

8.3.3 خطبات احمدیہ کا تفصیلی مطالعہ اور سرسید احمد خاں کے جوابات

8.4 آپ نے کیا سیکھا؟

8.5 اپنا امتحان خود لیجیے

8.6 سوالات کے جواب

8.7 فرہنگ

8.8 کتب برائے مطالعہ

8.1 اغراض ومقاصد:

اِس اکائی میں ....

☆ سرسید احمد خاں کی سن پیدائش سے واقفیت ہوگی

☆ سرسید احمد خاں کا مختصر سوانحی تعارف اور اُن کی قومی قیادت کا علم ہوگا

☆ خطبات احمدیہ کا تعارف پڑھ سکیں گے

☆ خطبات احمدیہ میں سرسید احمد خاں کے تفصیلی جوابات کا مطالعہ کریں گے

اِکائی 8.2 تمہید:

سرسید احمد خاں نے ہندوستان میں تعلیم کو نئی شکل اور اردو نثر کو نئی صورت عطا کی۔ جدید تعلیم کے محرک اور جدید اردو نثر کے بانی سرسید احمد خاں نے صرف طرز تحریر ہی نہیں بلکہ ہندوستانیوں کے طرز احساس کو بھی بدلا انہوں نے سائنسی، معروضی اور منطقی طرز فکر کو فروغ دیا، عقلیت کی بنیادیں مضبوط کیں، اُن کی تحریک نے شعرا اور نثر نگاروں کی بڑی تعداد کو متاثر کیا۔ انہوں نے اپنی نثر میں سادگی اور معروضیت کو قایم کیا۔

اُن کے رفقا نے بھی اِس طرز کو اختیار کیا خواجہ الطاف حسین حالی، علامہ شبلی، مولوی نذیر احمد، ذکا اللہ سبھی نے تحریک علی گڑھ سے روشنی حاصل کی اور اردو زبان و ادب کو فکر و نظر کے نئے زاویے عطا کیے۔ سرسید کا شمار ہندوستان کے عظیم ریفارمرز میں ہوتا ہے۔

8.3 سرسید احمد خاں کی سن پیدائش:

احمد خاں متقی بن محمد متقی (المعروف سرسید احمد خاں) 17 / اکتوبر 1817 دورِ مغلیہ سلطنت دہلی میں پیدا ہوئے اور 27 / مارچ 1898 دورِ برٹیش راج علی گڑھ میں 80 برس کی عمر میں وفات پائی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (علی گڑھ) کی جامع مسجد کے احاطے میں مدفون ہیں۔ وہ انیسویں صدی کے ہندوستانی مسلم نظریۂ عملیت کے حامل، مصلح اور فلسفی تھے۔ اُن کو برصغیر میں مسلمانوں کی قیادت اور دو قومی نظریہ کا خالق تصور کیا جاتا ہے۔ موصوف نے مختلف رسائل کی اشاعت کے علاوہ کئی درجن کتابیں اور سینکڑوں مضامین لکھے، چار کتابیں ترجمہ کیں، چار کتب کی تصحیح و تدوین کا کام کیا۔ سرسید کی وفات کے بعد اُن کے مختلف مضامین کے مجموعے دیگر لوگوں نے کتابی شکل میں شائع کروائے۔ اُن کی کتابوں کے ترجمے اُن کی زندگی میں ہی فرانسیسی، انگریزی، فارسی اور اردو میں شائع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ سرسید احمد خاں کے مکتوبات کے مجموعے بھی منظر عام پر آ چکے ہیں۔

8.3.4 خطبات احمدیہ کا تعارف:

''خطبات احمدیہ'' سرسید احمد خاں کی تصنیفی خدمات کا نہ صرف اہم حصہ ہے بلکہ اپنے موضوع اور جامعیت کے اعتبار سے بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ سرسید احمد خاں نے یہ کتاب سر ولیم میور کی چار ضخیم جلدوں پر مشتمل تصنیف لائف آف محمدؐ (1861) کے جواب میں تحریر کیا تھا۔ عصبیت زدہ عیسائی تاریخ داں سر ولیم میور نے اپنی مذکورہ تصنیف میں اسلام سے متعلق اور محمدؐ کے حالات زندگی کو تخریبی و تعصبی انداز میں پیش کیا تھا۔ بعد ازاں سرسید احمد خاں نے مذکورہ کتاب کا مدلل و منطقی جواب لکھنے کے لیے انگلینڈ کا سفر کیا اور غیر معمولی واذیت رساں تکالیف برداشت کیں اور ایک اہم و جامع کتاب 'خطبات احمدیہ' لکھی جس میں انہوں نے نہایت جامع، مدلل اور علمی و تحقیقی انداز میں انگریز مؤرخ کی لاعلمی اور مذہبی بددیانتی کا عمدہ جواب دیا ہے۔

سر ولیم میور (Sir. William Muir) نے مذکورہ کتاب ہندوستان کے مشہور عیسائی پادری فنڈر (Fander) کی فرمائش پر لکھی تھی پادری فنڈر خود بھی اسلام اور محمدؐ پر نکتہ چینی کرنے میں پہلے سے مشہور تھا۔ سر ولیم میور نے محمدؐ کی سوانح اور اسلام سے متعلق کتاب چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن انگلستان میں 1861 دوسرا 1876 اور تیسرا 1894 میں شائع ہوا۔ 1912 میں اس کا revised adition جو 1923 میں John Grant Edinburgh کے زیر اہتمام شائع کیا گیا۔ اس کتاب کا جواب سرسید احمد خاں نے

دینا شروع کیا اور پہلے حصہ کا جواب 'خطبات الاحمدیہ علی العرب والسیرۃ' کے نام سے شائع ہوا۔

انہوں نے مذکورہ کتاب میں سر ولیم میور کے ساتھ دیگر عیسائی مؤرخین کا ذکر کرتے ہوئے اہم موضوع پر جامع و مدلل بحث کی ہے اور پختہ دلائل سے ثابت کیا ہے کہ اسلام اپنے عقائد کسی پر جبراً وقہراً عائد نہیں کرتا۔

8.3.3 خطبات احمدیہ کا تفصیلی مطالعہ اور سر سید احمد خاں کے جوابات:

1870 میں ''خطبات احمدیہ'' کی اشاعت کے بعد نہ صرف یورپ بالخصوص برطانیہ میں اسلام، محمدؐ اور مسلمانوں کے بارے میں بہت سے ابہام وغلط فہمیاں نہ صرف رفع ہوئیں بلکہ یورپین عوام کے لیے اسلام کا فلسفہ سمجھنے میں مدد ملی اور مسلمانوں میں بھی اس کتاب کی اشاعت نے خوشی کی لہر پیدا کی جو مسلمان جدید تعلیم اور انگریز حکومت کی ملازمت ترک کر رہے تھے، وہ جدید تعلیم اور اپنی ملازمتوں کی طرف لوٹنا شروع ہو گئے

'خطبات احمدیہ' کے بارہ مقالات ومضامین کا موضوعاتی تجزیے سے معلوم ہوتا ہے کہ اوّل خطبہ جو سب سے بڑا اور اپنے آپ میں ایک ضخیم دستاویز ہے؛ میں عرب کا نہایت مفصل، تاریخی، جغرافیائی اور مسلمانوں کے بعض مسلمات کو ثابت کرتا ہے جن کی سر ولیم میور نے تردید کی تھی تا کہ آئندہ خطبات میں یہ فیصلہ بہ آسانی کیا جا سکے کہ جبل فاران جس کا نام توریت کی ایک آیت میں آیا ہے اور جس سے محمدؐ اور اُن کی نبوت کی بشارتیں ثابت کی جاتی ہیں۔ اہل اسلام کے مطابق جبال عرب میں سے ہے یا بقول سر ولیم میور کے جبال شام میں سے ہے؟ یا یہ کہ فی الواقع حضرت اسماعیلؑ اور اُن کے بیٹے عرب کے مختلف حصوں میں جیسا کہ اہل اسلام کہتے ہیں؛ آباد ہوئے یا سر ولیم میور کے کہ آباد نہیں ہوئے یا محمدؐ کا حضرت اسماعیلؑ کی اولاد میں ہونا ثابت ہے یا بقول سر ولیم میور کے ثابت نہیں ہے۔؟

اس خطبہ میں سر سید احمد خاں نے توریت کے حوالوں اور عیسائی محققین کی شہادتوں سے اپنے ہر دعوے پر سر ولیم میور اور دیگر انگریز مصنفین کے برعکس استدلال کیا ہے۔

دوسرے خطبہ میں عرب جاہلیت کے رسم ورواج، عادات، خیالات اور صحیح یا غلط عقائد کا بیان ملتا ہے۔ یہاں تک کہ شعرا اور دیگر معتبر ذرائع سے حاصل کیے گئے بیانات بھی درج کیے ہیں حتیٰ کہ وہ باتیں جنہیں اشعار سے منتخب کیا ہے۔ اُن کے ساتھ وہ اشعار یا مصرعے بھی نقل کر دیے ہیں جن سے اُن باتوں کا سراغ بہ آسانی مل جائے اور لوگ اندازہ لگا سکیں کہ اسلام سے پہلے عرب کی کیا حالت تھی۔

سر سید احمد خاں نے تیسرے خطبے میں اُن مختلف ادیان کا تفصیل سے ذکر کیا ہے جو اسلام سے پہلے عرب میں موجود تھے اور اِس بات کا بھی بیان موجود ہے کہ اسلام اُن سبھی ادیان میں کون سے دین سے زیادہ قریب اور مشابہت رکھتا ہے۔ مذکورہ خطبہ میں بتایا گیا ہے کہ اہل عرب اسلام سے پہلے چار فرقوں میں تقسیم تھے یعنی 'بت پرست'، 'خدا پرست'، 'لا مذہب'، اور 'معتقدین مذہب الہامی' اِن میں سے پہلے کے تین فرقوں کا ذکر کرنے کے بعد

عرب کے الہامی مذہب کی تفصیل لکھی ہے۔(۱) مذہب صائبین (۲) مذہب ابراہیم اور دوسرے انبیائے عرب یعنی ہود، صالح، اسماعیل اور شعیب علیہم السلام کا (۳) مذہب یہود (۴) مذہب عیسوی۔

چوتھے خطبہ میں اِس بات کا صریح و تسلی بخش جواب ملتا ہے کہ اسلام نہ صرف انسان کے حق میں ایک رحمت ہے بلکہ اِس سے موسوم عیسائی مذہب کو بھی بڑے فائدے حاصل ہوئے ہیں۔

سر سید احمد خاں نے اِس مضمون کو چار حصوں پر تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے میں اُن فوائد کا ذکر کیا ہے جو عمومی طور پر اسلام سے انسانی معاشرت کی تشکیل کے لیے مفید اور کار آمد ثابت ہوئے۔ اِس کی دلیل کے لیے سر سید احمد خاں نے اُن معروف انگریز مصنفین کے اقوال نقل کیے ہیں جنھوں نے اسلام کی حمایت اور اُس کے نفع بخش ہونے کی گواہی دی تھی۔ اِس باب کے دوسرے حصے میں ایسے کئی انگریز مصنفین کی آرا کی تردید کی گئی ہے جنھوں نے اسلام کو نوع انسان کی معاشرت کے حق میں غیر مفید قرار دیا تھا۔ اِس میں بھی یورپ کے بہت سے نامور محققین کی شہادتوں سے نہ صرف استدلال کیا ہے بلکہ معاشرت کے لحاظ سے اسلام کا مقابلہ عیسائی مذہب کے ساتھ کیا ہے۔

تیسرا حصہ اُن فوائد کے بیان پر مشتمل ہے جو یہودی اور عیسائی دونوں مذاہب کو اسلام کی وجہ سے حاصل ہوئے کیوں کہ اسلام سے پہلے یہود اور عیسائی اکثر پیغمبروں اور بے داغ لوگوں سے بداخلاقی اور قابل شرم الزامات منسوب کرتے تھے حالاں کہ اِس قسم کی تحریروں کا الہامی احکامات سے کوئی تعلق نہ تھا لیکن یہودی اور عیسائی ایسی تمام تحریروں کو حکم ربی اور اُن انبیا اور نیک سیرت لوگوں کو ان افعال قبیحہ کا مرتکب تصور کرتے تھے یعنی یہ اُن آیتوں کی طرف اشارہ ہے جن میں حضرت لوطؑ، حضرت داؤدؑ وغیرہ کو زنا اور دیگر قابل شرم کاموں سے منسوب کیا گیا ہے لیکن اسلام نے نہ صرف اُن بے داغ و معصوم انبیا اور خدا پرست اشخاص اور مطہر بزرگوں کو بہتان سے پاک کیا جو یہودیوں اور عیسائیوں نے اُن پر عائد کیے تھے بلکہ اُن بزرگوں کے معصوم اور بے گناہ ہونے کا دنیا کے بیشتر حصے کو یقین دلایا حالاں کہ علمائے حق نے اسلام کے اِس مسئلہ پر یقین توریت کا بہت گہرائی سے مطالعہ کیا تھا اور یہ ثابت کیا تھا کہ سب پیغمبر مطہر و معصوم ہیں۔ عیسائیوں اور یہودیوں کی ہر غلطی و گمراہی کو جگ ظاہر کر دیا تھا جن کی وجہ سے وہ لادین ہوئے تھے۔ اگر اسلام نہ ہوتا تو اِن پیغمبروں، نبیوں اور خدا کے مقرب بندوں یعنی حضرت ابراہیمؑ، حضرت لوطؑ اور اُن کے بیٹوں حضرت اسحٰقؑ، یہوداؑ، حضرت یعقوبؑ کی بیویوں اور بیٹوں حضرت ہارونؑ، حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کی دنیا میں کوئی وقعت نہ ہوتی بلکہ اِسی طرح مٹی خراب ہوتی جس طرح ایک بدفعل انسان کی ہوتی ہے۔ وہ مذکورہ تمام روحیں دنیا کی نظر میں اسی طرح حقیر و ذلیل ہوتیں جس طرح اِس قسم کے جرائم کے مرتکب مجرموں کی ہوتی ہے۔

اِسی خطبے کے حصہ چہارم میں سر سید احمد خاں نے اُن فوائد کی طرف اشارہ کیا ہے جو اسلام کی وجہ سے

عیسائی مذہب کو پہنچے ہیں یعنی اسلام نے عیسائیوں کو پوپ کے بے انتہا اور ناجائز اختیارات دیے تھے۔عیسائی قوم پوپ کو معصوم اور حضرت عیسیٰؑ کا مکمل اور بہ اختیار نائب سمجھتی تھی۔اُن کا یقین تھا کہ جہنم اور بہشت کے دروازے کھولنے کا پورا پورا اِختیار پوپ کو ہے نیز گنہگاروں کے گناہوں کو بخش دینے کا بھی پورا دعویٰ رکھتا ہے اور پوپ کو یہ بھی اختیار تھا کہ وہ جسے چاہے جائز اور جسے چاہے ناجائز قرار دے بلکہ اپنے بے جا اختیار کے لحاظ سے (جو اُسے حاصل تھے) جن کو وہ بروئے کار لا کر کسی طرح حضرت عیسیٰؑ سے کم نہیں سمجھتا تھا بلکہ اس کے قدم اِس سے بھی آگے بڑھے ہوئے تھے۔

قرآن نے عیسائیوں کی اِس گمراہی سے خبردار کیا جو پوپ کی وجہ سے پوری قوم میں پھیل چکی تھی۔عیسائیوں کو یہ بات قرآن نے ہی سمجھائی اور اُن کو جا بجا غلامانہ اطاعت سے باز رکھا۔

سرسید احمد خاں نے پانچویں خطبے میں اسلام کی مذہبی کتابوں کا نہ صرف ذکر کیا ہے یعنی احادیث، تفاسیر اور فقہ جیسی اہم اور غیر معمولی کتابوں کا منشا اور اُن کی غرض وغایت پر بھی نہایت تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔اِس کے علاوہ اُن کے پیش کرنے کا طریقہ بھی بیان کیا ہے تا کہ دوسرے مذاہب کے محققین اور تنگ ذہن نکتہ چیں جو اسلام کے متعلق آئندہ زمانوں میں اگر کچھ لکھنا چاہیں تو اُن کو مسلمانوں کی مذہبی کتب کی طرز تصنیف سے آگاہی اور بصیرت حاصل ہو اور اُن مصنفین کی طرح جو اسلام کی مذہبی کتب سے ناواقفیت کی وجہ سے غلطی پر ہیں ؛ گمراہ نہ ہوں اور اُن کی رہنمائی کے لیے ایک سیدھا سا راستہ ہموار ہو جائے۔

چھٹا خطبہ اسلامی روایات پر مبنی ہے جو نہایت متلاطم ہونے کے ساتھ خاصا طویل بھی ہے۔اِس خطبہ میں اوّل روایت کی واقعیت،اُن کے رواج پانے کی ابتدا کس وجہ سے ہوئی اور دین اسلام اُنہیں درست روایتوں پر منحصر ہے جو تبلیغ رسالت سے سروکار رکھتی ہیں نہ اُنہیں دیگر دنیوی امور واحکامات کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے۔بعد ازاں جھوٹی روایات کے راویوں کے درجہ اعتبار بلحاظ معتبر یہودیوں سے نقل کرنے کی اجازت جو محمدؐ نے صحابہ کو دی ؛ اختلاف روایت کے اسباب احادیث کے موضوع کا بیان، یہ تمام باتیں تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہیں۔اِس کے بعد سر ولیم میور نے جن روایات سے سند لے کر اسلام اور بانیٔ اسلام پر اعتراضات رقم کیے ہیں،اُن اعتراضوں کا جواب نہایت تسلی بخش اور تحقیقی انداز سے دیا ہے۔یہ دونوں خطبات یعنی پانچواں اور چھٹا خطبہ انتہائی مفید،معلومات افزا اطلاعات پر مشتمل ہیں جو اسلام کی مذہبی کتابوں اور روایات پر اِس طرح روشنی ڈالتے ہیں جس کے اجالے میں کوئی غیر مسلم مصنف بشرطیکہ اُس نے آنکھیں بند نہ کی ہوں ؛ دھوکہ نہیں کھا سکتا۔

ساتویں خطبہ میں قرآن مجید،اُس کا نزول،سورتوں اور آیات کی ترتیب،مختلف قراتیں' آیات' ناسخ و منسوخ کی بحث،اُن کے جمع ہونے کا زمانہ،اُن کی اشاعت اور اُن کے مکمل والہامی ہونے کا بیان ملتا ہے۔اِس کے بعد سر ولیم میور اور دوسرے عیسائی مصنفین کی غلطیاں جو انہوں نے قرآن مجید کے متعلق لکھی ہیں،اُن کا ذکر کیا

گیا ہے۔

سرسید احمد خاں نے اِن اغلاط کے ظہور میں آنے کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ مسلم حکمرانوں یا عالموں کو خدا نے اِتنی توفیق نہیں دی کہ قرآن مجید کا دوسری زبانوں میں ترجمہ کروا کر اُنہیں مختلف ممالک میں شائع کرواتے حالاں کہ یورپ کی کئی زبانوں میں قرآن مجید کے تراجم ہوئے مگر وہ سب غیر مسلموں یعنی عیسائیوں نے کیے بعد ازاں سرسید احمد خاں نے سر ولیم میور اور دیگر مصنفین کی اغلاط کی توضیح کی ہے جو اعتراض انہوں نے غلط فہمی سے قرآن پر عائد کیے ہیں۔

''خطبات احمدیہ'' کا آٹھواں باب خانۂ کعبہ کے حالات، اُس کی تاریخی اور جغرافیائی تحقیقات پر قایم ہے جو نہایت واضح انداز میں متعلقہ موضوع کا نہ صرف احاطہ کرتا ہے بلکہ اُس کے ہر پہلو کو روشن بھی کر دیتا ہے ۔مذکورہ خطبہ کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ سر ولیم میور نے اپنی کتاب لائف آف محمدؐ میں اِس بات کا دعویٰ کیا تھا کہ (یقطان) جس کا ذکر توریت میں آیا ہے؛ اہل عرب کا، اُن کی اولاد میں ہونا، حضرت اسماعیلؑ کا مکہ کے قرب میں آباد ہونا نیز خانۂ کعبہ کی تعمیر اور اُس کی تمام رسومات و معمولات کا حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ سے تعلق بنانا یہ سب بناوٹی کہانیاں ہیں اور ہر قسم کی تاریخی سچائی سے اِس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔سر ولیم میور نے لکھا تھا کہ حجر اسود کو بوسہ دینا، کعبہ کے گرد طواف کرنا، عرفات و منیٰ میں مذہبی رسمیات کا ادا کرنا، مقدس مہینوں اور مقدس ملک کی تعظیم کرنا؛ اِن سب باتوں کو حضرت ابراہیمؑ سے یا ان خیالات سے جو اُن کے ذریعے اُن کی اولاد کو پہنچے؛ کسی طرح تعلق نہیں بنتا۔ یہ باتیں یا تو اِن علاقوں سے مخصوص کر دی گئیں ہیں یا بت پرستی کے اُن اصولوں کا جزیرہ عرب سے تعلق تھا۔اِس گمراہ کن دعوے سے یہ مراد ہے کہ انہوں نے آگے چل کر محمدؐ کا بنی اِسماعیل سے تعلق ہونے کا انکار کیا ہے۔

سرسید احمد خاں نے اِس خطبہ میں نہایت ماہرانہ انداز میں نہ صرف مسلمانوں کی تاریخوں سے بلکہ عمومی طور پر یورپ کے عیسائی محققین اور جغرافیہ دانوں کی تحقیقات سے حضرت اسماعیلؑ اور اُن کی اولاد کا حجاز یا عرب میں ہونا ثابت کیا ہے۔ بعد ازاں توریت کی شفاف شہادتوں سے اِس امر کا ثبوت پیش کیا ہے کہ حجر اسود، قربانی کی رسم اور خانۂ کعبہ کا بیت اللہ نام ہونا خصوصی طور پر حضرت اِبراہیمؑ اور اُن کی اولاد سے تعلق رکھتا ہے۔

سرسید احمد خاں نے توریت کے اہم حوالوں سے یہ بھی ثابت کیا کہ حضرت اِبراہیمؑ اور اُن کی اولاد یعنی حضرت اسحٰقؑ، حضرت یعقوبؑ اور حضرت موسیٰؑ سب کا یہی طریقہ تھا کہ خدا کی عبادت کے لیے ایک (پتھر مثل) حجر اسود کو کھڑا کر کے مذبح بناتے تھے اور اُس کو (بیت ایل) یعنی بیت اللہ کہتے تھے۔اِنہیں رسومیات کو خانۂ کعبہ اور اُس کے قرب و جوار میں مسلمان ادا کرتے ہیں۔سرسید احمد خاں نے مذکورہ تمام باتوں کا تعلق حضرت اِبراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کے ساتھ ثابت کر کے فی الواقع سر ولیم میور کے تمام شبہات کو ایک انصاف پسند آدمی کی نظر میں

بے وقعت اور بے قدر بنا دیا ہے۔ مثال کے طور پر سرسید احمد خاں نے خانۂ کعبہ اور حجر اسود کا تعلق متعدد ابواب اور آیتوں کا حوالہ دے کر لکھا ہے کہ حجر اسود وہی مذبح ہے جس کو خدا کے حکم سے حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسحٰقؑ، حضرت یعقوبؑ اور حضرت عیسیٰؑ بناتے تھے۔

بعد ازاں انہوں نے اسی باب میں عرفات سے متعلق بڑا جامع جواب لکھا ہے کہ عرفات ایک ایسا مقام ہے جو دنیا کے بت پرستوں سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ عرفات کا استعمال حضرت ابراہیمؑ اور اُن کے خاندان کے علاوہ دنیا کا کوئی خاندان یا مذہب نہیں کرتا تھا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں حاضر ہونے کو حج کہتے ہیں۔ وہاں دوسری کوئی شئے نہیں ہے۔ یہ پہاڑوں کے نیچے ایک میدان ہے، اُس میں لوگ جمع ہوتے ہیں اور خدا کو یاد کرتے ہیں ۔ وہاں خطبہ پڑھا جاتا ہے جس میں خدا کی تعریف ہوتی ہے نیز خدا کے احکام سنائے جاتے ہیں۔ لہٰذا غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اس رسم کا تعلق اور اصلیت بت پرستوں سے پائی جاتی ہے یا اس کا تعلق خاص طور پر حضرت ابراہیمؑ سے ہے۔

سرسید احمد خاں نے اِس کے بعد منیٰ سے متعلق جامع اور واضح بیان درج کیا ہے کہ منیٰ کا مقام صرف قربانی کے لیے خاص ہے اور توریت بھی قربانی کے ذکر سے بھری ہوئی ہے جہاں بیت اللہ تعمیر کیا گیا تھا، وہاں قربانی ہوتی تھی۔ اسی قربانی کے سبب بیت اللہ مذبح کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ منیٰ اور خانۂ کعبہ نہایت قریب ہیں اِس لیے قربانی نذر کرنے کے لیے وہ مقام قرار دیا گیا البتہ ابراہیمؑ، یعقوبؑ، اسحٰقؑ اور موسیٰؑ و داؤدؑ کی قربانی اور اسلامی قربانی میں یہ فرق ہے کہ اُس قربانی میں جانور کو مار کر اُس کی لاش کو آگ میں جلا دیتے تھے، اِس خیال سے کہ خدا کو اِس کی خوشبو پسند تھی جبکہ اسلام میں وہ قربانی غریب محتاج لوگوں میں تقسیم کی جاتی ہے۔

یہ خطبہ بہت طویل ہے اُس کی اصل خوبی یہی ہے کہ اِس کا مکمل مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ سرسید احمد خاں نے سر ولیم میور کے اعتراضات و شبہات کی تردید کرنے کے بعد خانۂ کعبہ اور مکہ معظّمہ کی تاریخ محققانہ طور پر بیان کی ہے۔

'خطبات احمدیہ' کا نواں خطبہ محمدؐ کے خاندان کی تحقیقات پر مبنی ہے جو اِس منشا کے تحت لکھا ہے گیا کہ سر ولیم میور نے اپنی کتاب میں محمدؐ کے بنی اسمٰعیلؑ ہونے کی تردید کی ہے۔ مثلاً وہ ایک جگہ لکھتا ہے کہ غالباً یہ کوشش کہ وہ یعنی (محمدؐ) حضرت اسمٰعیلؑ کی نسل سے ثابت کیے جانے کا مسئلہ اُن کی دوران زندگی ہی میں اُٹھنا شروع ہو گیا تھا۔ اِس طرح محمدؐ کے ابراہیمیؑ کے نسب نامہ کے ابتدائی سلسلے گھڑے گئے ہیں۔

دراصل سر ولیم میور کو محمدؐ کے نسب پر نکتہ چینی کی جرأت غالباً اِس وجہ سے ہوئی کہ محمدؐ کا نسب کا ذکر، نسب کی کتابوں میں صرف 'عدنان' (یعنی محمدؐ کے جد عدنان امجد کا نام جو فصاحت و بلاغت کے لیے مشہور تھے) تک مسلسل بیان ہوا ہے جس میں کسی کو اختلاف نہیں ہے لیکن عدنان کے بعد حضرت اسماعیلؑ کی جتنی پشتوں کا ذکر ہوا، اُن

میں اختلاف واقع ہوا ہے۔

اِس وجہ سے اِس خطبہ میں سر سید احمد خاں نے ایک عمدہ تمہید باندھی ہے جس کا ماحصل یہ کہ ہے زمانۂ جاہلیت میں عرب کے لوگ کسی فن سے واقف نہیں تھے مگر اُن میں دو باتیں بے مثال پائی جاتی تھیں ایک شاعری دوسرا علم الانساب یعنی انسانی قبیلوں، خاندانوں، نسلوں اور صحت نسب کا علم یعنی وہ علم جس میں اُس امر سے بحث کی جاتی ہے جو ماضی (خصوصاً) انسان کی جسمانی خصوصیات، جغرافیائی تقسیم، زبان اور رسم و رواج وغیرہ سے تعلق ہوتا ہے۔ انسانی نسلوں کے علم کو محفوظ کرنے کے لیے اُن کے ہاں کتاب کا رواج نہیں تھا بلکہ صرف حافظہ پر انحصار تھا۔ اِس لیے وہ اپنے اپنے قبیلوں کی تمام پشتوں کے بارے میں طویل عرصے تک یاد رکھتے تھے اور خاندان پر فخر کرتے اور اپنے مخالفین کے خاندان میں عیب جوئی کرتے تھے۔ اب کیوں کہ کتاب کے بغیر کسی قبیلے کی تمام پشتوں کو ترتیب کے ساتھ یاد رکھنا ممکن نہیں تھا اِس لیے بڑے بڑے جلیل القدر اور مشہور اشخاص کے نام تو ضرور یاد کر لیتے تھے البتہ باقیوں میں کچھ کے نام یاد رہتے اور کچھ کے بھول جاتے تھے۔ مشاہیر کے نام یاد رہنے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اُن کے نام اور کارناموں کا ذکر اشعار میں بیان کیا جاتا تھا۔ بڑے بڑے معرکوں میں اُن اشعار کو پڑھا بھی جاتا تھا۔ اِن وجوہات سے ہر شخص اپنے تئیں اور اپنے ہمسایہ و مخالفین کو بخوبی جانتا تھا کہ کس قبیلہ اور کس نسل سے تعلق رکھتا ہے۔ کسی کی یہ مجال نہیں تھی کہ اپنی قوم یا نسل کو بدل سکے، جھوٹ موٹ اپنے یا کسی کو دوسری نسل کا بتا سکے اگر کسی کو کسی قبیلے کی نسلیں بہ ترتیب یاد نہ بھی ہوں مگر ہر ایک قبیلے میں نامور اور قابل اشخاص ہوتے تھے جو سب کو یاد رہتے تھے۔ اِس لیے جب اسلام کے زمانے میں کتابت اور تصنیف و تالیف کا رواج آیا اور ایک مدت کے بعد مؤرخین نے کسی کا پورا نام سلسلہ وار لکھنا چاہا تو اُن کو ایسی مشکلات پیش آئیں جن کا حل دشوار کن تھا کیوں کہ نسب ناموں کے بہ ترتیب یاد نہ ہونے کے علاوہ دوسری مشکل یہ تھی کہ ایک ہی نام کے کئی کئی شخص ہوتے تھے پھر ایک ہی شخص کے کئی کئی نام ہوتے تھے۔ عرب میں یہ بھی دستور تھا کہ نسب نامہ کے لوگوں میں جو شخص مشہور و معروف ہوتا، باپ کی جگہ اُس کے باپ کا نام لیا جاتا تھا۔

محمدؐ کا نسب نامہ سلسلہ وار لکھنے والوں کو بھی یہی مشکلیں پیش آئیں۔ محمدؐ کو اپنا کرسی نامہ بیان کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی کیوں کہ عرب کے تمام لوگ محمدؐ کو یقیناً قبیلہ قریش سے اور بنی اسماعیلؑ کو معد ابن عدنان کی اولاد میں نیز عدنان کو قیدار ابن اسماعیلؑ ابن ابراہیمؑ کی اولاد میں نہ صرف مانتے بلکہ تسلیم بھی کرتے تھے۔ اِسی قدر اُن کا جاننا محمدؐ کے بنی اسماعیلؑ ہونے کے لیے کافی تھا حالاں کہ اِس درمیان کئی پشتیں گزری ہیں اِسی لیے کوئی صحیح روایت محمدؐ کے نسب نامہ کے متعلق موجود نہیں ہے۔ اِس لیے جب لوگوں نے محمدؐ کا نسب نامہ لکھنا چاہا تو اُن میں اختلاف ہونا عین ممکن تھا۔ محمدؐ سے لے کر معد ابن عدنان تک کسی مؤرخ نے اختلاف نہیں کیا جو بھی اختلاف ہے وہ معد ابن عدنان سے حضرت اسماعیلؑ تک پشتوں میں صرف پانچ شخص ہیں جن کے لکھے ہوئے

نسب ناموں میں معد ابن عدنان سے لے کر ابراہیمؑ تک پشتوں کا بیان ملتا ہے۔

سرسید احمد خاں کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ عیسائیوں نے اِس بات کو ثابت کرنے کی بے فائدہ کوشش کیوں کی؟ کہ یہودیوں اور مسلمانوں کے مذہب میں ایک تعلق ہے۔ پچھلے معاملات پہلے پر مبنی ہیں پھر بطورِ اعتراض کہتے ہیں کہ ہم نے فلاں فلاں باتیں یہودیوں سے لی ہیں! جیسے اسلام یہودیوں کے ہاں سے چرایا ہوا مذہب ہے جس طرح عیسائی مذہب یہود کا محتاج ہے، اِسی طرح اسلام بھی یہود کا محتاج ہے۔

یہاں سرسید احمد خاں نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہم اِس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ جو یکسانیت اِن دونوں مذاہب میں پائی جاتی ہے، اُس سے انکار کرنے کے بجائے ہم اِس کو نہایت فخر سمجھتے ہیں۔ صرف ہم مسلمان ہی ہیں جو ہر ایک سچے اور خدا کے بھیجے ہوئے نبی کی سچی پیروی کرتے ہیں۔

دسواں باب اُن بشارتوں کے بیان پر مبنی ہے جس میں توریت اور انجیل میں محمدؐ کے نبی ہونے کی گواہی دی ہے۔ اِس خطبہ کے شروع میں سرسید احمد خاں نے قرآن مجید کی وہ آیتیں نقل کی ہیں جن میں اِس بات کا ذکر آیا ہے کہ توریت اور انجیل میں محمدؐ کو نبوت کی خبریں دی گئیں ہیں۔

گیارہواں خطبہ معراج اور شق صدر کی حقیقت پر محققانہ طور پر روشنی ڈالتا ہے اِس لیے جس قدر متضاد روایتیں حدیث کی کتب میں آئی ہیں اُن کا اختلاف متضاد دکھایا ہے۔ سرسید احمد خاں نے یہ دونوں مباحث یعنی معراج اور شق صدر لکھنے کے بعد اپنی تفسیر میں شرح کے ساتھ اِس طرح بیان کی ہیں کہ اُس سے پہلے شاید ہی کسی نے کی ہو۔

سرسید نے بارہواں خطبہ میں محمدؐ کی ولادت سے بارہ برس کی عمر کا احوال نہایت معتبر اور صحیح روایتوں سے ثابت کیا ہے اور جو روایات کتابوں میں بھر دی گئی ہیں اور جن کی وجہ سے سرولیم میور نے اپنی کتاب میں تعریفیں کی ہیں، اُن کو کمزور بتایا ہے اُن کی صحت کے نہات لطیف جواب سرولیم میور کو دیے ہیں۔

8.4 آپ نے کیا سیکھا:

اِس اکائی میں آپ کو ......

☆ سرسید کے سوانحی کوائف اور اُن کی شخصیت کا علم ہوا

☆ سرسید کی تصنیف 'خطبات احمدیہ' کی وجہ تسمیہ معلوم ہوئی

☆ سرسید کے تفصیلی و مدلل جوابات سے آگاہی ہوئی

☆ سرلیم میور کے احتراضات وشبہات کا علم ہوا

☆ اسلام کا تاریخی پس منظر معلوم ہوا

8.5 اپنا امتحان خود لیجیے:

☆ سرسید کی سن پیدائش وسن وفات لکھیے

☆ 'خطبات احمد یہ' کا مختصر جائزہ پیش کیجیے

☆ سرولیم میور کے اعتراضات وشبہات پر روشنی ڈالیے

☆ 'خطبات احمد یہ' کی وجہ تسمیہ اپنے الفاظ میں بیان کیجیے

☆ 'خطبات احمد یہ' کے تحقیقی پہلوؤں پر تفصیلی نوٹ لکھیے

8.6 سوالات کے جوابات

ا۔ سرسید احمد خاں 17/ اکتوبر 1817 دورِ مغلیہ دہلی میں پیدا ہوئے اور 27/ مارچ 1898 دورِ برٹیش علی گڑھ میں وفات پائی۔ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (علی گڑھ) جامع مسجد کے احاطے میں مدفون ہیں۔

۲۔ 'خطبات احمد یہ' سرسید احمد خاں کی ایک اہم وغیر معمولی تصنیف ہے جو اسلام سے متعلق تحقیقی وتنقیدی مطالعہ پیش کرتی ہے۔ اِس کتاب میں سرسید احمد خاں نے نہایت جاں فشانی اور بڑی محنت سے تصنیف کیا ہے۔ انہیں مذکورہ کتاب کی تیاری اور خطبات لکھنے کی غرض سے انگلستان کا بھی سفر کیا اور اذیت رساں سفر اور اخراجات کا بوجھ بھی برداشت کیا حالاں کہ اُن کے دوست واحباب اور رفقا نے اُن کی مالی مدد کی اور اِس احسن کام کو پایہ تک تکمیل پہنچایا۔

۳۔ انگریز تاریخ داں سرولیم میور نے اسلام پر اپنی کتاب 'لائف آف محمدؐ' میں جا بجا تنقیدی حربے کیے تھے اور ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ مسلمانوں کے تاریخی جغرافیہ اور بعض مسلّمات مذہبی کو بنیاد بنا کرنا قابل اعتبار بتایا تھا۔ سرولیم میور کا یہ بھی اعتراض تھا کہ حضرت اسماعیلؑ اور اُن کے بیٹے عرب کے مختلف حصوں میں آباد نہیں ہوئے یا یہ کہ محمدؐ کا حضرت اسماعیلؑ کی اولاد میں ہونا ثابت نہیں ہے۔ اس خطبہ میں سرسید احمد خاں نے روایت کے مضبوط حوالوں اور عیسائی محققین کی شہادتوں سے اپنے دعوے سے سرولیم اور عیسائی مصنفین کے برخلاف استدلال کیا ہے۔

۴۔ جب سرولیم میور کی کتاب لائف آف محمدؐ چار جلدوں پر مشتمل شائع ہوکر ہندوستان پہنچی جس کے متعلق عیسائیوں میں مشہور ہو گیا تھا کہ اِس کتاب نے اسلام کو جڑ سے اُکھاڑ دیا ہے۔ ایسے مشکل وقت میں سرسید احمد خاں بے چین ہو گئے، اُن کو فکر لاحق تھی کہ اسلام پر اِس قسم کے حربے ہو رہے ہیں اور مسلمانوں کو خبر تک نہیں! تبھی سرسید احمد خاں نے 'خطبات احمد یہ' لکھنے کا پختہ ارادہ کیا لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ 1857 کے ہنگاموں میں ہندوستان کے تمام اسلامی کتب خانے برباد ہو گئے ہیں اور سرولیم میور کا جواب لکھنے کے لیے جن کتابوں کی ضرورت ہے، وہ یہاں دستیاب نہیں ہو سکتیں تو اُن کو ولایت جانے کا خیال آیا لہٰذا ایک دو برس بعد ہی وہ انگلینڈ کے لیے روانہ ہو گئے۔ سرسید اِس کتاب کے لکھنے کو مذہبی فریضہ سمجھا۔ اِس کی ایک اہم وجہ یہ بھی کہ سرولیم میور نے

تمام روایتوں کو جو مسلمانوں کی روایتوں اور تفسیروں کی کتابوں میں درج ہیں، صحیح مان کر محمدؐ کی تعلیم اور اخلاق وغیرہ پر نکتہ چینی کی تھی۔ مسلمانوں کی موجودہ پستی اور خستہ حالی کو اسلام کی تعلیمات کا نتیجہ قرار دیا تھا نیز مسلم بادشاہوں کی موقع پرستی و سفا کی اور خونریزی کی وجہ اسلام کو ٹھہرایا تھا لیکن سر سید احمد خاں نے اِن تمام غلط فہمیوں اور جھانسوں کو معقول اور دلنشیں دلائل سے دور کیا انہوں نے دو طویل خطبوں میں صرف مسلمانوں کی مذہبی کتابوں اور اُن روایتوں کا؛ جو اُن کتب میں درج ہیں، مفصل حال بیان کیا ہے۔

۵۔ مذکورہ کتاب کے لکھتے وقت جس قدر جوش سر سید احمد خاں کے دل میں تھا جو مالی مشکلات اس کو شائع کرانے میں پیش آئیں اور جو سخت محنت کتاب لکھنے میں پیش آئی۔ اِس کا اندازہ محض اُن مکتوبات سے لگایا جا سکتا ہے جو انہوں نے ولایت سے مولوی سید مہدی علی کے نام ارسال کیے تھے۔ سر سید ایک مکتوب میں لکھتے ہیں کہ میں نے فرانس، جرمنی اور مصر سے اہم کتابیں منگوانا شروع کر دی ہیں۔ سیرت ہشامی مطبوعہ اور چند کتابیں لینن کی خرید لیں ہیں اور ایک آدمی مقرر کر لیا ہے جو لینن کا ترجمہ کر کے مضمون بتا سکے۔ وہ ایک اور خط میں لکھتے ہیں کہ میں روز و شب کتاب خطبات احمدیہ میں مصروف ہوں سب کام چھوڑ دیا ہے، لکھتے لکھتے کمر درد کرنے لگتی ہے اور کسی شخص کے مددگار نہ ہونے کی وجہ سے یہ کام اور بھی سخت ہو گیا ہے۔ اِدھر جب حساب دیکھتا ہوں تو جان نکل جاتی ہے کہ اِلٰہی لکھنا اور چھپوانا تو شروع کر دیا روپیہ کہاں سے آئے گا۔ جہاں تک معلوم ہوا کہ سر سید احمد خاں سے پہلے دنیا کے کسی مسلمان نے یورپ کا سفر صرف اِس غرض سے نہیں کیا تھا کہ وہاں جا کر اسلام کی حمایت میں بڑے بڑے کتب خانوں سے میٹریل جمع کر کے وہیں بیٹھ کر عیسائیوں کی تردید اور اسلام کی تائید میں کتاب لکھے اور یورپ ہی کی کسی زبان میں جو تمام براعظموں میں عمومی طور پر بولی اور سمجھی جاتی ہو؛ اُس کا ترجمہ کرائے اور وہیں اُس کو شائع کروائے۔ اِس طرح اسلام کی خوبیاں اُن قوموں تک پہنچائے جنہوں نے چودہ سو برس سے اسلام پر سوائے نکتہ چینی کے کوئی بات نہ سنی ہو۔

8.7 فرہنگ:

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
قرب	قریب ہونا	جبراًوقہراً	زور ،زبردستی
اذیت رساں	تکلیف پہچانے والا	تشکیل	شکل بنانا
استدلال	دلیل پیش کرنا	الہامی احکام	آسمانی حکم
افعال قبیحہ	برے اعمال	مطہر	پاک

بہشت	جنت	اطاعت
تعمیل،حکم		
ملامت	برا بھلا کہنا	نکتہ چیں
اعتراض کرنا		
بصیرت	عقل وفہم،شعور	منشا
ارادہ		
جامع	مکمل	ہموار
برابر، یکساں		
معروف	مشہور	منسوب
متعلق، جوڑنا		
بیشتر	زیادہ تر	بالیقین
یقین کے ساتھ		
ادیان	دین کی جمع	صریح
واضح، کھرا		
متلاطم	طوفانی	واقعیت
اصلیت،احوال واقعی		
اغلاط	غلط کی جمع	غرض وغایت
مقصدومدعا		
ظہور	ظاہر ہونا	توضیح
وضاحت،کھول کے کہنا		
مشاہیر	بزرگ اور نامور لوگ	مفصل
تفصیل کے ساتھ		
ماحصل	جو حاصل ہوا،نتیجہ	جلیل القدر
معزز، بڑے رتبے والا		
متضاد	ایک دوسرے کی ضد	شق صدر
وہ واقعہ جب فرشتے نے		

نبیؐ کا سینہ چاک کر کے

تمام کدورتیں انسان سے

پاک وصاف کیا تھا

کرسی نامہ	کاشتکاری، پٹواری، سرکاری بہی جس میں گاؤں کے ہر زمین دار کے کھیت کا حصہ، پٹی، لگان اور ابواب سرکاری لکھے جاتے ہیں
یقطان	(عرب روایت) یقطان جنوبی عرب کے قبائل کا جدامجد

8.8 کتب برائے مطالعہ:

مطالعہ سرسید احمد خاں	مولوی عبدالحق	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۱۹۸۹
سرسید احمد خاں فکر کی اسلامی کی تعمیر نو	ڈاکٹر سی، ڈبلیو، ٹرول	القلم انٹر پرائزس، لاہور	۱۹۹۸
سرسید احمد خاں	میر حجابت علی	ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی	۱۹۷۹
سرسید کی ادبی خدمات ہندوستانی نشاۃ ثانیہ	ڈاکٹر قدسیہ خاتون	کتابستان ،اسرار کریمی پریس ،الہٰ آباد	۱۹۸۱
سرسید احمد خاں ایک سیاسی مطالعہ	عتیق صدیقی	قومی کونسل برائے فروغ اردو، نئی دہلی	۲۰۱۱

اکائی 9 تہذیب الاخلاق کا اجراء اور اس کی سماجی وادبی اہمیت

اکائی کی ساخت

9.1 اغراض ومقاصد

9.2 تمہید

9.3 تہذیب الاخلاق کا اجراء اور اس کی سماجی وادبی اہمیت

9.3.1 تہذیب الاخلاق کا اجراء

9.3.2 تہذیب الاخلاق کی تاریخ

9.3.3 اشاعت کے مقاصد

9.3.4 اہمیت اور افادیت

9.3.5 تہذیب الاخلاق کے موضوعات

9.3.6 تہذیب الاخلاق کا انداز اور اسلوب

9.4 ماحصل

9.5 آپ نے کیا سیکھا

9.6 اپنا جائزہ خود لیں

9.7 سوالوں کے جوابات

9.8 فرہنگ

9.9 کتب برائے مطالعہ

9.1 اغراض ومقاصد

عزیز طلبا! اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

1۔ رسالہ تہذیب الاخلاق کے بانی اور اس رسالہ کی خصوصیات سے واقف ہوسکیں۔

2۔ رسالہ تہذیب الاخلاق کی تاریخ کے متعلق اظہار خیال کرسکیں۔

3۔ رسالہ تہذیب الاخلاق کے اجراء کے مقاصد سے واقفیت حاصل کرسکیں۔

4۔ رسالہ تہذیب الاخلاق میں شائع مضامین کے انداز اور اسلوب تحریر کا تجزیہ کرسکیں

9.2 تمہید

عزیز طلبہ! جیسا کہ آپ گزشتہ اکائی میں سرسید احمد خاں کی حیات وخدمات کا تفصیلی مطالعہ کر چکے ہیں اور آپ اس بات سے بھی بخوبی واقف ہیں کہ سرسید احمد خاں قوم کے ماضی سے واقفیت رکھتے تھے اور اسی تناظر میں مستقبل کی تابناکی کی خاطر قوم کو بیدار کرنے کی کاوشوں میں سرگرداں تھے۔ سرسید احمد خاں کی شخصیت میں ان کے آبا واجداد کی شخصیت کا

عکس دیکھنے کو تو ملتا ہی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کی والدہ کی شخصیت کا بھی اثر تھا جو ایک نیک صفت خاتون، دانشمند، دوراندیش اور عمدہ اخلاق رکھتی تھیں۔ ایسی عظیم ماں کی گود میں پرورش پا کر سرسید احمد خاں نے قوم کی فلاح و بہبود کی خاطر جو کارہائے نمایاں انجام دیے ان کی مثال نہیں ملتی۔ یوں تو قوم کی ترقی کی خاطر سرسید نے کئی کوششیں کیں جن کے مثبت نتائج بھی سامنے آئے۔ سائنٹفک سوسائٹی اور محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا قیام ایک عمدہ مثال کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن رسالہ تہذیب الاخلاق کی اشاعت ایک سنگ میل کو عبور کرنے کی اہمیت رکھتا ہے۔

عزیز طلبا! آپ اس اکائی میں رسالہ تہذیب الاخلاق کی مکمل تاریخ، اس کے مقاصد، رسالہ تہذیب الاخلاق کی ادبی اہمیت، اس کے موضوعات اور اس کے اسلوب کا تفصیلی مطالعہ کریں گے۔ اس کے علاوہ اس اکائی کا ماحصل اور اپنی جانچ آپ، آپ نے کیا سیکھا بھی شامل کیا گیا ہے۔ فرہنگ میں نئے الفاظ کے معنی اور مزید مطالعہ کی خاطر امدادی کتب کی فہرست اکائی کے آخر میں فراہم کی گئی ہے۔

عزیز طلبا! آپ اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ سرسید احمد خاں کی خدمات کا دائرہ کافی وسیع ہے۔ جہاں انھوں نے ایک جانب اردو شاعری کے مزاج کو بدلنے پر قدرے زور دیا وہیں دوسری جانب آزاد نثر کے فروغ کو بھی عملی جامہ پہنانے کے لیے خاطر خواہ کاوشیں کیں۔ یوں تو ان کی شخصیت کے مختلف پہلو ہیں جن کی وجہ سے ان کو آفاقی شخصیت کہنا غلط نہ ہوگا۔ مثال کے طور پر ایک جانب انھوں نے مذہب اور مذہبی اشخاص پر کتب اور مضامین لکھے وہیں دوسری جانب تاریخ اور سیاست کے ساتھ ساتھ کچھ نہایت اہم اشخاص کی سوانح بھی لکھی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی ذات کا ایک اہم اور منفرد پہلو ان کی صحافت نگاری تھی، جس کے ذریعہ وہ قوم سے مخاطب ہوئے اور اس کے درد کا درماں کرنے میں خاطر خواہ کامیابی حاصل کی۔ قوم کی فلاح و بہبود کے لیے سرسید نے کئی رسائل اور اخبارات شائع کیے لیکن تہذیب الاخلاق کی اشاعت ان کا وہ کارنامہ ہے جو آج ایک صدی کے بعد بھی سرسید اور ان کے نظریہ کو سمجھنے میں معاون اور مددگار ہے۔ عزیز طلبا یوں تو تہذیب الاخلاق کے معنی ہیں اخلاق کو سنوارنا لیکن یہ اس رسالہ کا نام ہے جس کا اجرا سرسید کی صحافت کا ہی نہیں بلکہ قوم میں حقیقی لیاقت پیدا کرنے کے لیے سرسید کی جانب سے کیے گئے اقدامات کا ضامن بھی ہے۔ نیز یہ کہ سرسید اس رسالہ کے ذریعہ قوم کی تقدیر کو بدلنے کے خواہاں تھے۔

9.3 تہذیب الاخلاق کا اجراء اور اس کی سماجی و ادبی اہمیت

9.3.1 تہذیب الاخلاق کا اجرا

جیسا کہ آپ پچھلی اکائی میں پڑھ چکے ہیں کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد برصغیر ہندو پاک میں ایک پُر آشوب دور کا آغاز ہو گیا تھا اور یہ بات سرسید بخوبی جانتے تھے کہ سرکار کا طریقۂ تعلیم مسلمانوں کے لیے ناکافی اور ہندوستانی تعلیم غیر مفید تھی۔ اس لیے انھوں نے ولایت میں انگریزی زبان میں ایک پمفلٹ شائع کرایا جس کا عنوان تھا ''ہندوستانیوں کے موجودہ نظام تعلیم پر اعتراضات'' سرسید سب سے پہلے مسلمانوں کے مذہبی خیالات کی اصلاح کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے انھوں نے انگلستان سے واپسی کے بعد ۲۴ر دسمبر ۱۸۷۰ء کو ایک رسالہ کا اجرا کیا جس کا نام تہذیب الاخلاق رکھا۔

سرسید نے علی گڑھ تحریک، سائنٹفک سوسائٹی اور بطور خاص رسالہ تہذیب الاخلاق کی اشاعت سے نہ صرف مسلمانان برصغیر کے حقوق کا تحفظ کیا بلکہ مستقبل قریب میں ان کے سامنے ایک روشن مستقبل کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کی صورت بھی عیاں کردی۔

عزیز طلبا! اگر ہم اس رسالہ کے اجرا کے بارے میں بات کریں تو ہمیں سب سے پہلے اس رسالہ کی اشاعت کے پس منظر کو زیر غور رکھنا ہوگا اس لیے آیئے اس رسالہ کی اشاعت کے وقت سرسید کے افکار اور اقدام پر ایک نگاہ ڈالتے ہیں۔

سرسید احمد خاں یکم اپریل ۱۸۶۹ء کو انگلستان کے سفر پر روانہ ہوئے۔ ان کے بیٹے سید حامد اور سید محمود اس سفر میں ان کے ہمراہ تھے۔ لندن میں قیام کے دوران سرسید نے وہاں کے نظام تعلیم اور تہذیبی و تمدنی زندگی کا بغور مطالعہ کیا۔ انھوں نے اپنے تصور تعلیم میں استحکام کی غرض سے بطور خاص ولیم میور کی کتاب Life of Muhammad میں اٹھائے گئے اعتراضات کا جواب دینے کے لیے خطبات احمدیہ کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی۔ اسی دوران انھوں نے وہاں رچرڈ اسٹیل کے اسپیکٹیٹر اور ایڈیسن کے ٹیٹلر نامی رسائل کا بھی مطالعہ کیا۔ جس سے وہ بہت متاثر ہوئے۔ سرسید نے ان رسائل کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا ہے:

''ان پرچوں میں صرف علم و ادب اور علم انشا ہی میں ترقی نہیں ہوئی بلکہ اخلاق اور عادات اور خصلت کو بھی کچھ ترقی ہوئی۔''

یہاں تک کہ سرسید نے ان مدیران سر رچرڈ اسٹیل اور مسٹر ایڈیسن کو لندن کے پیغمبر اور سویلائزیشن کے دیوتا کہہ کر خراج تحسین پیش کیا۔ ان رسائل سے قدرے متاثر ہونے کے بعد ولایت میں ہی سرسید نے ایک رسالہ کو نکالنے کا ارادہ کرلیا تھا اور اس کے متعلق انھوں نے محسن الملک کو ۱۸۷۰ء میں مندرجہ ذیل خط لکھا:

> ''ایک اخبار خاص مسلمانوں کے فائدے کے لیے جاری کرنا تجویز کرلیا اور تہذیب الاخلاق کا نام فارسی میں اور انگریزی میں سوشل ریفارمر رکھ لیا ہے۔ اس کا منظر نامہ بھی بہت خوبصورت یاں کھدوالیا ہے۔ کاغذ بھی ایک برس کے لائق یہاں پر خرید لیا ہے۔'' (سرسید احمد خاں، مسافران لندن، ص: ۲۹۳)

پھر دوسرے خط میں ۲۷ رمئی ۱۸۷۰ء کو انھوں نے محسن الملک کو اس پرچہ کے لائحہ عمل اور منصوبوں کے بارے میں بتاتے ہوئے لکھا ہے:

> ''ہم بیس دوست پانچ پانچ روپیہ جمع کریں گے اور اخبار مفت بانٹیں گے اور بہ قیمت بھی بیچیں گے اس اخبار میں بجز اس کے کہ خاص مسلمانوں کی دینی اور دنیاوی بھلائی کے آرٹیکل ہوں گے اور کچھ نہیں ہونے کا۔ اس میں میں اور آپ دونوں آرٹیکل لکھنے والے ہوں گے اور اگر اصلاح ہوگی منشی ذکاء اللہ صاحب اور منشی نجم الدین صاحب ڈپٹی انسپکٹر کو بھی آرٹیکل لکھنے میں شریک کریں گے۔''
>
> (سرسید کے خطوط، مرتبہ وحید الدین سلیم، ایڈیٹر معارف، حالی پریس پانی پت)

ان خیالات کے اظہار کے بعد جب سرسید سفر ولایت سے ۲ر اکتوبر ۱۸۷۰ء کو واپس ہندوستان آئے تو واپسی کے صرف ایک مہینہ ۲۲ دن بعد یکم شوال ۱۲۸۷ھ مطابق ۲۴ر دسمبر ۱۸۷۰ء انھوں نے تہذیب الاخلاق کا پہلا پرچہ شائع کیا۔ اس پرچہ کی اشاعت کے لیے سرسید نے اپنے دوستوں کے ساتھ ایک کمیٹی بھی بنائی جس میں طے پایا کہ تہذیب الاخلاق کے لیے ہر ممبر سے ساٹھ روپیہ سالانہ اور عام خریدار سے ساڑھے چار روپیہ سالانہ لیا جائے گا۔ ان کا یہ فیصلہ اس رسالہ کی شہرت کے لیے ایک کامیاب قدم ثابت ہوا اور رسالہ کا باقاعدہ اجرا ہوا۔

9.3.2 تہذیب الاخلاق کی تاریخ

اگر اس رسالہ کی تاریخ کی بات کی جائے تو اس کا پہلا شمارہ ۱۲۷۷ھ مطابق ۱۸۷۰ء کو شائع ہوا اور یہ پرچہ لگاتار چھ برس تک نکلتا رہا۔ ادارت کی ذمہ داری خود سرسید نے سنبھالی۔ چونکہ یہ رسالہ قوم کی ترقی کی خاطر شائع ہوتا تھا اس لیے اس سے ہونے والی آمدنی کو رسالہ کی ترقی کے لیے صرف کر دیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ یہ ایک تجارتی رسالہ نہ ہونے کے سبب اس کی آخری جلدوں میں ہر نمبر کی پیشانی پر بطور ماٹو (مونوگرام) یہ عربی فقرہ لکھا جاتا تھا:

حب القوم من الایمان فمن یسع فی اعزاز قومه انما یسعیٰ فی اعزاز دینه.''

ترجمہ: قوم کی محبت جزو ایمان ہے جس نے قوم کا اعزاز بڑھانے کے لیے کوشش کی اس نے دین کے اعزاز کی کوشش کی۔ (حیات جاوید، الطاف حسین حالی)

ابتدا میں یہ رسالہ پندرہ روزہ تھا لیکن بعد میں ماہنامہ ہو گیا۔ اس کے مضمون نگاروں میں سرسید کے علاوہ خواجہ الطاف حسین حالی، محسن الملک، وقار الملک، ذکاء اللہ اور احسان اللہ عباسی وغیرہ تھے۔

سرسید کے عہد میں یہ رسالہ چند وجوہات کی بنا پر تین بار بند ہوا، جن کی تواریخ مندرجہ ذیل ہیں:

پہلی مرتبہ ۲۴ر دسمبر ۱۸۷۰ء تا ۲۰ر دسمبر ۱۸۷۶ء

دوسری مرتبہ ۲۳ر اپریل ۱۸۷۸ء تا ۲۸ر جولائی ۱۸۸۰ء

تیسری مرتبہ ۱۷ر اپریل ۱۸۹۳ء تا فروری ۱۸۹۷ء

سرسید کے انتقال کے بعد ۱۹۰۱ء سے تہذیب الاخلاق شائع ہوا، جس کے مدیر ۱۹۰۷ء تک محسن الملک رہے۔ اس کے بعد اس کے مدیر وحیدالدین سلیم ہو گئے جو کہ ۱۹۰۹ء تک اشاعت کا انتظام سنبھالتے رہے۔ اس کے کافی وقت کے بعد سید حامد (سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) نے اس کی اشاعت فروری ۱۹۸۲ء میں شروع کی جو کہ ابھی تک جاری ہے۔

اگر وضاحت کے ساتھ بیان کیا جائے تو اس رسالہ کے ابتدائی دور کے صرف چھ ماہ کے مختصر عرصہ میں ۶۲۲ مضامین شائع ہو چکے تھے، جن میں سے ۲۱۱ مضامین خود سرسید کے تھے۔ اس کے تقریباً تین برس کے بعد دوبارہ یہ رسالہ جاری ہوا لیکن تین برس پانچ مہینہ کے بعد یہ دوبارہ بند ہو گیا۔ یوں تو اس کی ضرورت ہر وقت رہی لیکن چونکہ حالات سازگار نہ تھے

اس کے سبب اس کی اشاعت میں دشواریاں پیش آنے لگیں اور یہ پھر سے بند ہو گیا حالانکہ اس کی اشاعت کے لیے اقدامات اور کاوشیں جاری تھیں۔ آخر کار دانشوران کی محنت رنگ لائی اور تقریباً تیرہ چودہ برس کے طویل عرصہ کے بعد اس کا تیسرا دور شروع ہوا جو کہ تین برس بعد بند ہو گیا لیکن جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ سید حامد کی کوشش رنگ لائی اور ۱۹۸۲ء سے اس کی اشاعت کا کام مسلسل جاری ہے، جو کہ آج بھی ادب اور اصلاح کے سیاق وسباق میں ایک منارۂ نور کی حیثیت رکھتا ہے۔

9.3.3 اشاعت کے مقاصد

سر سید تہذیب الاخلاق کے پہلے شمارے میں لکھتے ہیں کہ:

''اس پرچہ کے اجراء کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجہ کی سویلزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جائے تا کہ جس حقارت سے سویلائزڈ یعنی مہذب قومیں انہیں دیکھتی ہیں وہ رفع ہو اور وہ بھی دنیا کی معزز قومیں کہلائیں۔''

یعنی اس رسالہ کے اجراء کا مقصد نئی تہذیب وتمدن سے روشناس کرانا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی عصری علوم وفنون کی جانب بھی قوم کی توجہ مبذول کرانا تھا۔ اس کے علاوہ اس رسالہ کی اشاعت کا مقصد یہ بھی تھا کہ اس بات کو ہندوستانی مسلمانوں کے ذہن نشین کیا جائے کہ اسلام ترقی اور تمدن کا دشمن نہیں ہے اور دنیا میں جو اور ترقی یافتہ اقوام ہیں ان کی ترقی سے مسلمان آگاہ ہوں اور غیر ضروری رسومات کی جانب سے ان کے دلوں میں نفرت پیدا ہو۔ چونکہ تہذیب الاخلاق کے اجراء کے وقت مذہبی اوہام پرستی عروج پر تھی اس لیے اس رسالہ کی اشاعت کے مقاصد میں یہ بات بھی شمولیت رکھتی تھی کہ لوگوں کو مذہبی خیالات پر گفتگو کرنے کے بجائے تعلیم کی روشنی سے منور ہونے کی جانب اپنی توجہ مبذول کروائی جائے، جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں کہ یہ بالکل اسی پر مبنی تھا جس نہج کے رسائل اسپیکٹٹر اور ٹیٹلر تھے۔ چونکہ یورپ میں بھی مارٹن لوتھر اور دوسرے مذہبی رہنما پہلے ہی مذہبی رسومات کی کافی اصلاح کر چکے تھے اس لیے مذکورہ رسائل کو مذہبیات کے تذکرہ سے دور رکھا گیا۔ رسالہ تہذیب الاخلاق بھی بالکل اسی راہ پر گامزن ہونے کی مقصدیت سے بھرپور تھا۔ یوں تو اپنے ان مقاصد میں رسالہ نے کامیابی بھی حاصل کی اور اس رسالہ نے مسلمانوں کے ادبی، معاشرتی، مذہبی اور اخلاقی معیار کو رونما کرنے میں بھی مضبوط کردار ادا کیا لیکن اس کے اجرا میں کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ بالآخر سر سید نے اس رسالہ کے ذریعہ مسلمانوں میں تعلیم کا شوق بھی پیدا کیا اور اس کے ساتھ ساتھ تعلیم کی اہمیت وافادیت سے بھی روشناس کرایا۔ علاوہ ازیں اس رسالہ کی اشاعت کا مقصد امت میں سیاسی بیداری پیدا کرنا بھی تھا۔ اس کے علاوہ آپسی بھائی چارہ، تفریق کی مخالفت اور جہد مسلسل کی دعوت دینا بھی تھا۔ اس ضمن میں سر سید ایک جگہ خود لکھتے ہیں کہ:

> ''میرا ایک بڑا مقصد انگلستان کے طریقۂ تعلیم کو دیکھنا تا اور اس پر غور کرنا، چنانچہ اس غرض سے کیمبرج یونیورسٹی خود جا کر دیکھا اور بڑی اور چھوٹی چیز کو غور سے دیکھا۔ تمام نقشہ ذہن نشین کر لیا اور عام تعلیم پر غور کیا۔''

اس کے علاوہ ایک جگہ تحریر کرتے ہیں:

''اس پرچہ میں صرف مضامین مفیدہ جو مسلمانوں سے متعلق ہیں چھپے ہوتے ہیں مقصود اس پرچہ کے اجرا سے یہ ہے کہ مسلمانوں کے حسن معاشرت اور تہذیب کی ترقی ہو اور غلط اوہام مذہبی اس ترقی کے مانع ہیں اور درحقیقت وہ مذہب اسلام کے برخلاف ہیں وہ بھی مٹا وے جاویں۔''

مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ رسالہ کی اشاعت کا مقصد مسلمانوں کو تعلیمی اور تہذیبی پستی کی ذلت سے نکال کر قوموں کے شانہ بشانہ کھڑا کرنا اور پرانی فرسودہ مذہبی رسومات و تقلید کی طوق غلامی سے نجات دلانا تھا۔

9.3.4 اہمیت وافادیت

عزیز طلبا! یہ بات پہلے ہی عرض کی جاچکی ہے کہ سرسید کو اردو کا پہلا باقاعدہ مضمون نگار بھی مانا جاتا ہے۔ انھوں نے اردو میں سادہ زبان کو رواج دیا۔ نہ صرف اصلاح معاشرہ کے تئیں بلکہ صحافت کے لیے بھی ان کے رسالہ تہذیب الاخلاق نے نہایت اہم کردار ادا کیا۔ نیز یہ کہ تہذیب الاخلاق ادبی صحافت کے لیے بھی اہمیت کا حامل ہے۔

اصلاحی ادب میں اس رسالہ کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے سرسید کے رفیق الطاف حسین حالی ''حیات جاوید'' میں لکھتے ہیں کہ ''ان کا مقصد اپنے خیالات کو دوسروں تک پہنچانا ہوتا تھا'' یعنی اس رسالہ کی اہمیت سرسید کے خیالات کو دانشوران قوم تک پہنچانے کا ذریعہ بننے سے صاف ظاہر ہوتی ہے۔

رسالہ تہذیب الاخلاق کے مضامین سے اردو کے قاری ہی نہیں بلکہ مصنفین بھی ایک نئی راہ سے روشناس ہوئے۔ اس کے علاوہ ایسے ماحول میں جہاں زیادہ تر مصنفین انگریزی زبان و ادب سے ناآشنا تھے اور اردو کی نثر روایتی قصے کہانیوں سے آگے نہیں بڑھی تھی، اس کے علاوہ شاعری بھی صدیوں سے روایتی انداز میں کی جاتی رہی تھی، ایسی روایتی نثر نگاری اور شاعری کے دور میں سرسید نے اس رسالہ کو معاشرتی پرچہ بنانے کے ساتھ ساتھ سائنسی علوم کی جانب دلچسپی دلانے کا بھی ذریعہ بنایا۔ اتنا ہی نہیں اس رسالہ نے ہندوستان اور اردو میں جدید تعلیم کے راستے ہموار کیے، اس کے ساتھ ہی عوام میں جدید تعلیم کے حصول کا شعور پیدا ہوا۔ اس رسالہ کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اس کے ذریعہ قوم کے اندر عصری تعلیم کو حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا اور ہندوستان میں تعلیمی نظام کو جدید ممالک کے برابر لانے کی کوشش کی گئی۔ چونکہ اس وقت لوگ جدید تعلیم کے حصول کو ایمان میں خلل تصور کرتے تھے اور اسے عام خیال میں کفر سے تعبیر کیا جاتا تھا اس لیے اس رسالہ کے ذریعہ سرسید نے وہ راستہ دکھایا جس کو حاصل کر کے انسان زندگی کے اعلیٰ مقام تک پہنچ سکتا ہے۔

غرض یہ کہ اس رسالہ کی اشاعت سرسید احمد خاں کی حیات کا ایک خاص مشن تھا اور یہ اس نکتۂ نظر سے بھی نہایت اہم ہے کہ اس رسالہ کے ذریعہ سرسید احمد خاں نے اسلام کے متعلق پھیلی غلط فہمیوں کو دور کیا اور کلام پاک میں پیش واقعات کو جدید سائنسی علوم کی روشنی میں ثابت کیا۔ اور اللہ کی وحدانیت، کائنات کی تخلیق یا اس سے جڑی تمام چیزوں کو سچ ثابت کیا۔

9.3.5 تہذیب الاخلاق کے موضوعات

تہذیب الاخلاق کے موضوعات کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس کے مضامین کا انتخاب خود سرسید کرتے تھے اور اس کے مضمون نگاروں میں خود سرسید کا ایک خاص مقام تھا اور انھوں نے بذات خود اس رسالہ میں بہترین مضامین کے پرچے لکھے۔ سید عبداللہ لکھتے ہیں:

''یہ یاد رہے کہ سید صاحب کے سارے مضامین باقاعدہ Essay کی حد میں داخل نہیں ہوسکتے مگر مضامین میں کافی تعداد ایسی ہے جن کو اس صنف میں شامل کیا جاسکتا ہے۔''

مثلاً اس رسالہ کے مندرجہ ذیل مضامین:

تعصب، تعلیم و تربیت، کاہلی، اخلاق، ریا، مخالفت، خوشامد، بحث و تکرار، سویلزیشن، اپنی مدد آپ، سمجھ، گزرا ہوا زمانہ، امید کی خوشی، رسم و رواج کے نقصانات، عورتوں کے حقوق، انسان کے خیالات، آزادیٔ رائے، تربیت اطفال، سراب حیات، خودغرضی، قومی ہمدردی اور آخری پرچہ تہذیب الاخلاق۔

اس کے علاوہ اس رسالہ کے موضوعات میں عصری تعلیم کی جانب قوم کو متوجہ کرنا اور اصلاحی مضامین بطور خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ سرسید نے اس رسالہ کے موضوعات میں رسم و رواج، ہمدردی، آزادیٔ رائے، عورتوں کے حقوق، تعلیم یہاں تک کہ کھان پان، اخلاقیات کے موضوعات پر بھی مضامین لکھے، جن کا اصل مقصد مسلمانوں کو ایک مہذب اور مثالی قوم بنانا تھا۔ اتنا ہی نہیں انھوں نے اس رسالہ میں مذہب اسلام اور اسلامی تعلیمات کو سائنس کے نقطۂ نظر سے بھی سچ ثابت کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے سورۂ فیل، سورۂ جن وغیرہ سورتوں کی تفسیر بھی لکھی۔

تہذیب الاخلاق میں شامل مذہبی مضامین کے تعلق سے ڈاکٹر عبدالحیٔ لکھتے ہیں کہ:

''سرسید اپنے رسالے میں مذہبی امور پر گفتگو نہیں کرنا چاہتے تھے، مگر یہاں کی فضا نے انہیں مذہبی موضوعات پر لکھنے کے لیے مجبور کر دیا۔''

اس کے علاوہ اس رسالہ کے بیشتر مضامین میں سرسید نے تہذیب و ثقافت کے مباحث چھیڑے ہیں۔ اپنے آخرالذکر مضمون میں وہ آزادیٔ رائے، درستی عقائد مذہبی، خیالات و افعال مذہبی، صدق مقال، دوستوں سے راہ و رسم اور رسم کلام، لہجہ، طریق زندگی، صفائی، طرز لباس، طریق اکل و شرب، تدبیر منزل، غلامی، رسومات شادی، رسومات غمی، ترقی زراعت و تجارت کے تحت مسلمانوں کی تہذیبی و سماجی زندگی میں اصلاح احوال کی ضرورت و اہمیت کو واضح کیا۔

یہاں اس بات کا تذکرہ کرنا ناگزیر ہوگا کہ سرسید نے علمائے اسلام مثلاً امام غزالی اور شاہ ولی اللہ کے مضامین کے تراجم بھی تہذیب الاخلاق میں شائع کیے۔

مختصراً یہ کہ تہذیب الاخلاق کے خاص موضوعات میں مذہب، سماج، سیاست، اخلاقیات جیسے موضوعات بیشتر نظر آتے ہیں۔ اس طرح سرسید احمد خاں نے سیدالاخبار اور علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ سے جس علمی و ادبی صحافت کا آغاز کیا تھا وہ تہذیب الاخلاق کی صورت میں اپنا سنگ میل عبور کرتی نظر آئی۔

9.3.6 تہذیب الاخلاق کا انداز اور اسلوب

تہذیب الاخلاق کے اندازِ تحریر پر غور کیا جائے تو اس کے دور اول میں ۳۲۶ مضامین میں سے ۱۱۲، دورِ دوم کے ۶۷ مضامین میں سے ۲۳ر اور دور آخر کے تقریباً ۳۷ مضامین سرسید احمد خاں نے خود تحریر کیے جن کا انداز اصلاحی تھا۔ اس لحاظ سے سرسید کے تقریباً دو سو باون مضامین شائع ہو چکے ہیں، جن میں ان کے فکری و تہذیبی رجحانات کو بہ خوبی دیکھا جا سکتا ہے۔

سرسید کے نامور رفقاء کا نام اس رسالہ کے دیگر مضمون نگاروں میں سرفہرست ہے۔ ان سب کے مضامین کی نوعیت اور معیار کے بارے میں سید عبداللہ نے اپنی کتاب ''سرسید احمد خاں اور ان کے رفقاء کار کی اردو نثر کا فنی اور فکری جائزہ'' میں مختصر اور جامع تبصرہ کیا ہے۔ اس تناظر میں وہ رقم طراز ہیں:

> ''تہذیب الاخلاق کے مقالات عموماً مختصر ہوتے تھے، ان میں ایک خاص نقطۂ نظر بھی موجود ہوتا تھا مگر ان کا انداز بے حد متعین اور غیر دلچسپ تھا ان کے مضامین گہری مقصدیت کے غلاف میں ملفوف ہوتے تھے، جن میں شگفتگی اور رنگینی عموماً مفقود ہوتی تھی۔'' (عبداللہ، سید، ڈاکٹر، سرسید احمد خاں اور ان کے نامور رفقاء کی اردو نثر کا فنی جائزہ۔''

اگر یہ تحریر کیا جائے تو یقیناً درست ہوگا کہ سرسید احمد خاں کی پوری تحریک مقصدیت کے زیر اثر تھی اور اگر ادبی سطح پر اس کا مقام متعین کیا جائے تو ادب برائے مقصد کا محور کہنا قطعاً مبالغہ نہ ہوگا۔

علاوہ ازیں اگر اس رسالہ کے اسلوب تحریر کے حوالہ سے بات کی جائے تو مندرجہ ذیل اقتباس کو زیر غور رکھنا ضروری ہے جو کہ مولوی عبدالحق نے آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ ۱۴ر فروری ۱۹۴۱ء کے موقع پر خطاب کرتے ہوئے سرسید احمد خاں کے اسلوب نگارش کے بارے میں فرمایا:

> ''سرسید اردو کی حمایت کو اپنا بہت بڑا فرض اور اہم قومی خدمت سمجھتے تھے۔ ان کا ذوق ادب اتنا اچھا تھا کہ اگر وہ دوسرے بکھیڑوں میں نہ پڑ جاتے تو اردو کے بہت بڑے ادیب ہوتے۔''

مجموعی طور پر رسالہ تہذیب الاخلاق میں شائع مضامین کے تعلق سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کا اسلوب سادہ، بامقصد، جامع اور حقیقت حال کا عکاس تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ تحریریں نہ صرف موثر ہوتی تھیں بلکہ ان میں خلوص وصداقت بھی پائی جاتی تھی۔ بطور خاص اس رسالہ میں عام فہم اور سادہ نثر کے نمونے ملتے ہیں۔ مخصوص مقاصد کی تکمیل کے لیے تہذیب الاخلاق کے مصنفین کے ہاں بالعموم اور سرسید احمد خاں کے ہاں بالخصوص استدلالیت، عقلیت اور سائنس پسندی کا رجحان پایا جاتا ہے اور انہیں خدوخال میں تہذیب الاخلاق کا مجموعی اسلوب تشکیل پایا۔

تہذیب الاخلاق میں سرسید نے زبان و بیان اور اسلوب کے حوالے سے اپنا نقطۂ نظر واضح کر دیا ہے۔ وہ قدیم شعراء و ادبا کو ہدف تنقید بناتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''خیال بندی کا طریقہ اور تشبیہ واستعارہ کا قاعدہ ایسا خراب و ناقص پڑ گیا ہے جس سے ایک تعجب کو

طبیعت پر آتا ہے مگر اس کا اثر مطلق دل میں یا خصلت میں یا اس انسانی جذبہ میں جس سے وہ متعلق ہے کچھ بھی نہیں ہوتا۔''

مندرجہ بالا اقتباس کے سیاق وسباق کو دیکھا جائے تو سرسید کے مطابق ادب وانشا کا مقصد محض تفریح یا آرائش بیان نہیں ہے بلکہ وہ افادی نظریہ کے تحت معانی ومطالب کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ان کے نزدیک مضمون کو طرز ادا پر اولیت حاصل ہے۔حالی نے بھی حیات جاوید میں ان کے اسلوب اور مقصدیت کے حوالے سے انھیں ریفارمر قرار دیا ہے۔

غرض یہ کہ تہذیب الاخلاق کے مضامین میں فکر، زبان سادہ، سلیس، شستہ اور بیان موثر ہے اور اس رسالہ کے ذریعہ ان کی شخصیت میں ایک کامیاب صحافی ہونے کا پہلو بھی نمایاں طور پر نظر آتا ہے

9.4 ماحصل

تہذیب الاخلاق اردو زبان کا مشہور، مقبول، معاشرتی اور اصلاحی ماہنامہ ہے جسے سرسید احمد خاں نے انگلستان سے واپسی پر ۲۴ر دسمبر ۱۸۷۰ء کو علی گڑھ سے جاری کیا۔اس ماہنامہ کا انگریزی نام سوشل ریفارمر رکھا۔تہذیب الاخلاق کا لوگو کاغذ اور ٹائٹل سرسید لندن سے لائے تھے۔اس رسالہ کے بارے میں یہ طے نہیں تھا کہ رسالہ ماہانہ ہوگا یا پندرہ روزہ، اس لیے اس کے پہلے شمارہ میں وضاحت کردی گئی تھی کہ یہ پرچہ مہینہ میں ایک بار یا دو بار جیسا کہ مقتضائے مضامین ہوگا چھپا کرے گا۔

اس رسالہ میں تمام مضامین اردو میں چھپتے تھے۔آٹھ یا بارہ صفحات پر مشتمل یہ پرچہ چار آنے میں فروخت ہوتا تھا۔ اس کا مدعا مسلمانان ہند کو جدید تہذیب اور سائنس کے فیوض سے روشناس کرانا تھا تاکہ وہ تہذیب یافتہ اور ترقی یافتہ قوم بن سکیں۔۱۸۷۶ء میں یہ بند ہوا، چھ سال سات ماہ کی مدت میں کل ۲۲۶ مضامین شائع ہوئے، جن میں سے ۱۱۲ سرسید نے خود تحریر کیے۔تین سال بعد یہ پھر سے شروع ہوا لیکن صرف تین برس پانچ مہینہ تک ہی اس کا اجراء ممکن ہوسکا۔اس کے بعد یہ دوبارہ بند ہوگیا۔تقریباً تیرہ چودہ برس کے بعد اس کی اشاعت کا تیسرا دور شروع ہوا جو تین برس بعد پھر ختم ہوگیا۔اس پرچہ کی اشاعت کے ذریعہ سرسید قوم سے ہم کلام ہوئے اور اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل کرتے ہوئے انگریزی تعلیم کے حق میں رائے عامہ کو ہموار کیا اور محمڈن کالج کا قیام وجود میں آیا۔اس کے علاوہ سادہ وسلیس تحریر لکھنے کا رواج بھی عام ہوا جو کہ بامقصد بھی ہے۔مسلمانوں میں اخوت اور قومیت کا احساس بیدار ہوا۔۱۹۸۲ء میں ایک بار پھر اس کی اشاعت کا کام سید حامد (سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) کی کاوشوں سے وجود میں آیا جو کہ آج تک جاری ہے۔

اس پرچہ کی مقبولیت کے کئی اسباب تھے۔ پہلا سبب سرسید کی دلنشین تحریر اور سید مہدی علی کے آرٹیکل تھے۔ لوگوں میں یہ مشہور ہوگیا تھا کہ سرسید کی تحریر پڑھنے کے بعد انسان اپنے فرسودہ عقائد پر قائم نہیں رہ سکتا ہے۔اس رسالہ کی اشاعت کے نتیجہ میں کالج کے چندے کی رقم میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔اس کے علاوہ رسالہ میں سرسید کی کاوشوں کا

تذکرہ کیا جاتا تھا جس کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں مدرسۃ العلوم کی عظمت دن بہ دن بڑھتی چلی گئی حالاں کہ شروع میں تہذیب الاخلاق کی کافی مخالفت ہوئی اور اس رسالہ کو مات دینے کے لیے کانپور سے دو رسالوں کا اجرا امداد علی نے کیا، جن رسائل کا نام نور الآفاق اور نور انوار تھا۔ اس کے علاوہ اہل حدیث مکتب فکر والوں نے ایک رسالہ اشاعت السنہ بھی نکالا۔ سارے مسائل کا سامنا کرنے کے باوجود تہذیب الاخلاق ہندوستانی مسلمانوں میں کافی مقبول ہوا اور اس کی مقبولیت نے مخالفین کو بھی دھیرے دھیرے قائل کر دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ تہذیب الاخلاق کو اردو صحافت کا پہلا باب کہنا غلط نہ ہوگا اور اس کے بغیر اردو صحافت کا وجود ناممکن نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود سرسید مرحوم بھی اس رسالہ کو اپنی زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ گردانتے تھے۔ اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کے سادہ اور سلیس اسلوب تحریر اور قومی بیداری کے مقاصد کی وجہ سے آج مسلم قوم عصر حاضر کی تعلیم کے حصول کی خاطر سرگرداں ہوئی اور ساتھ ہی مذہبیات کا دامن بھی تھامے ہوئے ہے۔ جس کی ایک زندہ مثال علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا قیام ہے جو کہ آج تک سرسید احمد خاں اور ان کے رفقاء کے جذبات و جہد مسلسل کا ثبوت ہے۔ اس کے ساتھ ہی یونیورسٹی اپنی پر نور ضیاء سے قوم کے نونہالوں کا مستقبل روشن کرنے میں سرگرداں ہے۔

9.5 آپ نے کیا سیکھا؟

☆ آپ تہذیب الاخلاق کے اجرا اور پس منظر سے واقف ہوئے۔

☆ آپ تہذیب الاخلاق کے اغراض و مقاصد سے واقف ہوئے۔

☆ آپ تہذیب الاخلاق کی اہمیت اور افادیت سے آشنا ہوئے۔

☆ آپ تہذیب الاخلاق کے اہم موضوعات سے واقف ہوئے۔

☆ آپ تہذیب الاخلاق کے اسلوب اور طرز تحریر سے آشنا ہوئے۔

9.6 اپنا امتحان خود لیجیے

1۔ تہذیب الاخلاق کا اجرا کب ہوا اور اس نے کس طرز کی پیروی کی؟

2۔ تہذیب الاخلاق کی اشاعت کے بنیادی مقاصد پر روشنی ڈالیے۔

3۔ تہذیب الاخلاق کے اہم موضوعات پر گفتگو کیجیے۔

4۔ تہذیب الاخلاق کے انداز اور اسلوب پر تبصرہ کیجئے۔

9.7 سوالوں کے جوابات

1- جب سرسید سفر ولایت سے ۲/ اکتوبر ۱۸۷۰ء کو واپس ہندوستان آئے تو واپسی کے صرف ایک مہینہ ۲۲ دن بعد یکم شوال ۱۲۸۷ھ مطابق ۲۴/ دسمبر ۱۸۷۰ء انھوں نے تہذیب الاخلاق کا پہلا پرچہ شائع کیا۔ اس پرچہ کی اشاعت کے لیے سرسید نے اپنے دوستوں کے ساتھ ایک کمیٹی بھی بنائی جس میں طے پایا کہ تہذیب الاخلاق کے لیے ہر ممبر

سے ساٹھ روپیہ سالانہ اور عام خریدار سے ساڑھے چار روپیہ سالانہ لیا جائے گا۔ ان کا یہ فیصلہ اس رسالہ کی شہرت کے لیے ایک کامیاب قدم ثابت ہوا اور رسالہ کا باقاعدہ اجرا ہوا۔ اگر اس رسالہ کی تاریخ کی بات کی جائے تو اس کا پہلا شمارہ ۱۲۷۷ھ مطابق ۱۸۷۰ء کو شائع ہوا اور یہ پرچہ لگاتار چھ برس تک نکلتا رہا۔ ادارت کی ذمہ داری خود سرسید نے سنبھالی۔

2- اس رسالہ کے اجراء کا مقصد نئی تہذیب و تمدن سے روشناس کرانا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی عصری علوم وفنون کی جانب بھی قوم کی توجہ مبذول کرانا تھا۔ اس کے علاوہ اس رسالہ کی اشاعت کا مقصد یہ بھی تھا کہ اس بات کو ہندوستانی مسلمانوں کے ذہن نشین کیا جائے کہ اسلام ترقی اور تمدن کا دشمن نہیں ہے اور دنیا میں جو اور ترقی یافتہ اقوام ہیں ان کی ترقی سے مسلمان آگاہ ہوں اور غیر ضروری رسومات کی جانب سے ان کے دلوں میں نفرت پیدا ہو۔ اس رسالہ نے مسلمانوں کے ادبی، معاشرتی، مذہبی اور اخلاقی معیار کو رونما کرنے میں بھی مضبوط کردار ادا کیا ، سرسید نے اس رسالہ کے ذریعہ مسلمانوں میں تعلیم کا شوق بھی پیدا کیا اور اس کے ساتھ ساتھ تعلیم کی اہمیت وافادیت سے بھی روشناس کرایا۔ علاوہ ازیں اس رسالہ کی اشاعت کا مقصد امت میں سیاسی بیداری پیدا کرنا بھی تھا۔ اس کے علاوہ آپسی بھائی چارہ، تفریق کی مخالفت اور جہد مسلسل کی دعوت دینا بھی تھا۔ رسالہ کی اشاعت کا مقصد مسلمانوں کو تعلیمی اور تہذیبی پستی کی ذلت سے نکال کر قوموں کے شانہ بشانہ کھڑا کرنا اور پرانی فرسودہ مذہبی رسومات وتقلید کی طوق غلامی سے نجات دلانا تھا۔

3- رسالہ کے موضوعات میں عصری تعلیم کی جانب قوم کو متوجہ کرنا اور اصلاحی مضامین بطور خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ سرسید نے اس رسالہ کے موضوعات میں رسم ورواج، ہمدردی، آزادئ رائے، عورتوں کے حقوق، تعلیم یہاں تک کہ کھان پان، اخلاقیات کے موضوعات پر بھی مضامین لکھے، جن کا اصل مقصد مسلمانوں کو ایک مہذب اور مثالی قوم بنانا تھا۔ اتنا ہی نہیں انھوں نے اس رسالہ میں مذہب اسلام اور اسلامی تعلیمات کو سائنس کے نقطۂ نظر سے بھی سچ ثابت کرنے کی کوشش کی۔ اس کے علاوہ اس رسالہ کے بیشتر مضامین میں سرسید نے تہذیب وثقافت کے مباحثے چھیڑے ہیں۔ اپنے آخر الذکر مضمون میں وہ آزادئ رائے، درستی عقائد مذہبی، خیالات وافعال مذہبی، صدق مقال، دوستوں سے راہ ورسم اور رسم کلام، لہجہ، طریق زندگی، صفائی، طرز لباس، طریق اکل وشرب، تدبیر منزل، غلامی، رسومات شادی، رسومات غمی، ترقی زراعت وتجارت کے تحت مسلمانوں کی تہذیبی وسماجی زندگی میں اصلاح احوال کی ضرورت واہمیت کو واضح کیا۔

4- رسالہ تہذیب الاخلاق میں شائع مضامین کے تعلق سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کا اسلوب سادہ، بامقصد، جامع اور حقیقت حال کا عکاس تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ تحریریں نہ صرف موثر ہوتی تھیں بلکہ ان میں خلوص وصداقت بھی پائی جاتی تھی۔ بطور خاص اس رسالہ میں عام فہم اور سادہ نثر کے نمونے ملتے ہیں۔ مخصوص مقاصد کی تکمیل کے لیے تہذیب الاخلاق کے مصنفین کے ہاں بالعموم اور سرسید احمد خاں کے ہاں بالخصوص استدلالیت، عقلیت اور سائنس پسندی کا رجحان پایا جاتا ہے اور انہیں خدوخال میں تہذیب الاخلاق کا مجموعی اسلوب تشکیل پایا۔

9.8 فرہنگ

آباواجداد	باپ دادا	منفرد	انوکھا
عصری	موجودہ زمانے کے	دانشمند	عقل مند
معزز	عزت دار	عروج	انتہا، بلندی
اشخاص	شخص کی جمع	فلاح و بہبود	کامیابی
راغب کرنا	ابھارنا	اشاعت	چھپنا
رفع ہونا	دور ہونا		

9.9 کتب برائے مطالعہ

سرسیداوران کے نامور رفقاء، سید عبداللہ

سرسیداوران کا عہد، ثریا حسین

اردوادب کی تحریکیں، انور سدید

علی گڑھ تحریک آغاز تا امروز

بلاک 3 سرسید احمد خاں کی علمی، ادبی و سیاسی خدمات

اکائی ۱۰: سرسید احمد خاں کا تصور تعلیم

اکائی ۱۱: سرسید احمد خاں کا تصور شعر و ادب

اکائی ۱۲: سرسید احمد خاں کی سیاسی و سماجی خدمات کا جائزہ

اکائی ۱۰ سر سید احمد خاں کا تصور تعلیم

اکائی کی ساخت

10.1 اغراض و مقاصد

10.2 تمہید

10.3 سر سید احمد خاں کا تصور تعلیم

10.3.1 سر سید کی حیات و خدمات

10.3.2 پس منظر

10.3.3 تصور تعلیم اور تعلیمی کاوشیں

10.3.4 سر سید کا دانشمندانہ نظریہ مفاہمت مابین اساتذہ وطلبہ

10.3.5 سر سید کی انشا پردازی اور اہم تصانیف

10.4 ماحصل

10.5 آپ نے کیا سیکھا

10.6 اپنا امتحان خود لیجیے

10.7 سوالوں کے جوابات

10.8 فرہنگ

10.9 کتب برائے مطالعہ

10.1 اغراض و مقاصد

1۔ طلبہ عہد سر سید کے تعلیمی پس منظر سے واقف ہوں گے۔

2۔ طلبہ ہندوستان میں موجود تعلیمی تصور سے واقف ہوں گے۔

3۔ طلبہ کو مغربی تصور تعلیم کا علم ہوگا۔

4۔ طلبہ سر سید کے تعلیمی تصور سے مکمل واقفیت حاصل کریں گے۔

10.2 تمہید

عزیز طلبا جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ ۱۹ویں صدی کا زمانہ مذہبی اور سماجی اصلاحار کا دور تھا اور اس دور میں راجہ رام موہن رائے اور دیانند سرسوتی جیسے دانشور ہندوستانی عوام کی پریشانیوں کے حل کے لیے کوشاں تھے۔ کشمکش کے اس عہد میں سر سید احمد خاں کی شخصیت ایک منادیٔ نور کی مانند سامنے آئی۔ سر سید ایک فرد ہی نہیں بلکہ ایک انجمن تھے۔ وہ کثیر الجہت شخصیت کے مالک تھے۔ انھیں نہ صرف ماہر تعلیم بلکہ مورخ، قانون داں، مفسر قرآن، عظیم مصلح، مصنف اور صحافی ہونے کا بھی اعزاز حاصل ہے۔

یوں تو سماجی اصلاح اور حصول تعلیم کے لیے انھوں نے کئی قدم اٹھائے لیکن ۱۸۶۹ء میں سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد اور کئی انگریزی کتب کا اردو میں ترجمہ ان کی شخصیت کو منفرد مقام عطا کرتا ہے۔ بیداریٔ قوم کے لیے انھوں نے رسالہ تہذیب الاخلاق شائع کیا اور اس کے ساتھ ساتھ آثارالصنادید، اسباب بغاوت ہند اور خطبات احمدیہ ان کی مشہور تصانیف ہیں۔

اس اکائی میں آپ سرسید احمد خاں کے بارے میں تفصیل سے پڑھیں گے اور ان کے اصلاحی سفر کے پس منظر کا بھی مطالعہ کریں گے۔ اس کے علاوہ ان کی حیات وخدمات اور تعلیمی اصلاحات کے متعلق اقدامات کا تفصیلی جائزہ لیں گے۔ بطور خاص اس اکائی میں سرسید احمد خاں کے تصور تعلیم کا مطالعہ کرنے کا موقعہ فراہم کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اکائی کا ماحصل اور اپنی جانچ آپ، آپ نے کیا سیکھا کو بھی شمولیت دی گئی ہے۔ فرہنگ میں نئے الفاظ کے معنی اور مزید مطالعہ کے لیے امدادی کتب کی فہرست اکائی کے آخر میں فراہم کی گئی ہے۔

10.3 سرسید احمد خاں کا تصور تعلیم

10.1.3 سرسید کی حیات وخدمات

عزیز طلبا! سرسید احمد خاں کی پوری زندگی علم وعمل کی عبارت ہے۔ وہ ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ اگر ہم ان کی زندگی کا جائزہ لیں تو وہ دہلی کے ایک معزز خاندان کے چشم وچراغ تھے اور ان کے آباواجداد مغل بادشاہ 'شاہ جہاں' کے عہد میں ہرات سے ہندوستان آئے اور شاہی حکومت میں اہم مناصب پر فائز رہے۔

سرسید احمد خان کی پیدائش ۱۷/اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں ہوئی۔ ان کا پورا نام احمد تقوی بن سید محمد متقی تھا۔ اس وقت اکبرشاہ دہلی میں برسرِ اقتدار تھا اور سلطنت کی معاشی صورت حال ابتر تھی۔ یہ وہ عہد تھا جبکہ یورپی تہذیب کے اثر سے جو تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں اس کی وجہ سے قدیم وجدید نظریات کی کشمکش کسی حد تک عمل میں آچکی تھی۔ انتشار کے اس زمانہ میں بھی دہلی میں ادب اور دوسرے علوم کی ترقی ہوئی۔ حالانکہ مغل تاجداروں کو سیاسی شکست کا منہ دیکھنا پڑ رہا تھا۔ پھر بھی ان کی اعلیٰ تہذیبی قدریں پامال نہ ہوسکیں اور سرسید بھی اسی تہذیبی روایت کی جیتی جاگتی مثال تھے۔

سرسید کے دادا کا نام سید ہادی اور والد کا نام سید متقی تھا۔ دادا کی خدمات کے سبب عالمگیر ثانی نے انہیں جوادعلی خاں کے خطاب سے نوازا تھا۔ اتنا ہی نہیں کچھ عرصہ بعد قاضیٔ لشکر اور عہدۂ احتساب بھی ان کے سپرد کردیا۔ سرسید کے والد سید متقی کو بادشاہ وقت سے خصوصی قرب حاصل تھا، نیز یہ کہ وہ بلا کسی روک ٹوک بادشاہ کے دربار میں جاسکتے تھے لیکن وہ ایک درویش صفت شخصیت کے مالک تھے اور شاہ غلام علی سے بیعت بھی تھے۔ یہاں تک کہ انھوں نے سرسید کی رسم بسم اللہ انہیں سے کروائی تھی۔

سرسید کا بچپن اپنے ننھیال اور شاہ غلام علی کی صحبت میں گزرا۔ سرسید کے نانا خواجہ فریدالدین احمد مشہور عالم تھے اور علم ریاضی پر انہیں خاص دسترس حاصل تھی۔ خواجہ صاحب کا ذاتی کتب خانہ بھی تھا۔ سرسید احمد خاں کی والدہ کا نام عزیزالنساء بیگم تھا۔ وہ نہایت ہی دوراندیش اور رحم دل خاتون تھیں۔ ابھی سرسید کم سن ہی تھے کہ ان کے والد کا سایہ سر

سے اٹھ گیا، جس کے نتیجہ میں ان کی تعلیم وتربیت کی پوری ذمہ داری ان کی والدہ کے نازک کندھوں پر آپڑی۔

ابتدائی تعلیم کے بعد سرسید نے علوم متداولہ کی تحصیل کی۔انہیں بچپن سے ہی حصول علم سے گہرا لگاؤ تھا۔تاریخ،علم ریاضی اور فلسفہ ان کے محبوب مضامین تھے۔اس کے ساتھ ساتھ قلعہ معلیٰ سے روابط کے سبب آداب شاہی کا بھی خاص خیال رکھتے تھے۔

جب حصول معاش کا مسئلہ سامنے آیا تو بادشاہ وقت سے قربت اور عزیزوں کی مخالفت کے باوجود ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت کو ترجیح دی۔سرسید کی پہلی ملازمت آگرہ کی عدالت میں نائب منشی کے طور پر ملی۔اور پھر اپنی محنت سے ترقی پاتے رہے۔مین پوری اور فتح پور سیکری میں بھی اپنی خدمات انجام دیں۔دہلی میں صدر امین ہوئے اس کے بعد اسی عہدہ پر بجنور میں فائز ہوئے اور بعد میں مراد آباد میں صدر الصدور کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دیں،جس کی بدولت عوام میں کافی مقبول ہوئے۔اپنی شہرت کی بدولت...... میں برطانوی حکومت سے 'سر' کا خطاب حاصل کیا۔اس خطاب کو پانا کسی ہندوستانی کے لیے معراج کمال تک پہنچنے کے مترادف تھا۔

سرسید نے ملازمت کے زمانہ میں بھی فرایض منصبی کے ساتھ ساتھ علمی سرگرمیاں بھی جاری رکھیں۔سرسید ایک عظیم مفکر اور جامع تصور تعلیم کے حامی تھے۔تعلیم کے لیے اٹھائے گئے ان کے اقدامات کی ایک درخشاں وتابندہ مثال مدرسۃ العلوم کا قیام ہے جو کہ ترقی کر کے پہلے محمدن اینگلو اورینٹل کالج اور پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شکل میں وجود میں آیا اور اس منارۂ نور کی ضیا پاشی سے ہم آپ سب واقف ہیں۔

اردو کی نئی علمی نثر کی بنیاد ڈالنے کے ساتھ ساتھ سرسید نے اردو میں مختصر مضمون نگاری کو فروغ دیا۔لمبی تحریر کے بجائے چند صفات میں کام کی باتیں کرنے کا فن سرسید نے عام کیا۔ان کے نثر میں جو وزن اور وقار ہے وہ ان کی شخصیت کا آئینہ دار ہے۔قوم کو منور کرتا ہوا یہ تابناک ستارہ قوم کو جلا بخشتے ہوئے ۱۸۹۸ء کو ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا یعنی سرسید جیسے مجدد ۲۷/مارچ ۱۸۹۸ء کو علی گڑھ میں اپنے مالک حقیقی سے جا ملے اور اسی کے ساتھ اصلاح معاشرہ کا ایک دور اختتام پذیر ہو گیا۔

10.3.2 پس منظر

عزیز طلبا! جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ جتنی اہمیت حصول تعلیم کی ہے اتنی ہی اہمیت نظام تعلیم کی بھی ہے اور یہ عرصۂ دراز سے محققین کے لیے ایک اہم موضوع رہا ہے۔وقت کے لحاظ سے تصور تعلیم بدلتا رہا ہے اور اسی سبب ماہرین تعلیم اپنے افکار اور کاوشوں سے اس میں اصلاح کرتے آئے ہیں۔سرسید احمد خاں نے قوم کی زبوں حالی کے حالات میں جدید علوم کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے قوم وملت کو پستی سے نکالنے میں ایک نمایاں کردار ادا کیا اور اصلاح معاشرہ میں نظریۂ تعلیم کا ایک منفرد انداز قوم کے سامنے پیش کای تا کہ ملت اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل کر سکے اور کسی کی دست نگر نہ ہو۔

جس وقت سرسید احمد خاں نے تعلیم کی اہمیت اور عصری علوم کے حصول پر زور دیا اس وقت کے سماجی اور ملکی حالات کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔آیئے ہم اس وقت کے حالات کا ایک مختصر جائزہ لیتے ہیں۔

۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب کی وفات کے بعد سلطنت مغلیہ زوال پذیر ہوگئی، جس کی متعدد وجوہات ہیں۔ اور اس سلطنت کے خاتمہ میں تقریباً ایک سو پچاس سال لگے، جس کا آخری ایک تہائی حصہ انیسویں صدی پر مشتمل ہے، جس میں شاہ عالم، اکبر شاہ ثانی، بہادر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر کی حکومت تھی۔ ۱۸۵۷ء میں بہادر شاہ ظفر کو بغاوت کے لیے موردالزام ٹھہرا کر رنگون میں قید کر دیا گیا۔ جہاں چند سال بعد ان کا انتقال ہوگیا اور وہیں سپرد خاک کر دیے گئے۔ مغلیہ حکومت کا آخری دور نہایت ہی دردناک تھا، جاں نثاروں اور شہزادوں کا نہایت ہی بے رحمی سے خون بہایا جا رہا تھا۔ انیسویں صدی میں مغلیہ حکومت کے زوال کے ساتھ ہی انگریزی حکومت مستحکم ہوگئی اور ہندوستانی تہذیب وتمدن کی بقا پر خطرہ نظر آنے لگا۔ جہاں ہندوستانی افراد اپنی جان بچانے کے لیے کوشاں تھے وہاں حصول معاش کا تصور جو ایک سراب کی مانند نظر آرہا تھا، ان حالات میں اردو زبان کی ترقی کا واحد راستہ فورٹ ولیم کالج کے قیام کے ساتھ شروع ہوا۔ ۱۸۰۱ء میں فورٹ ولیم کالج کا وجود عمل میں آیا اور اس کے ساتھ ہی نثری سرمایہ اردو زبان میں فراہم ہونا شروع ہوا۔

فورٹ ولیم کالج میں اردو نے جو ترقی کی اس کا اصل مقصد عام لوگوں تک اردو کو پہنچانا تھا یعنی اردو کو عوامی زبان بنانے کے لیے اقدامات اٹھائے جا رہے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ فورٹ ولیم کالج میں انگریز افسران کو اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے کارکنان کو اردو زبان سے واقفیت کا موقعہ فراہم کرنا تھا۔ انیسویں صدی تک تعلیم کا انتظام سرکاری طور پر بہت کم نظر آتا تھا۔ لوگ اپنی تعلیم کے لیے بذات خود معلم کا اہتمام کرتے تھے اور گھریلو مکتب قائم کیے جاتے تھے۔

10.3.3 تصور تعلیم اور تعلیمی کاوشیں

سرکاری طور پر تعلیم کے لیے دو ادارے وجود میں آئے: ایک دلی کالج اور دوسرا فورٹ ولیم کالج۔ فورٹ ولیم کالج میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے کارکنان کو ہندوستانی زبان سکھائی جاتی تھی۔ لیکن سرسید اور ان کے رفقاء نے اردو کو دنیا کی بڑی زبانوں کی قطار میں جگہ دلوا دی جو کہ سرکاری زبان کا درجہ حاصل کرنے میں کامیاب رہی۔

بڑے زمیندار اور صاحب حیثیت اشخاص اپنے بچوں کی تعلیم کا اہتمام کرتے تھے جو کہ اعلیٰ تعلیم کے بچوں کے لیے ہی محدود تھا لیکن جب منصب داروں پر زوال آیا اور اقتصادی حالات ابتر ہونے لگے تو گھریلو مکتب بھی دھیرے دھیرے خاتمہ کی جانب بڑھنے لگے اور تعلیم کی یہ کمی بطور خاص مسلمانوں پر اثر انداز ہوئی۔ ان حالات میں سرسید احمد خاں نے قدیم نظام تعلیم وتدریس کا جائزہ لیا اور اس کے متعلق لکھتے ہیں:

> ’’شاید بچوں اور دیہاتی مکتبوں کے لیے یہ کتابیں کارآمد ہوں لیکن قومی، اخلاقی درستگی اور قومی تربیت کے لائق نہیں ہیں۔‘‘ (شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، مقالات سرسید)

حالانکہ سرسید کو اس دور میں رائج دینی علوم فنون کی اہمیت کا بھی اندازہ تھا لیکن اس کے طریقۂ کار کو زمانۂ حال کے مطابق ڈھال دینے کے خواہاں تھے۔ اس ضمن میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ’’تعصب کو چھوڑ دیں اور بعد میں تحقیق اور مباحثہ کے سلسلۂ تعلیم مسلمانوں کا ایسا قائم کریں جوان

کے دین ودنیا کے لیے مفید ہو۔'' (شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، مقالات سرسید)

نیز یہ کہ سرسید نہ صرف حصول تعلیم کو عصر حاضر کے مطابق چاہتے تھے بلکہ قوم وملت کے اندر عصری علوم کے تئیں رغبت پیدا کر دینا چاہتے تھے۔ سرسید پہلے شخص تھے جنھوں نے انفرادی تعلیم کے مقابلہ میں قومی تعلیم کا تصور پیش کیا۔ اتنا ہی نہیں سرسید تعلیمی انتظام کو بھی اپنی قوم کے ہاتھ میں رکھنے کے خواہاں تھے۔ حالانکہ انگریزی حکومت کے ذریعہ اس وقت کئی یونیورسٹیوں کا قیام عمل میں آیا تھا۔ پھر بھی سرسید کے نزدیک وہ طریقۂ تعلیم تہذیبی نشوونما کے لیے ناکافی تھا۔ قومی تعلیم کا تصور انفرادیت کا حامل تھا جس کے نتیجہ میں قوم ترقی کی جانب گامزن ہوئی۔ اپنی اس فکر کو ایک جگہ سرسید نے کچھ اس طرح سے رقم کیا ہے:

> ''جس وقت اولاد کی تربیت کا ذکر آتا ہے تو رشتوں اور دولت مندوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ہم اپنی اولاد کی تعلیم خاص اپنے انتقام سے ہر ایک علم کے عالم کو نوکر رکھ کر بخوبی کر سکتے ہیں۔ بعضوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ہمیں اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت کی فکر کرنی کافی ہے۔ مگر یہ ایک بڑی غلطی ہے اور خود اولاد کے ساتھ دشمنی کرنی ہے۔ جب تک تمام شہر اس بد ہوا سے پاک نہ ہو، ایک گھر اپنے تئیں اس سے بچ نہیں سکتا۔'' (علی گڑھ میگزین)

نصاب کے متعلق ان کا نظریہ یہ تھا کہ نصاب دو طرح کے ہوں: عمومی اور خصوصی۔ سرسید نے تعلیم سے متعلق طریقۂ تدریس اور نصاب میں شمولیت رکھنے والے اجزاء کے بارے میں پوری تفصیل ''ترقی تعلیم مسلمانان ہند'' میں پیش کی ہے۔

عمومی نصاب میں دینیات، فقہ، اصول فقہ، حدیث، اصول حدیث، تفسیر، اصول تفسیر، علم سیرت، علم عقائد، ادب، اردو، فارسی، عربی، انگریزی، لاطینی، تاریخ، جغرافیہ، علم اخلاق، علم عضویات، منطق، فلسفہ، اصول حکمت، سیاسی اقتصادیات، ریاضی، حساب البحر، اعلیٰ ریاضی، طبعیات، علم سکوتیات، علم حرکیات، علم آب، ماحولیاتی سائنس، بجلی ای توانائی، علم نجوم، آواز، حرارت اور فلسفۂ فطرت اور خصوصی نصاب میں انجینئرنگ، جانوروں کا علم عضویات، علم تشریح ابدان (Anotomy)، علم حیوانیات، علم نباتات، علم ارضیات، علم معدنیات اور علم کیمیا جیسے مضامین کی شمولیت کی تجویز پیش کی۔ اس کے لیے سرسید نے ۱۸۷۵ء میں مدرستہ العلوم کی بنیاد ڈالی جس نے ۱۸۷۷ء میں ایم اے او کالج کی شکل میں شناخت حاصل کی اور ۱۹۳۰ء میں یہ مسلم یونیورسٹی بن گئی۔ سرسید نے انتخاب کرتے وقت مدرستہ العلوم کے طور پر تین کالج تجویز کیے تھے۔ ایک انگریزی کے لیے، دوسرا اردو کے لیے اور تیسرا عربی و فارسی کے لیے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ انگریزی کالج میں سارے جدید مضامین انگریزی میں پڑھائے جائیں لیکن لاطینی زبان طلبہ کے لیے لازم ہو۔

دوسری زبان کے طور پر اردو، فارسی یا عربی کے علاوہ کالج کا ہر طالب علم علم فقہ، اسلامی احادیث اور اسلامی اصولوں پر مختصر کتاب اردو میں پڑھے۔ سرسید نے اپنے صحیح مقصد تعلیم کے تصور کو جلا بخشتے ہوئے اپنے اس نظریہ کو پیش کیا کہ جو طلبہ سرکاری ملازمت کرنا چاہے ہیں انہیں اس کے بعد موقعہ مل جائے گا۔ دوسرا یہ کہ اس نصاب سے عالم و فاضل طلبا بھی انگریزی زبان کی عمدہ لیاقت رکھتے ہوں گے اس کے علاوہ وہ انگریزی زبان کا اردو ترجمہ کرنے کی بھی اہلیت رکھتے ہوں

گے اور یہ طلبا جدید علوم کو ملک میں عام کریں گے۔

اپنی تجویز میں سرسید نے دوسرے کالج میں سارے مضامین اردو میں پڑھانے کے لیے کہا۔اس کالج میں ہر طالب علم کو عربی، فارسی یا انگریزی میں سے دوسری زبان کے طور پر ایک زبان لینی لازمی ہوگی۔تا کہ طلبا کی گرفت زبان پر ہو اور ان کو نوکری آسانی کے ساتھ مل جائے۔

مجوزہ طور پر تیسرا کالج عربی اور فارسی ادب کی اعلیٰ تعلیم کے لیے ہو اور یہ کالج ان طلباء کے لیے ہو جو جدید علوم کی تعلیم اردو زبان میں حاصل کر کے فارسی یا عربی ادب میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

ان تینوں کے علاوہ کھیل کود کے استعمال کو بھی سرسید احمد خاں نے لازمی قرار دیا۔سرسید احمد خاں کا نظریہ صرف ڈگری حاصل کر کے قوم کو نوکری کے حصول کی جانب گامزن کرنا نہیں تھا بلکہ ان کا مقصد ایک اعلیٰ تہذیب یافتہ اور متمدن قوم کا وجود تھا۔اور یہ خواب انھوں نے جاتی ہوئی آنکھوں سے دیکھا، جس کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے انھوں نے خاطر خواہ کاوشیں کیں۔

حصول تعلیم کے ساتھ ساتھ طلبہ کی تربیت پر بھی انھوں نے بہت زور دیا اور اس جانب اشارہ کرتے ہوئے ایک جگہ فرماتے ہیں:

> ''تعلیم و تربیت دو متفرق چیزیں ہیں، اس کو ہم معنی سمجھنا ایک قسم کی بھول ہے یعنی جو کچھ انسان میں ہے اس کو باہر نکالنا انسان کو تعلیم دینا ہے اور اس کو کسی لائق کر دینا اس کی تربیت ہے۔''

عزیز طلبا! جب سرسید انگلستان سے واپس آئے تو ان کے خیالات و افکار میں مسلمانوں کے حال اور مستقبل کو بہترین بنانے کا عکس نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔وہ مسلمانوں کی سماجی اور ذہنی حالت میں تیز رفتار تبدیلی کے آرزومند تھے۔اس کے ساتھ ساتھ انگلستان کا یہ اصول ان کے ذہن و دل پر نقش ہو چکا تھا کہ تعلیم و تحقیق کسی قوم کی ترقی کی ضامن ہے۔جہاں ایک جانب تعلیم سے ان کی مراد جدید مغربی علوم بشمول سائنس تھی، وہیں دوسری جانب مشرقی تعلیم کی اہمیت و افادیت کا بھی خاطر خواہ ذکر کیا ہے۔ایک جگہ فرماتے ہیں:

> ''اس کے ساتھ ہم کو عربی کی تعلیم دینے کی ضرورت ہے جو قطع نظر اس کے وہ مسلمانوں کی زبان ہے، ایک ایسی اعلیٰ درجہ کی زبان ہے جس کی قدر کی جاسکتی ہے اور کسی طرح علمی زبان کے دائرہ سے علیحدہ نہیں رہ سکتی۔''

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ سرسید احمد خاں نے حالات کی نزاکت کو محسوس کر کے اس خیال کی ترویج کی کہ روایتی تعلیم سے قوم کچھ خاص فائدہ حاصل نہ کر سکے گی اور انگریزی تعلیم کے حصول کی اہمیت کو قوم کی ترقی کے لیے لازمی قرار دیا۔حالانکہ مسلمانوں کے بعض علما نے انگریزی تعلیم کی سخت مخالفت کی اور سرسید کو تنقید کا نشانہ بنایا اس کے باوجود انھوں نے اپنے تعلیمی مشن کو آگے بڑھاتے ہوئے کالج اور یونیورسٹی کا قیام کیا۔

یہاں ایک بات کا ذکر کرنا ناگزیر ہوگا کہ دہلی کالج کی ورنا کلر ٹرانسلیشن سوسائٹی نے جدید علوم کی کتابوں کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنے کا کام انجام دیا لیکن بے وقت کالج بند ہو جانے سے یہ کام ادھورا رہ گیا تھا۔لیکن سرسید کے ذہن

میں اس یونیورسٹی کا خاکہ موجود تھا اور اس مقصد کے تحت انھوں نے غازی پور میں اپنے قیام کے دوران ۹ رجنوری ۱۸۶۹ء کو سائنٹفک سوسائٹی قائم کی جو کہ بعد میں علی گڑھ منتقل ہوگئی۔ اس سوسائٹی نے تقریباً چالیس کتابوں کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرایا ہے۔

سرسید کا برطانیہ سے لوٹنے کے بعد کا نظریہ تبدیل تھا۔ وہ اردو کے بجائے انگریزی کو ذریعۂ تعلیم کے طور پر اپنانے پر زور دیتے تھے۔ اپنے اس موقف کی تائید میں وہ کہتے ہیں کہ:

> ''تمام علوم کو اردو میں منتقل نہیں کیا جا سکتا جب کہ جدید علوم کو حاصل کرنا ناگزیر ہوگیا ہے۔ دوسرے یہ کہ حکمرانوں کی زبان انگریزی ہے، تیسرے یہ کہ راجہ رام موہن رائے کی قیادت میں برادران وطن انگریزی زبان کی طرف پوری طرح متوجہ ہوگئے ہیں اور وہ مسلمانوں سے آگے بڑھ چکے ہیں۔''

عورتوں کی تعلیم کے سلسلہ میں سرسید کا کہنا تھا کہ مرد جب تک تعلیم یافتہ نہ ہوں، عورتوں کی تعلیم کی طرف توجہ نہیں دی جا سکتی ہے۔ لہٰذا بعض ناقدین نے ان کو تعلیم نسواں کے خلاف تصور کیا ہے جو کہ صحیح نہیں۔

10.3.4 سرسید کا دانشمندانہ نظریۂ مفاہمت مابین اساتذہ وطلبا

سرسید احمد خاں طلبا کی زندگی میں جہاں نظم وضبط کی اہمیت پر انتہائی زور دیتے ہیں وہیں اساتذہ کا بلند مقام اور مرتبہ کی اہمیت طلبا کے دلوں میں پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے مطابق اساتذہ کا احترام طالب علم کی ترقی کا باعث ہوتا ہے۔ اور ان کے نظریہ کے مطابق استاد مدرسہ کی روح ہوتا ہے۔ وہیں دوسری جانب سرسید اساتذہ کو بھی نصیحت کرتے ہیں کہ وہ بھی طلبا کے ساتھ شفقت کا رویہ اپنائیں۔

سرسید کے اس خیال کی تصدیق کرتے ہوئے مولوی عبداللہ انصاری لکھتے ہیں:

> ''ان کو اس بات پر بھی توجہ کرنی چاہیے کہ ان کا ادب اور ان کی محبت طالب علم کے دل میں پیدا ہو اور یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب کہ وہ خود طلبا کے ساتھ اخلاق و محبت سے پیش آئیں اور انھیں کو اخلاق و محبت طالب علم کی ہدایت اور ان میں نیک دل پیدا ہونے کا ذریعہ ہوگا۔'' (شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، مکتوبات سرسید)

لہٰذا مولوی عبداللہ انصاری کے اس اقتباس کو سرسید نے اپنے مکتوبات میں خاص جگہ دی ہے۔

10.3.5 سرسید احمد خاں کی انشا پردازی اور اہم تصانیف

سرسید نے قوم کی ترقی کی خاطر کئی اہم تصانیف رقم کی ہیں۔ یوں تو انھوں نے کم عمری سے ہی لکھنا شروع کردیا تھا اور یہ سلسلہ وفات کے نو دن پہلے تک چلتا رہا۔

سرسید کی پہلی کتاب رسالہ ''جلاء القلوب بذکر المحبوب'' ہے۔ انھوں نے اپنے مضامین کا آغاز اپنے بڑے بھائی

کے اخبار سید الاخبار سے کیا اور آخری مضمون ''تہذیب الاخلاق'' میں اردو کی حمایت میں لکھا تھا۔ یوں تو سرسید نے تقریباً ہر موضوع پر قلم اٹھایا لیکن تاریخ کی تین اہم کتابوں: ''آئین اکبری''، ''تاریخ فیروز شاہی'' اور ''تذکرہ جہانگیری'' کو مرتب کرنا خود میں ایک تاریخ ہے۔

اس کے علاوہ انھوں نے دہلی کی عمارتوں کا تفصیلی جائزہ ''آثار الصنادید'' میں لیا ہے۔ انقلاب ۱۸۵۷ء کے تعلق سے ''تاریخ سرکشی بجنور'' اور ''اسباب بغاوت ہند'' تحریر کی۔ علاوہ ازیں سرسید احمد خاں نے مذہبیات پر بھی کئی کتب لکھیں، جن میں تفسیر القرآن، تفسیر انجیل (تبئین الکلام)، خطبات احمدیہ، ابطال غلامی اور احکام طعام اہل کتاب وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس طرح کل ملا کر چالیس سے زیادہ کتب سرسید نے تحریر کی ہیں۔

ادب کی بات کی جائے تو باضابطہ طور پر ایسی کوئی تصنیف سرسید کے قلم سے نہیں ملتی ہے۔ البتہ اخبار سائنٹفک سوسائٹی جو کہ بعد میں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے نام سے مشہور ہوا اور تہذیب الاخلاق میں شائع ان کے انشائیوں سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اردو زبان، اسلوب اور نثر کو خود سرسید اور ان کی تحریک نے کس قدر متاثر کیا ہے۔ غرض یہ کہ وہ ایک بلند پایہ نثر نگار اور انشا پرداز بھی تھے۔ ان کی وفات کے بعد اصلاحی تحریروں کا سلسلہ قدرے کم ہو گیا جو کہ یقیناً نثری ادب کا ایک ناقابل تلافی نقصان تصور کیا جاتا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ سرسید احمد خاں کا ہر قدم قوم کو پستی اور زبوں حالی سے باہر نکالتا تھا۔ ان کے ذریعہ پیش کردہ نظام تعلیم کا مقصد قوم کی ترقی اور تہذیب وتمدن کی عمدہ مثال پیش کرتا تھا۔ چونکہ وہ انگریزوں کے ذریعہ مہیا کی گئی تعلیم کو ادھوری تصور کرتے تھے اور ان کے مقاصد ہندوستانی قوم کے مخالف خیال کرتے تھے اس لیے ان کا نظریہ تھا کہ تعلیم دین ودنیا دونوں کے لیے مفید ہو۔ اس کے علاوہ وہ مفت اور لازمی تعلیم کے حامی تھے۔

یہاں سرسید کا آخری خطبہ پڑھ کر اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے اندر قوم کے تئیں کتنی تڑپ تھی، جس کے نتیجہ میں انھوں نے اپنی پوری زندگی قوم کے نام وقف کردی۔ خطبہ کے الفاظ مندرجہ ذیل ہیں:

> ''اے دوستو! تمہاری اولاد تمہارے پاس خدا کی امانت ہے اور خدا نے تم کو ان کا امانت دار اور ولی مربی بنایا ہے۔ پس جو جو ہر خدا نے تمہاری اولاد میں رکھے ہیں اگر ان کو تعلیم وتربیت دے کر روشن نہ کروگے تو خدا کی امانت کے تم جواب دہ ہوگے اور ان معصوم بچوں کی آئندہ زندگی کو خراب اور برباد کرنے والے ہوگے۔'' (شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، خطبات سرسید)

10.4 ماحصل

سرسید احمد خاں ۱۷/اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کا شجرۂ نسب امام محمد تقی سے جا کر ملتا ہے۔ ان کے مورث اعلیٰ ہرات سے ہندوستان آکر دہلی میں آباد ہوئے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم روایتی انداز میں حاصل کی۔ ان کے والد کا نام سید متقی اور والدہ کا نام عزیز النساء بیگم تھا۔ سرسید نے خاندان کی مخالفت کے باوجود انگریزی گورنمنٹ کی نوکری کی اور قلعہ سے اپنا تعلق محدود کرلیا۔ اور ۱۸۳۹ء میں نائب منشی کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ۱۸۴۰ء میں سرسید نے ایک

رسالہ جام جم کے نام سے شائع کیا، جس میں امیر تیمور سے بہادر شاہ ظفر تک کے سارے حالات قلمبند کیے۔ جنوری ۱۸۵۷ء میں بجنور میں صدر امین کے عہدہ پر فائز ہوئے اور ۱۸۵۹ء میں رسالہ اسباب بغاوت ہند لکھا۔ ۱۸۶۴ء میں غازی پور سے علی گڑھ چلے آئے اور سائنٹفک سوسائٹی کا اخبار علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ جاری کیا۔

اس کے بعد یکم اپریل ۱۸۶۹ء کو سرسید نے انگلستان کا سفر کیا اور اس دوران انگریزوں کی طرز تعلیم کا مشاہدہ کیا، جس کے نتیجہ میں انھوں نے ۱۸۷۵ء میں مدرسۃ العلوم کا قیام کیا، جس نے پہلے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج اور اس کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شکل اختیار کی۔ اس کے علاوہ سرسید کو ۱۸۷۸ء میں سر کے خطاب سے نوازا گیا اور ۲۷/ مارچ ۱۸۹۸ء کو ان کی وفات ہوگئی۔

سرسید کا تصور تعلیم یہ تھا کہ قوم کو وہ تعلیم فراہم کی جائے جس سے وہ ترقی کی جانب گامزن ہو اور ایک روشن مستقبل کے ساتھ کھویا ہوا مقام حاصل کرے۔ اس کے لیے وہ دینی اور عصری علوم کو نصاب میں ایک ساتھ شمولیت دینے کے خواہاں تھے۔ اسی کے ساتھ وہ نصاب تعلیم میں تربیت کو ایک اہم حصہ تصور کرتے تھے۔

طریقۂ تدریس میں سرسید عملی مشق کا طریقہ اختیار کرنے کی صلاح دیتے ہیں تاکہ طلبہ اپنی عملی زندگی میں اس کا بخوبی استعمال کرسکیں۔ اپنے اس تصور کو عملی جامہ پہنانے کے لیے انھوں نے عمومی اور خصوصی دو طرح کے نصاب کو تجویز کیا، جس کا تفصیلی مطالعہ آپ اس اکائی میں کر چکے ہیں۔

حصول تعلیم کے ساتھ پیشہ ورانہ صلاحیتوں کے حصول پر بھی سرسید احمد خاں نے خاطر خواہ زور دیا ہے۔

اس کے علاوہ سرسید نظم وضبط کو لازم وملزوم سمجھتے تھے اور تعلیمی نظام میں خود مختاری کو اولیت دیتے تھے۔ اس میں حکومت کی دخل اندازی انہیں سخت ناپسند تھی جس کی کئی تحریروں میں انھوں نے مذمت کی ہے۔ انھوں نے اساتذہ کے مقام کو والدین کے مرتبے کے برابر قرار دیتے ہوئے کئی اقتباسات لکھے اور اسی طرح اساتذہ کو بھی اخلاق حسنہ کا پیکر تصور کیا۔

10.5 آپ نے کیا سیکھا

☆ آپ سرسید کی مختصر سوانح سے واقف ہوئے۔

☆ آپ کو سرسید کے تعلیمی وسیاسی پس منظر سے واقفیت ہوئی۔

☆ آپ کو سرسید کے تصور تعلیم کا علم ہوا۔

☆ آپ سرسید کی تعلیمی کاوشوں سے متعارف ہوئے۔

10.6 اپنا امتحان خود لیجیے

1- سرسید نے انفرادی تعلیم کے تعلق سے کیا کردار ادا کیا؟

2- سرسید کا تصور نصاب کیا تھا؟

3- انگلینڈ سے واپسی پر سرسید کے ذہن میں تعلیم کے لیے کون سا نظریہ فروغ پا رہا تھا؟

4- سر سید کا اساتذہ وطلبہ کے مابین مفاہمت کا کیا نظریہ تھا؟

10.7 اپنے جوابات خود دیجیے

1- سر سید پہلے شخص تھے جنھوں نے انفرادی تعلیم کے مقابلہ میں قومی تعلیم کا تصور پیش کیا۔ اتنا ہی نہیں سر سید تعلیمی انتظام کو بھی اپنی قوم کے ہاتھ میں رکھنے کے خواہاں تھے۔ حالانکہ انگریزی حکومت کے ذریعہ اس وقت کئی یونیورسٹیوں کا قیام عمل میں آیا تھا۔ پھر بھی سر سید کے نزدیک وہ طریقۂ تعلیم تہذیبی نشو ونما کے لیے ناکافی تھا۔ قومی تعلیم کا تصور انفرادیت کا حامل تھا جس کے نتیجہ میں قوم ترقی کی جانب گامزن ہوئی۔

2- نصاب کے متعلق ان کا نظریہ یہ تھا کہ نصاب دو طرح کے ہوں: عمومی اور خصوصی۔ سر سید نے تعلیم سے متعلق طریقۂ تدریس اور نصاب میں شمولیت رکھنے والے اجزاء کے بارے میں پوری تفصیل ''ترقی تعلیم مسلمانان ہند'' میں پیش کی ہے۔ عمومی نصاب میں دینیات، فقہ، اصول فقہ، حدیث، اصول حدیث، تفسیر، اصول تفسیر، علم سیرت، علم عقائد، ادب، اردو، فارسی، عربی، انگریزی، لاطینی، تاریخ، جغرافیہ، علم اخلاق، علم عضویات، منطق، فلسفہ، اصول حکمت، سیاسی اقتصادیات، ریاضی، حساب البحر، اعلیٰ ریاضی، طبعیات، علم سکونیات، علم حرکیات، علم آب، ماحولیاتی سائنس، بجلی ای توانائی، علم نجوم، آواز، حرارت اور فلسفۂ فطرت اور خصوصی نصاب میں انجینئرنگ، جانوروں کا علم عضویات، علم تشریح ابدان (Anotomy)، علم حیوانیات، علم نباتات، علم ارضیات، علم معدنیات اور علم کیمیا جیسے مضامین کی شمولیت کی تجویز پیش کی۔ اس کے لیے سر سید نے ۱۸۷۵ء میں مدرسۃ العلوم کی بنیاد ڈالی جس نے ۱۸۷۷ء میں ایم اے او کالج کی شکل میں شناخت حاصل کی اور ۱۹۳۰ء میں یہ مسلم یونیورسٹی بن گئی۔ سر سید نے انتخاب کرتے وقت مدرسۃ العلوم کے طور پر تین کالج تجویز کیے تھے۔ ایک انگریزی کے لیے، دوسرا اردو کے لیے اور تیسرا عربی وفارسی کے لیے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ انگریزی کالج میں سارے جدید مضامین انگریزی میں پڑھائے جائیں لیکن لاطینی زبان طلبہ کے لیے لازم ہو۔

3- جب سر سید انگلستان سے واپس آئے تو ان کے خیالات وافکار میں مسلمانوں کے حال اور مستقبل کو بہترین بنانے کا عکس نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ وہ مسلمانوں کی سماجی اور ذہنی حالت میں تیز رفتار تبدیلی کے آرزومند تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ انگلستان کا یہ اصول ان کے ذہن و دل پر نقش ہو چکا تھا کہ تعلیم و تحقیق کسی قوم کی ترقی کی ضامن ہے۔ جہاں ایک جانب تعلیم سے ان کی مراد جدید مغربی علوم بشمول سائنس تھی، وہیں دوسری جانب مشرقی تعلیم کی اہمیت وافادیت کا بھی خاطر خواہ ذکر کیا ہے۔ سر سید احمد خاں نے حالات کی نزاکت کو محسوس کر کے اس خیال کی ترویج کی کہ روایتی تعلیم سے قوم کچھ خاص فائدہ حاصل نہ کر سکے گی اور انگریزی تعلیم کے حصول کی اہمیت کو قوم کی ترقی کے لیے لازمی قرار دیا۔ حالانکہ مسلمانوں کے بعض علما نے انگریزی تعلیم کی سخت مخالفت کی اور سر سید کو تنقید کا نشانہ بنایا اس کے باوجود انھوں نے اپنے تعلیمی مشن کو آگے بڑھاتے ہوئے کالج اور یونیورسٹی کا قیام کیا۔

4- سر سید احمد خاں طلبا کی زندگی میں جہاں نظم وضبط کی اہمیت پر انتہائی زور دیتے ہیں وہیں اساتذہ کا بلند مقام اور مرتبہ

کی اہمیت طلبا کے دلوں میں پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ان کے مطابق اساتذہ کا احترام طالب علم کی ترقی کا باعث ہوتا ہے۔اوران کے نظریہ کے مطابق استاد مدرسہ کی روح ہوتا ہے۔ وہیں دوسری جانب سرسید اساتذہ کو بھی نصیحت کرتے ہیں کہ وہ بھی طلبا کے ساتھ شفقت کا رویہ اپنائیں۔’’ان کو اس بات پر بھی توجہ کرنی چاہیے کہ ان کا ادب اور ان کی محبت طالب علم کے دل میں پیدا ہو اور یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب کہ وہ خود طلبا کے ساتھ اخلاق ومحبت سے پیش آئیں اور انھیں کو اخلاق ومحبت طالب علم کی ہدایت اوران میں نیک دل پیدا ہونے کا ذریعہ ہوگا۔‘‘

10.8 فرہنگ

فروغ	ترقی	شائع کرنا	چھپنا، چھاپنا
دست نگر	ہاتھ پھیلانا	آغاز	شروعات
زوال	پستی، گراوٹ	کاوش	کوشش
خواہاں	چاہنا، خواہش مند	منتقل ہونا	ٹرانسفر ہونا، ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا
کوشاں ہونا	کوشش کرنا	لاطینی	اٹلی کی زبان
ابتر	بدتر، براحال	واقفیت ہونا	علم ہونا، جاننا
اقتصادی	معاشی	بقا	باقی ہونا
شرمندۂ تعبیر	پورا ہونا، مکمل ہونا	ناقابل تلافی	جس کی بھرپائی ممکن نہ ہو
شمولیت	شامل ہونا	اخلاقِ حسنہ	اچھے اخلاق
پیکر	مجسمہ	قلمبند کرنا	لکھنا
مربی	تربیت دینے والا		

10.9 کتب برائے مطالعہ

سرسید اوران کے نامور رفقاء، سید عبداللہ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۴ء

سرسید احمد خاں، محمد علی جوہر/ آفتاب عالم نجمی، شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۲۰۲۱ء

حیات جاوید، الطاف حسین حالی، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۹۰ء

سرسید اور علی گڑھ تحریک، خلیق احمد نظامی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۸۲ء

اکائی۔11 سرسید احمد خاں کا تصور شعر و ادب

ساخت

11.1۔اغراض و مقاصد

11.2۔تمہید

11.2.1۔سرسید کا تصور نثر

11.2.2 سرسید کا تصور شعر

11.2.3۔ شعر و ادب پر سرسید کے اثرات

11.3۔آپ نے کیا سیکھا

11.4۔اپنا امتحان خود لیجیے

11.5۔سوالات کے جوابات

11.6۔فرہنگ

11.7۔کتب برائے مطالعہ

11.1۔اغراض و مقاصد

اس اکائی میں آپ:

۔سرسید کے تصور نثر سے واقف ہوں گے۔

۔سرسید کے تصور شعر کو جان سکیں گے۔

۔سرسید کے ادبی اور علمی کارناموں سے واقف ہو سکیں گے۔

۔شعر و ادب پر سرسید کے اثرات سے آگاہ ہو سکیں گے۔

11.2 تمہید

سرسید کی تحریک اصلا اصلاحی، تعمیری اور تعلیمی تھی۔ وہ کالونیل ہندوستان کے ایک بہت بڑے مصلح اور مفکر تھے۔انھوں نے مذہب، اور سماجی اصلاح، تعلیم، ادب، صحافت اور سیاست کے میدانوں میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔ان مقاصد کے لیے انھوں نے مذہبی، اور سیاسی موضوعات پر کتابیں لکھیں، صحافت کا سہارا لیا اور بکثرت مضامین لکھے، لکچرز اور خطبات دیے، خطوط لکھے، اور انجمنیں اور ادارے قائم کیے، سیاست کے میدان

میں نمائندگی کی، اور بکثرت ملکی اسفار کے ساتھ انگلستان کا سفر بھی اختیار کیا۔

سرسید نے اردو میں سیرت نگاری کا آغاز کیا اور سیرت پاک پر ''جلاء القلوب بذکر المحبوب'' نامی مختصر کتابچہ لکھا۔ بعد میں انھوں نے خطبات احمدیہ کی تصنیف کی، جسے اردو سیرت نگاری کا باقاعدہ آغاز کہنا چاہیے۔ ابتدا میں ان کی توجہ دہلی کی تاریخی عمارات اور وہاں کی شخصیات پر ہوئی اور نہایت عرق ریزی کے ساتھ دہلی کی تاریخی عمارات اور شخصیات پر آثار الصنادید نامی کتاب لکھ کر ۱۸۴۷ء میں شائع کی، جسے بہت مقبولیت حاصل ہوئی، اور جس کا انگریزی کے ساتھ فرانسیسی زبان میں بھی ترجمہ شائع ہوا، علاوہ ازیں انھوں نے تاریخ پر بھی توجہ کی اور تاریخ فیروز شاہی، توزک جاں گیری اور ابوالفضل علامی کی آئین اکبری کو تصحیح وتحشیہ کے ساتھ شائع کیا۔ سرسید اصلا ایک مصلح تھے، چناں چہ انھوں نے اپنے تعمیری مقاصد کی تکمیل کے لیے مذہبی اور سیاسی تصانیف اور صحافت کی جانب توجہ مرکوز کی، اور اسباب بغاوت ہند، تاریخ سرکشی بجنور، وفادار مسلمانان ہند، مسافران لندن، خطبات احمدیہ، تفسیر القرآن، تبیین الکلام (انجیل کی تفسیر) اور رسالہ طعام اہل کتاب وغیرہ کتابیں لکھیں اور اخبار سائنٹی فک سوسائٹی اور پھر رسالہ تہذیب الاخلاق کے اجرا کے ذریعہ اپنے مشن کے لیے بھرپور اور کامیاب جدوجہد کی۔

سرسید اگرچہ غازی پور میں سائنٹی فک سوسائٹی کے قیام اور اسے علی گڑھ منتقل کرنے کے بعد یہاں سے اخبار انسٹی ٹیوٹ گزٹ شائع کر چکے تھے، لیکن صحافت کے میدان میں سب سے بڑا کارنامہ لندن سے واپسی کے بعد رسالہ تہذیب الاخلاق کا اجرا تھا، جس کے اصلاحی، مذہبی، تعمیری، علمی اور منطقی مضامین، جنھیں سرسید اور ان کے رفقاء کار لکھا کرتے تھے، اردو صحافت کے میدان میں نئے انقلاب کا علم بردار تھا۔ اس رسالے نے نہ صرف ہندوستانی مسلمانوں کے خیالات میں تبدیلی پیدا کی، بلکہ اس کے سادہ اور سلیس مضامین نے اردو صحافت اور زبان کو نئے اسلوب اور زبان سے روشناس کرایا، جس کے اردو زبان پر بہت گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ اسی زمانے میں سرسید نے لندن کے مقصدی سفر کی روداد بھی تحریر کی، جو دوران سفر اخبار انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع ہوتی رہی، جو اپنی گوناگوں مشتملات، زبان کی سادگی اور جاذبیت کے اعتبار سے اس قدر دل چسپ تھی کہ بہت پسند کی گئی۔ سفر سے واپسی پر اور نئے رسالے تہذیب الاخلاق کے اجرا کے بعد یہ سفرنامہ ''مسافران لندن'' اس رسالے میں شائع ہوا۔ لندن کے سفر کے مقاصد میں ایک بہت اہم مقصد ولیم میور کے سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر لکھی گئی تنقیدی کتاب کے جواب کے لیے مواد کا حصول بھی تھا، اس مقصد سے سرسید نے اپنی قیمتی کتابیں فروخت کر دی تھیں، چناں چہ دوران سفر انھوں نے اس کتاب کا جواب خطبات احمدیہ کے نام سے تحریر کیا۔ بحیثیت اردو سیرت نگاری کے بنیاد گزار، سیرت کی اس ابتدائی کتاب کی زبان بھی سرسید کی اپنے عہد کی عام تصنیفی زبان سے مختلف، سہل، علمی اور منطقی ہے۔

واضح ہو کہ سرسید کے سامنے اردو میں سہل اور سلیس زبان کے دو تین نمونے ہی موجود تھے، جن میں کلکتہ کی

ایشیا ٹک سوسائٹی کے مصنفین بالخصوص میر امن دہلوی کی باغ و بہار کے علاوہ دہلی کالج کی تصانیف اور غالب کے شخصی خطوط کے نمونے تھے، جو اپنی بے تکلفی، بول چال کی زبان اور سادگی کے اعتبار سے اپنی مثال آپ تھے۔۱۸۴۲ء میں منظر عام پر آنے والے سرسید کے سیرت پر کتابچے ''جلاء القلوب'' کی نثر سہل ہے، لیکن ۱۸۴۷ ء میں شائع ہونے والی کتاب آثار الصنادید کی نثر وہ اختیار کی جو اپنے زمانے کی علمی یعنی فارسی آمیز مقفی اور مسجع تھی، لیکن محض سات سالوں کے بعد جب سرسید نے اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن تیار کیا تو اس کی نثر کو تبدیل کر کے اسے اس نثر میں لکھا جو سادہ اور سہل تھی۔ سرسید کی نثر کے حوالے سے یہ بات قابل ذکر ہے کہ آثار الصنادید کی اشاعت اول کے سال ہی، یعنی ۱۸۴۷ء میں، اردو کے اولین سفرنامہ نگار یوسف خان کمبل پوش نے اپنے سفرلندن کی روداد تاریخ یوسفی المعروف بہ عجائبات فرنگ کے نام سے دہلی کالج سے شائع کرائی، جس کی نثر سادہ اور سلیس تھی، جب کہ سرسید نے اپنی نثر میں سادگی عجائبات فرنگ کی اشاعت کے سات سال بعد آثار الصنادید کی اشاعت دوم میں اختیار کی۔ آثار الصنادید کی اشاعت کی دو دہائی بعد ۱۹۷۰ء میں جب سرسید نے اپنا سفرنامہ مسافران لندن شائع کیا تو اس کی نثر بھی ان کی گزشتہ تصانیف کی طرح سادہ تھی۔ یہاں یہ عرض کرنے میں مضائقہ نہیں ہے کہ کمبل پوش حیدرآبادی کا سفرنامہ سرسید کے سفرنامے کے مقابلے میں زیادہ دل چسپ اور پر لطف ہے کہ وہ ایک آزاد سیلانی تھا، جب کہ سرسید پابند مقصد مسافر۔ مسافران لندن میں سرسید کا اپنا رنگ صاف طور پر موجود ہے اور انھوں نے اپنے مافی الضمیر کو بہت وضاحت، سادگی اور ٹھوس اسلوب میں پیش کیا ہے۔

11.2.1 تصور نثر

سرسید ہمارے وہ اولین بزرگ ہیں جنھوں نے اپنی تحریک کے زیر اثر اردو زبان و ادب کی تشکیل کی۔ ان کے تصورات ادب جدید نثر اور شاعری میں جلوہ گر ہیں۔ اپنے تصورات کو نہ صرف انھوں نے خود برتا، بلکہ ان کے سر کردہ اور نابغہ روزگار رفقاء کار نے اپنی تصانیف میں استعمال کیا۔

ادب میں نثر کے متعلق سرسید کا تصور تھا کہ: ''جو کچھ لطف ہو مضمون کے ادا میں ہو، جو اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل میں پڑے، تا کہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے۔'' (شبلی نعمانی: سرسید مرحوم اور اردو لٹریچر، مشمولہ: انتخاب مضامین سرسید، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۰۵ء، ص۔۲۱) اس طرح انھوں نے الفاظ سے کھیلنے اور قافیہ پیمائی کو رد کر کے خلوص، سادگی اور تاثیر کو اہمیت دی، اور اپنی تحریروں میں بھی اس کا اہتمام کیا کہ عبارت آرائی کے پیچ و خم میں پڑنے اور الجھنے کے بجائے دلی خیالات یا مضمون، معنی کو نہایت سادگی، سلاست اور بے تکلفی کے ساتھ قاری کے سامنے پیش کیا جائے اور ترسیل کا کوئی مسئلہ پیدا نہ ہو۔ اس طرح اردو میں غالباً پہلی بار قاری کا تصور قائم ہوا اور بقول سید عبداللہ متن کے ساتھ قاری کو بھی برابر کا شریک قرار دیا گیا۔ (سید عبداللہ: سرسید اور ان کے نام ور رفقا)

اس حوالے سے تہذیب الاخلاق کے مذکورہ اقتباس کے مکمل حصے کو نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے، جس سے خود سرسید کی زبانی اصلاح زبان وترقی ادب کے متعلق ان کے کارنامے پر اجمالی روشنی پڑتی ہے، اور زبان وادب کے متعلق ان کا تصور سامنے آتا ہے۔ وہ اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

''جہاں تک ہم سے ہوسکا، ہم نے اردو زبان کے علم وادب کی ترقی میں اپنے ان ناچیز پرچوں کے ذریعے سے کوشش کی، مضمون کے ادا کا ایک سیدھا اور صاف طریقہ اختیار کیا۔ رنگین عبارت سے، جو تشبیہات واستعارات خیالی سے بھری ہوئی ہیں، اور جس کی شوکت صرف لفظوں ہی لفظوں میں رہتی ہے، اور دل پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا، پرہیز کیا۔ اس میں کوشش کی کہ جو کچھ لطف ہو مضمون کے ادا میں ہو، جو اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل میں پڑے، تاکہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے۔'' (شبلی نعمانی: سرسید مرحوم اور اردو لٹریچر، مشمولہ: انتخاب مضامین سرسید، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۰۵ء، ص۔۲۰۔۲۱)

مضمون کے اس حصے سے سرسید کے درج ذیل تصورات اور ان کا عملی انطباق سامنے آتا ہے:

۔ رنگین عبارت آرائی سے پرہیز۔

۔اظہار کا سیدھا اور صاف طریقہ یعنی سادہ اور سلیس زبان واسلوب اختیار کرنا۔

۔اصل توجہ مضمون پر ہو، اور ترسیل کے لیے اس کی ایسی سچی ترجمانی ہو جو دل میں جاں گزیں ہو۔

اسی نوعیت کی بات انھوں نے خطوط کے متعلق بھی لکھی ہے۔ تہذیب الاخلاق کے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

''یہاں تک کہ دوستانہ خط وکتابت اور چھوٹے چھوٹے روزمرہ کے رقعوں میں یہ سب خرابیاں بھری ہوئی ہیں۔ کوئی خط اور رقعہ ایسا نہیں، جس میں جھوٹ اور وہ بات جو کہ درحقیقت دل میں نہیں، مندرج نہ ہو، پس ایسی طرز تحریر نے تحریر کا اثر ہمارے دلوں سے کھو دیا ہے۔'' (ثریا حسین: سرسید احمد خان اور ان کا عہد، ص۔۲۵۹، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۱۵ء، بحوالہ: شیخ اسماعیل پانی پتی: مضامین تہذیب الاخلاق، جلد۔ دوم، ص۔۴۷)

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد سرسید میں خطوط میں مبالغہ آرائی، لفاظی اور عبارت آرائی کا سہارا لیا جاتا تھا، جس کے سبب ان میں خلوص اور تاثیر ختم ہوگئی تھی، جب کہ سرسید خطوط میں مبالغہ آرائی، لفاظی اور عبارت آرائی کو ناپسند کرتے تھے، اور ان کا خیال تھا کہ ان میں سادگی، حقیقت نگاری اور تاثیر ہو۔ سرسید کا یہ نقطۂ نظر بہت حقیقی اور قیمتی ہے، اور انھوں نے اپنے خطوط میں مدعا نگاری، واقعیت اور سادگی کو برتا ہے۔ ان کے خطوط کے متعدد مجموعے شائع ہوچکے ہیں، جن کے مطالعے سے مذکورہ امور کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

سرسید اردو زبان کو سہل برتنا پسند کرتے تھے، اور اسی کی تبلیغ بھی کرتے تھے۔ وہ آثار الصنادید میں اہل دہلی کے یہاں اردو میں فارسی کی کثرت آمیزش پر نقد کرتے نظر آتے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

اگرچہ اس زبان میں اکثر فارسی اور عربی اور سنسکرت کے الفاظ مستعمل ہیں، اور بعضے بعضوں میں کچھ تغیر

وتبدیلی کرلی ہے،لیکن اس زمانے میں شہر کےلوگوں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ اردوزبان میں یاتو فارسی کی لغت بہت ملا دیتے ہیں،اور یا فارسی کی ترکیب پر لکھنے لگتے ہیں۔یہ دونوں باتیں اچھی نہیں ،ان سے اردو پن،نہیں رہتا۔''(ثریا حسین: سرسید احمد خان اوران کا عہد،ص۔۲۵۴،ایجوکیشنل بک ہاؤس،علی گڑھ،۲۰۱۵ء،بحوالہ: سرسید احمد خان: آثارالصنادید)

سرسیداردوزبان میں ''اردوپن'' کوبرقراررہنے کے قائل ہیں۔وہ یہ نہیں چاہتے کہ لوگ اردو میں فارسی الفاظ کا زیادہ استعمال کریں،یا فارسی ترکیب پر لکھنےلگیں۔

سرسید نے اخبار سائنٹی فک سوسائٹی اور بالخصوص تہذیب الاخلاق کے ذریعہ اس سادہ،سلیس اور پرتاثیر زبان کو استعمال کیا،کہ جس کے سبب دیکھتے دیکھتے اردونثر میں نہ صرف اس نوع کی زبان کا چلن ہوگیا، بلکہ موخرالذکر رسالے کے سبب اردو بہت جلد ہرطرح کے علمی مضامین ومطالب کوادا کرنے کے قابل بن گئی۔اس رسالے میں مذہب،اخلاق،معاشرت،تمدن اورتعلیم وغیرہ موضوعات پر بہت عمدہ اور پرکشش مضامین شائع ہوتے تھے،جن کے بہت سے لکھنے والوں میں سب سے نمایاں نام سرسید،اوران کے بعد مولوی سید مہدی علی خاں،اور مولوی چراغ علی کا تھا۔ان فاضل مضمون نگاروں نے اردو کے دامن کومتنوع علمی مضامین کے ذریعے بھرنے کی کوشش کی۔

تہذیب الاخلاق کے اثرات کے متعلق خواجہ حالی لکھتے ہیں کہ اردولٹریچر کواس رسالے سے کچھ کم فائدہ نہیں پہنچا۔اسے جاری ہوئے صرف تین سال ہوئے تھے کہ سرسید کے ایک انگریز دوست نے انھیں لکھا کہ:

''تہذیب الاخلاق نے یہ ثابت کردیا ہے کہ اردوزبان میں بھی ہرقسم کے مضامین اورخیالات عمدگی اورسادگی سے ادا ہوسکتے ہیں،اور یہ بھی ثابت کیا کہ مذہب اسلام ایسا تنگ وتاریک رستہ نہیں ہے جیسا کہ اب تک سمجھا جاتا ہے۔''(الطاف حسین حالی: حیات جاوید،ص۔۳۵۷۔۳۵۸،قومی کونسل برائے فروغ اردوزبان،نئی دہلی،۱۹۹۹ء)۔حالی کا یہ بھی کہنا ہے کہ سوشل،اخلاقی اور مذہبی مضامین جس سادگی اور لطافت اورشائستگی کے ساتھ اس پرچہ میں لکھے گئے،ویسے کبھی کسی اردوزبان کے پرچہ میں نہیں لکھے گئے۔(حوالہ بالا،ص۔۳۵۸)

سرسید کا امتیاز یہ بھی ہے کہ انھوں نے اردوانشا پردازی کو بلند مقام پر پہنچایا۔رسالہ تہذیب الاخلاق کواس معاملے میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔۱۸۴۷ء کے بعد اردو میں متعدد اخبارات جاری ہوئے،جن میں ہرقسم کے موضوعات پر مضامین لکھے جاتے تھے،لیکن بقول علامہ شبلی اس وقت انشا پردازی ابتدائی حالت میں تھی،اوراس کا کوئی خاص اسٹائل متعین نہیں ہوا تھا،لیکن تہذیب الاخلاق کے ذریعہ انھوں نے انشا پردازی کواس مقام پر پہنچا دیا،جس کے آگے اب ایک قدم بھی بڑھنا ممکن نہیں ہے۔(شبلی نعمانی: سرسید مرحوم اوراردولٹریچر، مشمولہ: انتخاب مضامین سرسید،ص۔۲۰) سرسید نے انگریزی کے متعدد مضامین کواردو کا قالب عطا کیا۔انھوں نے ان کا ترجمہ

کرنے کے بجائے انھیں آزادنہ طور پر اردو زبان میں لکھا۔ امید کی خوشی ایک ایسا ہی مضمون ہے، جسے اردو کا قالب پہنایا گیا ہے۔ سرسید نے ایک اردو ڈکشنری بھی تیار کرنی شروع کی تھی، مگر اس کا تھوڑا ہی حصہ لکھ سکے، پھر یہ کام مکمل نہیں ہوسکا۔

۱۸۴۷ء میں جب کہ سرسید نے آثار الصنادید تحریر کی، اس کے کچھ دنوں بعد ہی غالب نے اردو کی جانب توجہ کی اور اردو زبان میں ایسے خطوط لکھے جو اپنی مثال آپ ہیں۔ جن کا انداز ایسا ہے کہ گویا دو لوگ سامنے بیٹھے باتیں کر رہے ہوں۔ انداز بے تکلفانہ اور زبان بالکل سادہ بول چال کی ہے۔ علامہ شبلی نے یہ خیال ظاہر کیا ہے، جو کہ درست معلوم ہوتا ہے کہ غالب سے سرسید کو جو تعلق تھا، اس بنا پر کچھ شبہ نہیں ہوسکتا کہ سرسید ضرور مرزا کی طرز سے مستفید ہوئے۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ اردو انشا پردازی، کا آج جو انداز ہے، اور جس کے مجدد اور امام سرسید مرحوم تھے، اس کا سنگ بنیاد دراصل مرزا غالب نے رکھا تھا۔ (شبلی نعمانی: سرسید مرحوم اور اردو لٹریچر، مشمولہ: انتخاب مضامین سرسید ص۔۲۰)

11.2.2 تصور شعر

نثر کے علاوہ سرسید نے شعر کے روایتی تصور پر تنقید کی اور کہا کہ ''ہمارا فن شاعری بد جذبات کی طرف اشارہ کرتا ہے، جو ضد تہذیب الاخلاق کے ہیں۔'' (تہذیب الاخلاق، جلد دوم۔ص۔۴۵۱) سرسید کے اس جملے سے ان کے نظریہ فن پر وضاحت کے ساتھ روشنی پڑتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ شاعری ان کے نزدیک پاکیزہ خیالات اور پالیزہ جذبات کے اظہار کا نام ہے، جس میں برے خیالات اور فحش جذبات کی گنجائش نہیں۔ شاعری ایسی ہونی چاہئے جس سے اخلاق کی تہذیب ہو، نہ کہ تخریب۔

خواجہ حالی نے آب حیات میں اردو شاعری کی ترقی میں سرسید کی خدمات کے حوالے سے ان کے رسالے تہذیب الاخلاق کا تذکرہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ:

''اردو شاعری، جس میں دو سو برس سے ایک ہی قسم کے خیالات برابر دہرائے جا رہے تھے، اس نے بھی زیادہ تر اسی پرچہ کی تحریک سے کروٹ بدلی۔ نئے نئے میدانوں میں شعرا قدم رکھنے لگے، مبالغہ اور جھوٹ کی جگہ حقائق و واقعات کے خاکے کھینچنے لگے، اور شاعری بجائے اس کے کہ محض ایک دل لگی کی چیز سمجھی جاتی تھی، ایک کام کی چیز بننے لگی۔'' (الطاف حسین حالی: حیات جاوید ص۔۳۵۹)

حالی کی اس تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو شاعری صدیوں سے ایک ہی ڈھب پر چلی آرہی تھی، جس میں خیالات اور مضامین کی تکرار تھی۔ وہی عشق و عاشقی کے مضامین، جن میں بقول سید جذبات بد کی ترجمانی ہو رہی تھی۔ حد سے فزوں مبالغہ اور جھوٹے خیالات کی بھرمار تھی، اور شاعری بجائے کہ مفید اور اعلا مقصد کے لیے استعمال ہو، دل لگی کی چیز بن گئی تھی، جیسا کہ سرسید سے قبل اردو شاعری کے مزاج پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے۔

عمومی صورت حال تو وہی تھی، جس کا ذکر سرسیداور حالی نے کیا ہے، لیکن سرسید سے قبل بعض تعمیری خیالات کے شعرا بھی گزرے ہیں، مثلاً خواجہ میر درد وغیرہ جن کے متصوفانہ مضامین خیال کی پاکیزگی کے مظہر اور اسے جلا بخشنے والے ہیں، لیکن مذکورہ دونوں بزرگوں کا تبصرہ غالباً اس حوالے سے ہے کہ مذکورہ عہد کی شاعری کسی اعلا مقصد کی ترجمانی کے بجائے محض دل لگی اور تفنن طبع کی چیز بن گئی تھی، ایسے میں سرسید کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اپنے تصورات کے زیر اثر شاعری کو تہذیب اخلاق کا ذریعہ، بامقصد اور مفید بنانے کی کوشش کی، جس کے نتیجے میں رسالہ تہذیب الاخلاق کے قلم کاروں نے اس نوع کے مضامین کو پیش کیا کہ اس سے شاعری کے موضوعات میں وسعت اور تنوع پیدا ہوا، اور غیر ضروری مبالغہ آرائی اور لغویات کو ترک کر کے اسے مفید اور بلند تر مقاصد کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ سرسید کے یہ تصورات ان کے رفقا حالی کی تنقید نگاری، شبلی کی شاعری اور نذیر احمد کے ناولوں میں جلوہ گر ہو گئے۔ سرسید کا یہ کارنامہ غیر معمولی ہے کہ انھوں نے اردو زبان وادب کی تشکیل کی، اور اس کا رخ موڑا۔ اور اپنے رفقا اور متبعین کو اس کام کے لیے معاون بنایا، ااور ان کی مفید اور اعلا صلاحیتوں کو دانش مندی کے ساتھ استعمال کیا۔

سرسید کا شاعری کے متعلق ایک تصور یہ بھی ہے کہ وہ اس میں فطری جذبات کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ ملٹن کے پیراڈائز لاسٹ کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

”پیراڈائز لاسٹ کچھ چیز بجز اس کے نہیں کہ انسان کی طبیعت کی حالت کی تصویر ہے۔ (تہذیب الاخلاق، ج۔۲،ص۔۴۵۲)

گویا سرسید انسان کی طبیعت کی حالت کی تصویر کشی کو مفید خیال کرتے ہیں۔

سرسید کے ان نظریات کے اثرات اردو شاعری اور ادب پر مرتب ہوئے۔ ان کی حیات میں ہی خواجہ حالی نے مسدس مدوجزر اسلام لکھا، جس میں اسلام کے عروج وزوال کی داستان، اور قوم کی بدحالی کو بہت دل سوزی اور تاثیر کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس مسدس نے اپنے زمانے کے عام وخواص کے ذہن پر گہرے اثرات مرتب کیے اور تب سے ماضی قریب تک ہر پڑھے لکھے گھروں میں اس کا تذکرہ ہوتا رہا ہے۔ یہ وہ نظم ہے جسے سرسید اپنی فلاح کا ذریعہ تصور کرتے تھے، اور کہتے تھے کہ خدا قیامت کے دن اگر پوچھے گا کہ دنیا سے کیا لے کر آئے، تو میں کہوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوا کر لایا ہوں۔ مولانا حالی سرسید کے ادبی تصورات سے بہت متاثر تھے۔ انھوں نے مقدمہ شعروشاعری میں سرسید کے افادی تصور کو پیش کیا ہے۔ سادگی اور اصلیت کے تصور کو سرسید کے تصورات کی بازگشت قرار دیا جاسکتا ہے، اسی کے ساتھ اس کتاب میں انھوں نے ادب کے جس افادی تصور کو پیش کیا ہے اسے بھی سرسید کے خیالات کے اثرات کے طور پر دیکھا جانا چاہیے۔ مولانا حالی سرسید سے اس قدر متاثر اور ان کے عقیدت مند تھے کہ انھوں نے ان کی ضخیم سوانح عمری حیات جاوید کے نام سے تحریر کی، جسے ان کی سب سے

مستند اور مبسوط سوانح عمری کی حیثیت حاصل ہے، اور سرسید کے مستند احوال سے واقفیت کے لیے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

11.2.3 شعروادب پر سرسید کے اثرات

سرسید کی ذات وہ شجر سایہ دار اور مقناطیسی خصوصیات کی حامل تھی، اور جن کے اندر عوام وخواص کو متاثر کر لینے کی اس قدر غیر معمولی صلاحیت تھی کہ اپنے مشن کی خاطر انھوں نے اپنی قوم کے ذہین اور غیر معمولی دماغوں کو اکٹھا کر لیا تھا۔ چناں چہ حالی، شبلی، نذیر احمد، محسن الملک، وقار الملک اور مولوی چراغ علی وغیرہ جیسے اصحاب اپنے زمانے کے آفتاب وماہ تاب تھے، جنھوں نے سرسید کی مقصدیت اور قوم کی اصلاح کے جذبے کے تحت مفید علمی اور تعمیری کاموں میں اپنی زندگی وقف کردی اور ان کی ذات سے تحریک پا کر ادب کی اصلاح وترقی کا بیڑا اٹھایا ، جن میں کسی نے اردو تنقید اور سوانح نگاری کی بنیاد ڈالی، تو کسی نے ناول اور تاریخ نگاری کی۔

جیسا کہ کہ عرض کیا گیا کہ خواجہ حالی نے مقدمہ شعر وشاعری لکھ کر اردو تنقید کی باقاعدہ بنیاد ڈالی۔ اگر چہ اس سے کچھ قبل مولانا محمد حسین آزاد ''نظم اور کلام موزوں کے باب میں چند خیالات'' لکھ کر اردو تنقید کا ننھا پودا لگا چکے تھے، لیکن اس کے وہ اثرات مرتب نہیں ہوئے، جو کہ حالی کے مقدمے کے ہوئے، اور جس کے بغیر اب بھی اردو تنقید پر گفتگو میں بات نہیں بنتی۔ حالی کے علاوہ شبلی نعمانی بھی موازنہ انیس ودبیر اور شعر العجم لکھ کر اردو تنقید کے بنیاد گزار بن گئے۔ حالی اور شبلی اردو سوانح اور سیرت نگاری کے بنیاد گزار بھی ہیں۔ حالی حیات سعدی، یادگار غالب اور حیات جاوید اور شبلی تاریخ وسوانح کے آمیزے سے متعدد یادگار تصانیف: المامون، الغزالی، سیرت النعمان اور سیرت النبی وغیرہ کے ذریعہ اردو سوانح کے بنیاد گزار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ خود سرسید کو جلاء القلوب، سیرت فریدیہ اور خطبات احمدیہ کے سبب اردو سیرت وسوانح کے بنیاد گزار کی حیثیت حاصل ہے۔ اسی طرح مولوی نذیر احمد کو اردو ناول نگاری کے بنیاد گزار کا درجہ حاصل ہے۔ نذیر احمد کا تصور بھی افادی اور مقصدی تھا، وہ اپنے ناولوں میں برہنہ طور پر مقصد کو پیش کرتے نظر آتے ہیں۔ مولوی نذیر احمد سرسید کے متعدد مذہبی تصورات سے غیر مطمئن تھے، جن پر ناقدانہ اظہار انھوں نے اپنے ناولوں کے پیرائے میں کیا ہے۔

تاریخ نگاری میں شبلی اور مولوی ذکاء اللہ نے براہ راست سرسید سے کسب فیض کیا۔ اس سلسلے میں سرسید کو ایک مربی اور رہ نما کی حیثیت حاصل ہے۔ سرسید کو اپنے ابتدائی تصنیفی دور میں تاریخ سے خاندانی اثرات کے سبب دل چسپی تھی، اسی بنا پر انھوں نے آئین اکبری، تو زک جہاں گیری اور تاریخ فیروز شاہی کو مدون کیا۔ تاریخ نگاری میں سرسید کی رہ نمائی کے حوالے سے سید عبداللہ نے لکھا ہے کہ:

''انھوں نے شبلی کے اس طریق کار کی تحسین کی کہ واقعات تاریخی کے اسباب دریافت کیے جائیں، گویا فلسفۂ تاریخ کی طرف اپنے مورخوں کی توجہ دلائی۔ اس سے بھی زیادہ قابل توجہ بات یہ ہے کہ سرسید نے تاریخ نگاری

کے لیے ایک خاص طرز بیان کی ضرورت کا احساس دلایا۔ انھوں نے لکھا کہ ہر فن کے لیے زبان کا طرز بیان جدا گانہ ہوتا ہے۔ تاریخ کی کتابوں میں ناول (قصہ) اور ناول میں تاریخانہ طرز کو کیسی ہی فصاحت و بلاغت سے برتا گیا ہو، دونوں کو برباد کر دیتا ہے۔'' (سید عبداللہ: سرسید اوران کے نامور رفقا ص۔ ۲۸۹۔ ۲۹۰)

شبلی کی کتابیں تاریخ اور سوانح کا آمیزہ ہیں، مگر ٹھوس انداز تحریر، علمیت اور تحقیقی طرز اسلوب کے سبب بہت اہمیت کی حامل ہیں۔ مولوی ذکاء اللہ کی ضخیم تاریخ ہندوستان انھیں اپنے عہد کا ایک بڑا تاریخ نگار بناتی ہے۔

11.3 آپ نے کیا سیکھا:

۔سرسید کے نثر سے متعلق تصورات کا علم ہوا۔

۔سرسید کے شعر سے متعلق خیالات سے واقفیت ہوئی۔

۔اردو شعروادب پر سرسید کے اثرات کا علم ہوا۔

۔ادبیات میں سرسید کے قد کا اندازہ ہوا۔

۔سرسید کی اہم تصانیف سے واقفیت ہوئی۔

11.4 اپنا امتحان خود لیجیے:

۱۔سرسید کس طرح کی نثر کو پسند کرتے تھے؟

۲۔سرسید نے آثار الصنادید اور تہذیب الاخلاق میں کس طرح کی نثر لکھی ہے؟

۳۔انشا پردازی میں سرسید کی خدمات کیا ہیں؟

۴۔سرسید اردو شاعری سے کیا توقعات رکھتے تھے؟

۵۔حالی کے یہاں سرسید کے کس طرح کے اثرات پائے جاتے ہیں؟

11.5 سوالات کے جوابات:

۱۔نثر کے متعلق سرسید کا تصور تھا کہ: ''جو کچھ لطف ہو مضمون کے ادا میں ہو، جو اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل میں پڑے، تاکہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے۔'' اس طرح انھوں نے الفاظ سے کھیلنے اور قافیہ پیمائی کو رد کر کے خلوص، سادگی اور تاثیر کو اہمیت دی۔ وہ عبارت آرائی اور ایسے خیالات جو دل میں نہ ہو، انھیں پیش کرنے کو ناپسند کرتے تھے۔ سرسید چاہتے تھے کہ مضمون کو سادگی، سلاست اور بے تکلفی کے ساتھ پیش کیا جائے۔

۲۔سرسید نے آثار الصنادید میں سادہ اور سلیس نثر لکھی ہے۔ پہلی اشاعت کی نثر مروجہ طریقے کے مطابق مشکل تھی، لیکن سرسید نے نظر ثانی کے بعد دوسری اشاعت میں اسے آسان زبان و اسلوب میں لکھا۔ اس کی تحریر میں وضاحت اور قطعیت ہے۔ رسالہ تہذیب الاخلاق تو سادہ نثر اور علمی مضامین کو وضاحت اور ٹھوس اسلوب میں پیش کرنے کے لے بطور خاص جانا جاتا ہے۔ اس رسالے سے اردو میں مروجہ مقفی و مسجع نثر کی روایت پر ضرب

پڑی اور ہر طرح کے علمی مضامین کو سادہ اور سلیس نثر میں لکھنے کی روش شروع اور مستحکم ہوئی، جس کے اردو نثر پر گہرے اثرات مرتب ہوئے۔

۳۔ سرسید اردو انشا پردازی کے بانی ہیں۔ ان کا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے انشا پردازی کو بھی بلند مقام پر پہنچایا۔ رسالہ تہذیب الاخلاق کو اس معاملے میں بنیادی حیثیت حاصل ہے، بقول شبلی: تہذیب الاخلاق کے ذریعہ انھوں نے انشا پردازی کو اس مقام پر پہنچا دیا، جس کے آگے اب ایک قدم بھی بڑھنا ممکن نہیں ہے۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ اردو انشا پردازی، کا آج جو انداز ہے، اور جس کے مجدد اور امام سرسید مرحوم تھے، اس کا سنگ بنیاد دراصل مرزا غالب نے رکھا تھا۔ سرسید نے انگریزی کے متعدد مضامین کو اردو کا قالب پہنایا، انھیں آزادنہ طور پر اردو زبان میں لکھا۔ امید کی خوشی ایک ایسا ہی مضمون ہے، جسے اردو کا قالب پہنایا گیا۔

۴۔ سرسید اردو شاعری کو بامقصد اور مفید خیالات کا حامل دیکھنا چاہتے تھے۔ انھوں نے شعر کے روایتی تصور پر تنقید کی اور کہا کہ ''ہمارا فن شاعری بدجذبات کی طرف اشارہ کرتا ہے، جو ضد تہذیب الاخلاق کے ہیں۔'' سرسید کے اس خیال سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعری ان کے نزدیک پاکیزہ خیالات کے اظہار کا نام ہے، جس میں برے خیالات اور فحش جذبات کی گنجائش نہیں۔ ان کے نزدیک شاعری ایسی ہونی چاہیے جس سے اخلاق کی تہذیب ہو سکے، اور اسے مفید اور اعلا مقصد کے لیے استعمال کیا جا سکے۔

۵۔ خواجہ حالی نے مقدمہ شعروشاعری لکھ کر اردو تنقید کی بنیاد ڈالی۔ وہ سرسید کے ادبی تصورات سے بہت متاثر تھے۔ انھوں نے مقدمہ شعروشاعری میں سرسید کے افادی تصور کو پیش کیا ہے۔ سادگی اور اصلیت کے جس تصور کو انھوں نے مقدمہ میں پیش کیا ہے، اسے سرسید کے تصورات کی بازگشت قرار دیا جا سکتا ہے، اسی کے ساتھ انھوں نے اس کتاب میں ادب کے جس افادی تصور کو پیش کیا ہے اسے بھی سرسید کے خیالات کے اثرات کے طور پر دیکھا جانا چاہیے۔

سرسید کی حیات میں ہی خواجہ حالی نے مسدس مدوجزر اسلام لکھ کر خوابیدہ قوم کو جگانے کی کوشش کی تھی۔ یہ وہ نظم ہے جسے سرسید اپنی فلاح کا ذریعہ تصور کرتے تھے، اور کہتے تھے کہ اگر خدا قیامت کے دن پوچھے گا کہ دنیا سے کیا لایا ہے، تو میں کہوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوا کر لایا ہوں۔

11.6 فرہنگ:

۔تصحیح: درست کرنا، غلطی دور کرنا

۔تدوین: جمع وترتیب

۔بنیاد گزار : بانی

۔مقفی: ایسا بیان یا تحریر، جس میں ہم قافیہ اور ہم آہنگ الفاظ استعمال کیے گئے ہوں۔

۔مسجع: وہ نثری عبارت، جس کے جملے ہم قافیہ ہوں۔

۔تقدم: مقدم ہونا، سبقت

۔مافی الضمیر :دل کی بات ۔مطلب

۔قافیہ پیمائی: تک بندی

۔عبارت آرائی: ایسے الفاظ، تراکیب اور انداز بیان اختیار کرنا، جس سے تحریر میں رنگینی پیدا ہو جائے۔

۔قاری: پڑھنے والا

۔تفنن طبع: دل بہلانا، دل لگی

۔افادی: فائدہ مند

۔نابغہ: غیر معمولی ذہین۔عبقری

۔ترسیل: ابلاغ

۔انطباق: موافقت

۔تنوع: قسم قسم کا ہونا، نیاپن

۔مدوجزر: جوار بھاٹا

11.7 کتب حوالہ:

خواجہ الطاف حسین حالی: حیات جاوید

انتخاب مضامین سرسید

سید عبداللہ: سرسید اوران کے نام ورفقا

جمیل جالبی: تاریخ ادب اردو، جلد چہارم، حصہ دوم

رام بابوسکسینہ: تاریخ ادب اردو

ڈاکٹر سلیم اختر: اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ

ثریا حسین: سرسید احمد خاں اوران کا عہد

اکائی:12 سر سید احمد خاں کی سیاسی وسماجی خدمات کا جائزہ

ساخت

12.0 مقصد

12.1 تمہید

12.2 پس منظر

12.3 سر سید احمد خاں کے سیاسی خدمات

12.4 سر سید احمد خاں کی سماجی خدمات

12.5 فرہنگ

12.6 کتب برائے مطالعہ

12.0 مقصد:

اس اکائی کے مطالعہ سے آپ سر سید احمد خاں کی سیاسی وسماجی خدمات کو بہتر طور پر سمجھ سکیں گے۔ اس مطالعہ کے بعد آپ کو یہ علم ہو جائے گا کہ:

*سر سید احمد خاں کے سیاسی کردار کی گہرائی کو بآسانی سمجھ سکیں۔

*سر سید احمد خاں کے سماجی کردار کی اہمیت کو سمجھ سکیں گے۔

*سر سید احمد خاں کی ہندوستانی قوم کے لیے سیاسی وسماجی خدمات کا بغور جائزہ لے سکیں۔

12.1 تمہید:

انیسویں صدی کے بھارت میں جہاں برطانوی سامراج کے سائے تلے ہندوستانی معاشرت وسیاست میں نہایت اہم اور نمایاں تغیرات رونما ہو رہے تھے، وہاں ایک عظیم شخصیت نے علم وشعور کی شمع روشن کی۔ انگریزوں کی ہندوستان پر سیاسی گرفت مضبوط ہو رہی تھی اور 1857 کی جنگ آزادی کی ناکامی نے ہندوستانی عوام کو مایوسی اور ناامیدی کے گہرے سمندر میں دھکیل دیا تھا۔ اسی اثنا میں مسلمانان ہند کے سیاسی وسماجی احوال دگرگوں تھے۔ اِسی پس منظر میں ایک ایسے مصلح قوم کا ظہور ہوا جس نے نہ صرف مسلمانوں کی حالت زار کو سنوارنے کا بیڑہ اُٹھایا بلکہ اپنی بے مثال سیاسی وسماجی خدمات کے ذریعے انہیں ترقی اور کامیابی کی راہ دکھائی۔ اس دردمند شخصیت کا نام سر سید احمد خاں تھا۔ انہوں نے اس امر کا بخوبی ادراک کیا کہ بدلتے ہوئے زمانے کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے مسلمانان ہند کو جدید علوم سے روشناس کرانا ناگزیر ہے۔ چنانچہ انہوں قوم کی بیداری اور جدید علوم کے سلسلے کا آغاز کیا جو بعد میں علی گڑھ تحریک کے نام سے مشہور ہوئی جس کے تحت جدید تعلیمی اداروں کی بنیاد رکھی اور مسلمانان ہند کو مغربی علوم وفنون کی طرف مائل کیا۔ اس کے علاوہ سر سید احمد خاں نے

مسلمانان ہند کے سیاسی حقوق کے تحفظ کے لیے بھی اہم اقدامات کیے اور ان کی سماجی و سیاسی بیداری میں نمایاں کردار ادا کیا۔

12.2 پس منظر:

انیسویں صدی کے وسط میں، جب انگریزوں کی حکومت کے زیر سایہ ہندوستان کے سیاسی، سماجی اور معاشرتی حالات میں گہرے انقلابات برپا ہورہے تھے، تو اس وقت مسلمانان ہند ایک مشکل دور سے گزر رہے تھے کیوں کہ انگریزی سامراج نے طاقت کے بل پر ہندوستا کے روایتی معاشرتی ڈھانچے کی جڑوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا اور 1857 کی جنگ آزادی کی ناکامی نے ہندوستانی عوام میں مایوسی اور ناامیدی کی فضا پیدا کرکے برطانوی حکومت نے ہندوستان میں اپنی سیاسی گرفت مضبوط کرلی تھی اور ہندوستانیوں کے معاشرتی وثقافتی اقدار کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کی کوششیں کی جارہی تھیں جس سے ہندوستانی عوام ذہنی کشمکش میں مبتلا ہوکر احساس کمتری کا شکار ہوتی جارہی تھی۔

تاریخی اوراق کھنگالنے پر یہ واضح ہوتا ہے کہ مسلمان جو کبھی اس سرزمین پر حکومت کرتے تھے لیکن انگریزی تسلط کے بعد اب لیے ایک نیا راستہ تلاش کررہے تھے البتہ انگریزی تعلیم اور جدید علوم کی ضرورت کو محسوس کرنے والے بہت سارے مصلح قوم اُٹھ کھڑے ہوئے جنھوں نے منفرد طور طریقے سے سیاسی وسماجی سرگرمیوں اور تحریکات کے توسط سے ہندوستانی قوم کو بیدار کرنے اور انگریزوں کی بدعنوانیوں کو سمجھ نے کے لیے مخلصانہ خدمات انجام دیں۔ ایسے ہی قوم کا درد رکھنے والا ایک مصلح قوم کا نام سرسید احمد خاں ہے، جنھوں نے ہندوستانی قوم کے تئیں سیاسی وسماجی کاوشیں تیز رکھیں جنھوں نے بعد میں علی گڑھ تحریک کا روپ اختیار کرلیا۔

سرسید احمد خاں کو ہندوستانی قوم کا زوال کی طرف جاتے ہوئے سخت تکلیف دہ محسوس ہوتا تھا تو انھوں نے معاشرتی وتعلیمی پسماندگی کو دور کرنے کے لیے عملی اقدامات اٹھے نے کا عزم کیا۔ اس میں سب سے نمایاں شخصیت، سرسید احمد خاں کی ہے جنھوں نے مسلمانوں کے تعلیمی و معاشرتی احوال کو سدھارنے کا بیڑہ اُٹھایا، انھوں نے سب سے پہلے مسلمانوں کو جدید تعلیم کے اہم مقاصد سے روشناس کرانے کی کوشش کی۔ ان کے نزدیک یہ ناگزیر تھا کہ مسلمان مغربی علوم وفنون سے استفادہ کریں تاکہ وہ وقت کے ساتھ ہم آہنگ ہوسکیں۔ اس مقصد کے تحت علی گڑھ تحریک کی بنیاد رکھی گئی جو ایک تعلیمی وسماجی تحریک تھی۔ اس تحریک نے مسلمانوں کو جدید علوم کی طرف گامزن کیا اور انہیں تعلیم کی روشنی کی ایک نئی کرن دکھائی۔

علاوہ ازیں سرسید احمد خاں نے ہندوستانی باشندوں کے سیاسی حقوق کے تحفظ کے لیے اہم اقدامات کیے۔ انھوں نے جہاں مسلمانان ہند کے سیاسی معاملات میں دردِدل سے رہنمائی کی۔ ان کے حقوق کی پاسداری کے لیے اپنی آواز بلند کی وہیں انھوں نے ان کی سماجی بیداری میں بھی نمایاں کردار ادا کیا۔

سر سید اس بات کے قائل تھے کہ مسلمانان ہند کو اپنی سماجی حالت کو بہتر بنانے کے لیے خود انحصاری کا راستہ اپنانا ہوگا۔ انہوں نے سماجی اصلاحات کے ذریعے مسلمانوں کو معاشرتی برائیوں سے نجات دلانے کے لیے اہم کردار ادا کیا بلکہ ان کی تحریروں اور تقریروں میں اس بات کی واضح فکر ملتی ہے کہ مسلمانوں کو اپنی حالت خود بہتر بنانی ہوگی اور انگریزوں کے زیر نگرانی ہو تے ہوئے بھی اپنے معیار اور خودداری کی چمک قایم رکھنی ہوگی۔

مختصر طور پر غور و فکر کیا جائے تو اس پس منظر سے یہ واضح ہوتا ہے کہ سر سید احمد خاں کی کاوشوں نے کس طرح مسلمانانِ ہند کو ایک نئی راہ دکھائی اور انہیں ترقی و خوشحالی کی طرف گامزن کیا۔ ان کی بے مثال سیاسی و سماجی خدمات نے نہ صرف اس دور کے مخصوص حالات و واقعات کی روشنی میں اہمیت اختیار کی بلکہ تصنیف و تالیف، مضامین، صحافتی سلسلے کے عمل سے بھی مسلمانانِ ہند کے تعلیمی، سیاسی اور سماجی انحطاط توڑنے کے لیے اہم کردار ادا کیا۔

سر سید مسلمانان ہند کے تنزل کے سد باب کے ساتھ ساتھ انہیں سیاسی و سماجی طور پر بیدار کرنے کے لیے اہم خدمات انجام دیں ہیں جو آج بھی ہمارے لیے ایک روشن مثال کے طور پر موجود ہیں۔ ان کے اقدامات نے مسلمانان ہند کو تعلیمی، سیاسی اور سماجی میدانوں میں ایک نئی زندگی بخشی اور ان کے حوصلے بلند کیے۔ ان کی بے لوث خدمات نے ہندوستانیوں کے دلوں میں امید کی نئی کرن جگا دی اور ان کے لیے ترقی کی نئی راہیں ہموار کیں۔

3:12 سیاسی خدمات:

انیسویں صدی کے دوران انگریزی حکومت کے زیر تسلط ہندوستانی سیاسی اور سماجی اعتبار سے پسماندگی کا شکار تھے۔ سر سید احمد خاں نے اپنے دور اندیش اور مدبرانہ فکر و عمل کے ذریعے ہندوستانیوں کی بالخصوص مسلمانان ہند کی سیاسی بیداری اور ان کے حقوق کے تحفظ کے لیے بے مثال خدمات انجام دیں، ان کا سیاسی سفر اور خدمات برصغیر کے مسلمانوں کے لیے ایک مشعل راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

سر سید احمد خاں نے سب سے پہلے مسلمانوں کی تعلیمی اور سماجی اصلاحات پر زور دیا کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ تعلیم کے بغیر کسی قوم کی ترقی ممکن نہیں۔ تاہم اُن کے سیاسی خدمات بھی نہایت اہم اور دوررس نتائج کی حامل تھیں۔ انہوں نے مسلمانوں کو

اس بات کا احساس دلایا کہ وہ صرف تعلیمی میدان میں ہی نہیں بلکہ سیاسی میدان میں بھی اپنی موجودگی اور حقوق کا دفاع کریں۔ اس حوالے سے انہوں نے مسلمانان ہند کے سیاسی حقوق کے لیے کئی اہم اقدامات کیے۔ اس میں ان کا سب سے اہم پیغام یہ تھا کہ مسلمان انگریزی حکومت کے ساتھ مل کر کام کریں اور اپنی وفاداری کا ثبوت دیں تا کہ ان کے حقوق محفوظ رہیں اور ان کی سیاسی حیثیت مضبوط ہو۔ انہوں نے مسلمانان ہند کو اس بات سے باور کرایا کہ انگریزی حکومت کے ساتھ مخاصمت کی بجائے مفاہمت کی پالیسی اپنانے کی ضرورت ہے تا کہ وہ اپنی

تعلیمی اور سماجی ترقی کے ساتھ ساتھ سیاسی حقوق بھی حاصل کرسکیں۔

سر سید احمد خاں نے کانگریس کی بنیاد کے وقت مسلمانان ہندکوخبردار کیا کہ کانگریس کی پالیسیاں مسلمانوں کے حقوق کے دفاع کے لیے ٹھیک ثابت نہیں ہوں گی۔اس سلسلے میں انہوں نے ایک علیحدہ مسلم پلیٹ فارم کی ضرورت پر زور دیا تا کہ مسلمان اپنے مخصوص مسائل اور مطالبات کو مؤثر انداز میں پیش کرسکیں۔ان کی یہ جدوجہد بعد میں مسلم لیگ کی تشکیل کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔

سرسید احمد خاں نے یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ مسلمانوں کو اپنے سیاسی حقوق کے لیے انگریزی حکومت کے ساتھ مذاکرات کا راستہ اپنانے کی اشد ضرورت ہے۔سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کو انگریزی زبان اور قوانین سے واقف ہونے کی ترغیب دی کہ وہ انگریز حکام کے ساتھ بہتر طور پر مکالمہ کرسکیں اور اپنے حقوق کے لیے مضبوط دلائل پیش کرسکیں۔ان کی یہ حکمت عملی مسلمانوں کو سیاسی طور پر مضبوط بنانے میں معاون ثابت ہوئی۔

سرسید احمد خاں کے سیاسی فکر کا ایک اہم پہلو مسلمانان ہند کو جدید دنیا کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا تھا۔انہوں نے مسلمانوں کو جدید علوم وفنون کی طرف راغب کیا تا کہ وہ سیاسی میدان میں اپنے حقوق کے لیے مؤثر طریقے سے جد و جہد کرسکیں انہوں نے ہندوستانی قوم بالخصوص مسلمانان ہند کو اس بات کا احساس دلایا کہ جدید تعلیم کے بغیر نہ تو سیاسی طور پر مضبوطی مل سکتی ہے اور نہ ہی اپنے حقوق کا دفاع کر سکتے ہیں۔اس طرح یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ سرسید کی سیاسی خدمات اور ان کی بصیرت آمیز قیادت نے برصغیر کے مسلمانوں کو نہ صرف سیاسی طور بیدار کیا بلکہ انہیں ایک نئی راہ دکھائی۔ان کے سیاسی فکر نے مسلمانانِ ہند کو ایک متحد اور مضبوط قوم بنانے میں اہم کردار ادا کیا ان کے اقدامات نے نہ صرف مسلمانوں کی موجودہ نسل بلکہ ہندوستانیوں کی آنیوالی نسلوں کے لیے بھی ایک مضبوط بنیاد فراہم کی ہے۔

سرسید احمد خاں کے سیاسی پہلوں کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ انہوں نے مسلمانان ہند کے تئیں سیاسی سطح پر کیسا کردار ادا کیا ہے تو یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ سرسید نے برصغیر کے مسلمانوں کے لیے ایک ایسا اہم راستہ اختیار کیا جس پر چل کر وہ اپنے سیاسی حقوق کا تحفظ کر سکتے ہیں اور ترقی کی منزلیں طے کر سکتے ہیں۔ان کی بے مثال خدمات اور دوراندیشی نے ہندوستانی مسلمانوں کو ایک نئی زندگی بخشی اور ان کی رہنمائی کی۔ان کی سیاسی فکر آج بھی ہمارے لیے مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہیں اور ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ اگر ہم اپنے حقوق کے لیے متحد ہو کر جدوجہد کریں تو کوئی بھی طاقت ہمیں ترقی اور خوشحالی کے راستے سے نہیں روک سکتی۔

سرسید احمد خاں کی سیاسی خدمات اور ان کے بصیرت آمیز کردار نے برصغیر کے مسلمانوں کے لیے ایک نیا راستہ ہموار کیا۔ان کے سیاسی کارنامے اور افکار تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کی سیاسی بیداری،ان کے حقوق کے دفاع اور ان کی ترقی کے لیے بے مثال قربانیاں پیش کی ہیں۔

ان کی سیاسی خدمات کو مکمل طور پر سمجھنے کے لیے ان کے سیاسی پہلوؤں کا احاطہ کرنا ضروری ہے۔

1857 کی جنگ آزادی کے بعد مسلمانوں کی بحالی:- 1857 کی جنگ آزادی کے بعد مسلمانوں کی حالت نہایت ناگفتہ بہ تھی۔ انگریزی سامراج نے مسلمانان ہند کو اس بغاوت کا ذمہ دار ٹھہرایا اور ان پر ظلم و جبر کیا جانے لگا۔ سرسید احمد خاں نے اس وقت مسلمانوں کی بحالی کے لیے کام کیا۔ انہوں نے ''آثارالصنادید'' لکھ کر مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت کا دفاع کیا اور انگریزوں کو یہ باور کرایا کہ مسلمان ایک پرامن قوم ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں اپنی کتاب ''اسباب بغاوت ہند'' میں برطانوی حکومت کو بتایا کہ اس بغاوت کے اسباب کیا تھے اور مستقبل میں ایسی بغاوتوں سے بچنے کے لیے کیا اقدامات ضروری ہیں۔

مسلمانان ہند کے حقوق کے تحفظ کے لیے سرگرمیاں:- سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے ہمیشہ آواز بلند کی، انہوں نے انگریزوں کے ساتھ مذاکرات کا راستہ اختیار کیا تاکہ مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ کیا جاسکے۔ ان کی اس حکمت عملی نے مسلمانوں کو انگریز حکومت کے ساتھ بہتر تعلقات قایم کرنے میں مدد دی۔ انہوں نے مسلمانان ہند کو انگریزی زبان سیکھنے اور برطانوی آئین سے واقف ہونے کی ترغیب دی تاکہ وہ اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کرسکیں۔

علی گڑھ تحریک اور سیاسی بیداری:- سرسید احمد خاں نے علیگڑھ تحریک کا آغاز کیا جس کا مقصد مسلمانوں کو تعلیمی اور سماجی اعتبار سے ترقی یافتہ بنانا تھا تاہم اس تحریک کا ایک اہم پہلو سیاسی بیداری بھی تھا۔ اُنہوں نے علیگڑھ میں ''محمڈن اینگلواورینٹل کالج'' کا قایم کیا جس نے بعد میں علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کی شکل اختیار کی۔ اس ادارے نے مسلمانوں کو جدید تعلیم کے زیور سے اراستہ کیا اور انہیں سیاسی شعور دیا۔ انہوں نے طلبہ کو یہ باور کرایا کہ جدید تعلیم کے بغیر سیاسی میدان میں کامیابی حاصل کرنا مشکل عمل ہے۔

کانگریس کے قیام پر تنقید:- سرسید احمد خاں نے 1885 میں انڈین نیشنل کانگریس کے قیام پر تنقید کی۔ ان کا خیال تھا کہ کانگریس کی پالیسیاں مسلمانان ہند کے حقوق کے تحفظ میں ناکام رہیں گی۔ انہوں نے مسلمانوں کو خبردار کیا کہ کانگریس کے زیر سایہ ان کے حقوق محفوظ نہیں رہ سکتے۔ ان کی یہ بصیرت بعد میں درست ثابت ہوئی جب کانگریس کی پالیسیوں نے مسلمانوں کے حقوق کو نظرانداز کیا۔

بین المذاہب ہم آہنگی کی ترویج:- سرسید احمد خاں نے ہمیشہ بین المذاہب ہم آہنگی کی ترویج کی کوشش کی۔ انہوں نے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تفاوت کو ختم کرنے اور ایک پرامن معاشرہ تشکیل دینے کی کوشش کی۔ ان کے نزدیک مذہبی رواداری اور ہم آہنگی کے بغیر معاشرتی ترقی ممکن نہیں تھی۔ سرسید احمد خاں آپسی بھائی چارے اور ہم آہنگی کے خواہاں تھے۔ اس حوالے سے پروفیسر ضیاالرحمٰن صدیقی نے اپنے مضمون ''سرسید بحثیت تعلیمی مدبر'' میں بہت اہم بات لکھی ہے کہ عالمی سطح (Global Level) پر سرسید احمد

خاں سیکولر تعلیمی مشن کے بانی تھے انہوں نے اپنے تعلیمی افکار اور مذہبی نظریات کو کبھی فرقوں اور مسلکوں میں تقسیم نہیں کیا وہ ہمیشہ مذہبی اور لسانی سطح پر یکسانیت اور مساوات کے علمبردار رہے۔ انہوں نے اپنی علمی بصیرت اور دانشوری کو تعلیم کی ترویج کے لیے وقف کر دیا۔

مذکورہ سطور سے بھی واضح ہو جاتا ہے کہ سر سید آپسی اتحاد کے خواہاں تھے۔ انہوں نے مسلمانانِ ہند کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ دوسرے مذاہب کے لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہیں اور ایک مضبوط و متحد قوم کی حیثیت سے ابھریں اور ترقی کے راستوں کو ہموار کریں۔

اقتصادی خود کفالت کی ترغیب:- سر سید احمد خاں نے مسلمانوں کو اقتصادی خود کفالت کی طرف بھی گامزن کیا۔ ان کے نزدیک اقتصادی مضبوطی کے بغیر کسی بھی قوم کی ترقی اور کامیابی ممکن نہیں۔ انہوں نے مسلمانوں کو صنعت و تجارت کی اہمیت سے آگاہ کیا اور انہیں خود انحصاری کی ترغیب دی اور مسلمانوں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ جدید اقتصادی نظام کو اپنائیں اور معاشیات میں بھی خود کو منوائیں۔ اس حوالے سے سر سید احمد خاں نے اہم اقدامات کیے۔ اِس حوالے سے پروفیسر ضیاالرحمٰن صدیقی اپنے مضمون ''سر سید بحیثیت تعلیمی مدبر'' میں لکھتے ہیں کہ انگریزی سے مسلمانوں کی بے توجہی، بیزاری نیز اردو سے جذباتی لگاؤ اور مذہبی وابستگی کے مدنظر سر سید نے 1864 میں غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی قایم کی اس سوسائٹی کے تحت متعدد مغربی سائنسی اور علمی کتابوں کا انگریزی اور دیگر زبانوں سے اردو میں ترجمے کروائے گئے جس کے ذریعہ مسلم نوجوان جو انگریزی سے واقف نہیں تھے وہ بھی عصری سائنسی علوم سے خاطر خواہ واقفیت حاصل کر سکیں۔ علاوہ ازیں صنعت و حرفت، باغبانی و دستکاری، معیشت و زراعت سے متعلق کتابوں کے ترجمے بھی اردو میں کرائے گئے۔

سیاسی حقوق کے دفاع کے لیے جدوجہد:- سر سید احمد خاں نے ہمیشہ برصغیر کے مسلمانوں کے سیاسی حقوق کے تحفظ کے لیے جدوجہد کی، انہوں نے انگریزوں کے ساتھ مذاکرات کے ذریعے مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ کیا اور ان کی سیاسی حیثیت کو مستحکم کیا، ان کی سیاسی بصیرت نے مسلمانوں کو ان کے حقوق کے لیے مؤثر طریقے سے جدوجہد کرنے کا راستہ دکھایا۔

مجلس شوریٰ میں مسلمانوں کی نمائندگی:- سر سید احمد خاں نے مسلمانوں کی سیاسی نمائندگی کے لیے مجلس شوریٰ میں شامل ہونے کی ضرورت پر زور دیا، انہوں نے یہ محسوس کیا کہ مسلمانوں کو اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے سیاسی اداروں میں فعال کردار ادا کرنا ہوگا۔ ان کی کوششوں کے بعد مسلمانوں نے مجلس شوریٰ میں اپنی نمائندگی بڑھائی اور اپنی آواز بلند کی سر سید نے مسلمانوں کو یہ باور کرایا کہ سیاسی اداروں میں شمولیت کے بغیر ان کے حقوق کا تحفظ ممکن نہیں۔

تعلیمی اداروں میں سیاسی تربیت:- سر سید احمد خاں نے تعلیمی اداروں کو سیاسی تربیت کا مرکز بنایا۔

انہوں نے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میں طلبہ کو سیاسی شعور دینے کے لیے مختلف سرگرمیوں کا آغاز کیا ان کا مقصد تھا کہ طلبہ نہ صرف تعلیمی میدان میں کامیاب ہوں بلکہ سیاسی میدان میں بھی اپنی جگہ بنائیں۔ انہوں نے طلبہ کو سیاسی مباحثوں اور مذاکروں میں حصہ لینے کی ترغیب دی کہ وہ سیاسی مسائل کو سمجھ سکیں اور ان کے حل کے لیے مؤثر حکمت عملی تیار کر سکیں۔

مسلمانوں کے سیاسی حقوق کے لیے انگریزوں کے ساتھ مکالمہ:- مسلمانوں کے سیاسی حقوق کے تحفظ کے لیے سرسید نے انگریزوں کے ساتھ مکالمہ کا راستہ اختیار کرنے پر زور دیا۔ ان کی حکمت یہ تھی کہ مسلمانوں کو براہ راست لڑائی جھگڑے کے بجائے مذاکرات اور مکالمہ کے ذریعے اپنے حقوق کا تحفظ کرنا چاہیے۔ انہوں نے انگریز حکام کے ساتھ متعدد ملاقاتیں کیں اور مسلمانوں کے مسائل کو ان کے سامنے پیش کیا، ان کی اس حکمت عملی نے مسلمانوں کے حقوق کے دفاع کے لیے اہم کردار ادا کیا۔

سیاسی اتحاد اور یکجہتی کی تلقین:- سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کو سیاسی اتحاد اور یکجہتی کی تلقین کی، ان کا ماننا تھا کہ مسلمانوں کو ایک متحد قوم بن کر اپنے حقوق کے لیے جدوجہد کرنی چاہیے۔ انہوں نے مسلمانوں کے مختلف فرقوں اور گروہوں کے درمیان اتحاد کی کوششیں کیں تا کہ مشترکہ طور پر اپنے حقوق کے لیے جدوجہد کر سکیں، ان کی اس حکمت عملی نے مسلمانوں کو ایک مضبوط اور متحد قوم بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔

مسلمانانِ ہند کے سیاسی مسائل پر کتابیں اور مضامین لکھنے کو ترغیب دی:- برصغیر کے مسلمانوں کے سیاسی مسائل پر سرسید احمد خاں نے متعدد کتابیں اور مضامین لکھے۔ ان کی تصانیف میں سیاسی بصیرت اور حکمت عملی کی جھلک نظر آتی ہے۔ انہوں نے اپنی تحریروں، تقریروں کے ذریعے مسلمانان ہند کو سیاسی بیداری عطا کی اور انہیں اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے راہنمائی فراہم کی۔ ان کی کتاب ''اسباب بغاوت ہند'' نے نہ صرف برطانوی حکومت کو مسلمانوں کے مسائل سے آگاہ کیا بلکہ مسلمانوں کو بھی اپنے حقوق کے لیے جدوجہد کرنے کی ترغیب دی۔

ہندو مسلم اتحاد کی کوششیں:- سرسید احمد خاں نے ہندو مسلم اتحاد کی اہمیت پر زور دیا ان کا ماننا تھا کہ برصغیر کے مسلمانوں اور ہندوؤں کو ایک متحد قوم بن کر جدوجہد کرنی چاہیے۔ انہوں نے دونوں قوموں کے درمیان ہم آہنگی اور اتحاد کے فروغ کے لیے مختلف اقدامات کیے۔ انہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اعتماد کی فضا پیدا کرنے کی کوششیں کیں تا کہ ہم مشترکہ طور پر اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کر سکیں۔

مستقبل کی سیاسی رہنمائی:- سرسید احمد خاں کی سیاسی بصیرت اور حکمت عملی نے مسلمانوں کو مستقبل کے سیاسی رہنمائی فراہم کی ان کی خدمات اور افکار نے مسلمانوں کو ایک نئی راہ دکھائی اور انہیں ترقی کی منازل طے کرنے کی ترغیب دی۔ ان کے سیاسی خدمات نے مسلمانوں کو نہ صرف موجودہ دور کے مسائل سے نمٹنے کے لیے

راہنمائی فراہم کی بلکہ مستقبل کے لیے بھی ایک مضبوط بنیاد فراہم کی۔

عدلیہ میں مسلمانوں کے حقوق کا دفاع:- سر سید احمد خاں نے عدلیہ میں مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے جو کردار ادا کیا وہ قابل ستائش ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کو قانونی نظام سے واقفیت حاصل کرنے کی ترغیب دی کہ وہ اپنے حقوق کے لیے عدالتوں میں مؤثر طریقے سے جدوجہد کرسکیں۔ انہوں نے مسلمانوں کو انگریزی قانون کی تعلیم حاصل کرنے کی راہ دیکھائی تا کہ وہ انگریزوں کے عدالتی نظام کے تحت اپنے حقوق کی پاسداری کرسکیں۔

عوامی جلسوں اور تقاریر کے ذریعے سیاسی شعور کی بیداری:- عوامی جلسے جلوسوں اور اپنی تحریروں ،تقاریر کے ذریعے سر سید احمد خاں نے مسلمانان ہند میں سیاسی شعور بیدار کرنے کی کوششیں کیں انہوں نے مختلف مقامات پر خطبات دیئے جن میں انہوں نے مسلمانوں کو اپنے سیاسی حقوق کے بارے میں آگاہ کیا اور انہیں متحد ہونے کی تلقین کی۔ ان کی تقاریر نے مسلمانوں میں سیاسی بیداری کی لہر دوڑائی اور انہیں اپنے حقوق کے لیے جدوجہد کرنے کی تحریک دی۔

رسائل و جرائد کا اجرا:- سر سید احمد خاں نے مسلمانوں کے مسائل اور مطالبات کو عام کرنے کے لیے اخبارات اور رسائل کا بھی اجرا کیا، انہوں نے ''تہذیب الاخلاق'' کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا جس میں مسلمانوں کے تعلیمی، سماجی اور سیاسی مسائل پر مضامین شائع کیے گئے۔ اس رسالے نے مسلمانوں کو ان کے حقوق کے بارے میں آگاہ کیا اور انہیں سماجی شعور کے ساتھ ساتھ سیاسی بیداری کی طرف بھی مائل کیا۔

سیاسی مذاکرات اور کانفرنسز میں شرکت:- سر سید احمد خاں نے مسلمانوں کے حقوق کے لیے سیاسی مذاکرات اور کانفرنسوں میں بھرپور شرکت کی۔ انہوں نے انگریز حکمرانوں کے ساتھ ملاقاتیں کیں اور مسلمانوں کے مسائل کو ان کے سامنے پیش کیا۔ ان کی کوشش تھی کہ مسلمانوں کے حقوق کا بچاؤ مذاکرات کے ذریعے کیا جائے اور ان کے مسائل کو پرامن طریقے سے حل کیا جائے۔ ان کی اس حکمت عملی نے برصغیر کے مسلمانوں کو برطانوی حکومت کے ساتھ بہتر تعلقات قایم کرنے میں مدد دی۔

قومی تحریکات کی حمایت:- قومی تحریکوں کی بھی حمایت پر سر سید احمد خاں نے زور دیا جس کا اصل مقصد مسلمانان ہند کے حقوق کا تحفظ اور ان کی ترقی تھا۔ انہوں نے مسلمانوں کو قومی سطح پر متحد ہونے اور اپنے سیاسی و سماجی حقوق کے لیے مشترکہ جدوجہد کرنے کی ترغیب دی۔ ان کی اس حمایت نے برصغیر کے مسلمانوں کو ایک مضبوط قومی تحریک کی بنیاد فراہم کی اور انہیں ایک مضبوط سیاسی قوت بنایا۔

سیاسی مشاورت اور راہنمائی:- برصغیر کے مسلمانوں کو سیاسی مشاورت اور راہنمائی فراہم کرنے کے لیے سر سید احمد خاں نے مختلف مواقع پر مسلمانوں کو سیاسی مسائل کے حل کے لیے مشورے دیئے اور انہیں درست

حکمت عملی اپنانے کی تلقین کی۔ان کی یہ مشاورت اور راہنمائی مسلمانوں کو سیاسی میدان میں کامیاب بنانے میں معاون ثابت ہوئی۔

مختصر طور پر سر سید احمد خاں کے سیاسی پہلوؤں کو مدنظر رکھ کر احاطہ کرتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے ہندوستانی قوم، بالخصوص مسلمانانِ ہند جو انگریزی طاقت کے نشانے پر تھے اس مصلح قوم نے ایک ایسا کر استہ اختیار کیا جس پر چل کر وہ اپنے سیاسی حقوق کا تحفظ کر سکتے تھے اور ترقی کی منزلیں طے کر سکتے تھے۔ سر سید کا ہندوستانی قوم کے تئیں سیاسی نظریہ بے مثال اور دور اندیش تھا جس نے مسلمانانِ ہند کو ایک نئی زندگی بخشی۔ان کی سیاسی فکر آج بھی ہمارے لیے مشعل راہ ہے اور ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ اگر ہم اپنے حقوق کے لیے یکجا ہو کر جدوجہد کریں تو کوئی بھی طاقت ہمیں ترقی اور خوشحالی کے راہ سے نہیں روک سکتی۔ ان کی زندگی اور کارنامے ہمیں یہ یاددلاتے ہیں کہ اگر ہم بھی اپنے معاشرتی و تعلیمی مسائل کو حل کرنے کے لیے اسی جذبے اور خلوص کے ساتھ کام کریں تو ہم بھی ترقی اور خوشحالی کی منزلیں طے کر سکتے ہیں۔

سر سید احمد خاں کی سیاسی خدمات اور افکار ہندوستانیوں کے لیے ایک دائمی ورثہ ہیں جو ہمیشہ مسلمانانِ ہند کو جدوجہد اور کامیابی کی راہ پر گان رہنے کی ترغیب دیتے رہیں گے۔

اپنی معلومات کی جانچ کیجیے:

1. سر سید احمد خان نے 1857 کی جنگ آزادکے بعد مسلمانانِ ہند کی بحالی کے لیے کون سے قدامات اُٹھائے؟

2. سر سید احمد خاں نے برصغیر کے مسلمانوں کے سیاسی حقوق کے دفاع کے لیے کون سی حکمت عملی اپنائی؟

3. سر سید احمد خاں نے مسلمانانِ ہند کو جدید تعلیم کی طرف راغب کرنے کے لیے کون سے اقدامات کیے؟

4. سر سید احمد خاں نے ہندو مسلم اتحاد کے لیے کون سے اقدامات اُٹھائے اور ان کا کیا اثر ہوا؟

12.4 سماجی خدمات:

سر سید احمد خاں، ایک ایسے نامور مصلح، دانشور اور مدبر ہیں جنہوں نے برصغیر کی مسلم قوم کے لیے راستے متعین کیے۔ان کی شخصیت، ان کے افکار اور ان کی خدمات نے تاریخ کے دامن میں ان مٹ نقش چھوڑا ہے۔ انیسویں صدی کا ہندوستان سماجی، سیاسی اور تعلیمی اعتبار سے ایک اہم دور سے گزر رہا تھا۔ برطانوی راج کے زیر سایہ ہندوستانی معاشرتی ڈھانچے میں تیزی سے تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔اس دور میں مسلمانوں کی حالت زار خاص طور پر تشوشناک تھی۔سر سید احمد خاں نے ایسے دور میں اپنی خدمات فراہم کیں جب مسلمانوں کے سماجی، تعلیمی اور سیاسی حالات انتہائی پستی کا شکار تھے۔ان کی بصیرت افروز قیادت نے نہ صرف مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کیا بلکہ انہیں ایک نئی سمت اور نیا مقصد فراہم کیا۔

سرسید احمد خاں نے ولایت روانہ ہونے سے قبل اپنی تحریروں اور سائنٹفک سوسائٹی کے اخبار انسٹیٹیوٹ گزٹ میں معاشرے کی اصلاح کے سلسلے میں اخلاقی اور معاشرتی نوعیت کے مضامین کی شروعات کر کے سماجی سطح پر اصلاح کا کام شروع کر دیا تھا۔ البتہ سرسید 1870 میں ولایت سے جب واپس آئے تو انہوں نے معاشرے کی اصلاح اور جدید سائنسی نظام کے تحت تعلیمی نظام کو عام کرنے کے لیے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علیگڑھ میں قایم کر کے جدید تعلیمی نظام کی شروعات کی ، ان کی سماجی خدمات کو مکمل طور پر سمجھنے کے لیے ان کے سیاسی پہلوؤں کا احاطہ کرنا لازمی ہے۔

تعلیمی خدمات:- سرسید احمد خاں کی سماجی خدمات کے حوالے سے بات کی جائے تو تاریخی اوراق پر یہ واضح ہوتا ہے کہ سرسید نے سب سے پہلے سماجی ترقی اور بہتری کے لیے جدید تعلیم کو سب سے اہم ہتھیار سمجھا اس سے انہوں نے قوم کی پسماندگی اور جہالت کو دور کرنے کی کوشش کی ۔ 1857 کی جنگ آزادی کے بعد، انہوں نے محسوس کیا کہ قوم کی نجات اور ترقی کا راستہ جدید تعلیم کے حصول میں ہی مضمر ہے۔

سرسید احمد خاں نے ولایت جانے سے قبل اپنی تحریروں اور سائنٹفک سوسائٹی کے اخبار ''انسٹیٹیوٹ گزٹ '' میں معاشرے کی اصلاح اور ترقی کے سلسلے میں اخلاقی اور معاشرتی نوعیت کے مضامین کی شروعات کی سماجی سطح پر اصلاح کام شروع کر دیا البتہ سرسید 1870 میں ولایت سے جب واپس آئے تو انہوں نے وہاں کے جدید تعلیمی نظام، وہاں کے تعلیمی اداروں کا نظام اور معاشرے کی اصلاح وغیرہ جیسے نظام کو دیکھا اور سمجھا، ہندوستان آ کر انہوں نے معاشرے کی اصلاح اور جدید سائنسی نظام کے تحت تعلیمی نظام کو عام کرنے کے لیے 1875 میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ میں قایم کیا اور جدید تعلیمی نظام کی شروعات کی جو آج کی تاریخ میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے مشہور ہے۔ یہ ادارہ برصغیر کے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کا آج ایک مرکز بنا ہوا ہے۔ اس نے کئی نامور شخصیات پیدا کیں جو مختلف شعبوں میں ملک و قوم کی خدمت کر رہی ہیں ۔ ان کے تعلیمی کردار نے ایک ایسی نسل تیار کی جو نہ صرف علمی میدان میں مہارت رکھتی ہے بلکہ عملی زندگی میں بھی اپنی بصیرت اور قابلیت کی بدولت نمایاں مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی۔

علمی وادبی خدمات:- سرسید احمد خاں کی علمی و ادبی خدمات بھی قابل قدر ہیں۔ انہوں نے اپنی تحریروں اور تقاریر کے ذریعے مسلمانوں کو جدید علوم وفنون کی طرف راغب کیا۔ ان کی تصانیف میں ''آثار الصنادید'' اور ''خطبات احمدیہ'' شامل ہیں جنہوں نے برصغیر کے مسلمانوں کی علمی اور فکری ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔ انہوں نے تعلیمی اور معاشرتی اصلاح کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ''تہذیب الاخلاق'' کے نام سے ایک رسالہ بھی جاری کیا جسے ''محمڈن سوشل رفارمر'' بھی کہا جاتا ہے۔ اِس کا اصل مقصد مسلمانوں میں جدید فکری رجحانات کو فروغ دینا اور معاشرتی سطح پر اخلاقی قدروں کو عام کرنا، برائیوں کا قلع قمع کرنا جو سماج کو گھن کی طرح

کھا رہی تھیں۔ سماجی سطح پر اخلاقی پہلوں کو عام کرنے کے لیے سرسید احمد خاں کی تحریریں اور تقاریر ایسی تھیں جو عوام کے دلوں و دماغ پر نقش ہو جاتیں اور ان کے فکر و شعور کو بیدار کرنے میں اہم کردار ادا کرتی تھیں۔

سماجی اصلاحات:- سرسید احمد خاں نے ہندوستانی قوم بالخصوص مسلمانان ہند کی سماجی حالت کو بہتر بنانے کے لیے متعدد اقدامات کیے۔ اُنہوں نے سماجی برائیوں کے خلاف آواز بلند کی اور لوگوں کو تعلیم و تربیت کے ذریعے برائیوں سے نجات دلانے کی کوششیں کیں۔ ان کا ماننا تھا کہ معاشرتی ترقی کے بغیر تعلیمی ترقی کو ممکن نہیں بنایا جا سکتا ہے۔

اس حوالے سے پروفیسر ضیا الرحمٰن صدیقی نے بہت اہم بات لکھی ہے کہ سرسید کو اندازہ تھا کہ صرف کتابوں کا مطالعہ کر لینا کافی نہیں ہے، اس کے ساتھ اعلیٰ اقدار، تہذیب و تربیت اور صاف ستھرا معاشرہ بھی درکار ہے۔

سرسید احمد خاں نے عورتوں کی تعلیم پر بھی زور دیا اور انہیں معاشرتی دائرے میں اپنا مقام حاصل کرنے کی ترغیب دی ان کا یہ کارنامہ ناقابل فراموش ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کو جدید معاشرتی تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے اور انہیں ایک مہذب اور باوقار قوم کے طور پر دنیا کے سامنے پیش کرنے کے قابل بنایا۔

سرسید احمد خاں دراصل قوم میں ''خود اعتمادی'' جیسے پہلو کو بیدار کرنا چاہتے تھے جس کے معنی ان کے یہاں یہ تھے کہ دوسروں پر انحصار نہ کریں بلکہ اپنی مشکلات کا حل اور اس کو آسانیوں میں خود تبدیل کرنا سیکھیں۔ یہ تبھی ہو سکتا ہے جب ہم ''اپنی مدد آپ'' کریں گے، ہر فرد و بشر کو اپنی ترقی اور کامیابی کے لیے کسی دوسرے کی مدد یا اس کا انتظار کیے بغیر خود کوشش کرنی چاہیئے اسی کا نام بہتر ترقی ہے۔ سرسید احمد خاں نے ''نا امیدی اور مایوسی'' کو قوم کے لیے مضر قسم کی بیماری قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک ناامیدی اور مایوسی قوم کی ترقی کے لیے سخت رکاوٹ بتایا۔ تاریخی اوراق کھنگالنے پر یہ واضح ہوتا ہے کہ سرسید احمد خاں کو اپنے سیاسی، سماجی اور تعلیمی مشن میں ناکامیوں کا سامنا کرنے کے باوجود اپنے مشن کو جاری رکھا آخر جس کامیابی کا انتظار تھا اس کو حاصل کر کے ہی دم لیا۔ اس کامیابی کے راز کو انہوں نے ناامیدی کی خوشی میں نہایت ہی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ اسی طرح سرسید نے معاشرتی سطح کے رسم و رواج کی پابندی کو بندر کی نقل سے تشبیہ دے کر سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ ان کے نزدیک نقل کے بجائے عقل سے کام لے کر سماج میں اچھی رسموں کو بڑھاوا دیا جائے جس سے بری رسموں کا خاتمہ ہو۔ ''خوشامد'' انشائیہ میں سرسید نے سماجی سطح کی روحانی اور اخلاقی بیمار لوگوں کو بے نقاب کیا ہے جن کی وجہ سے انسان خودغرض اور مطلب پرست ہو جاتا جسمانی بیماریوں کا ظہور اُس کے علاج کو دعوت دیتا ہے۔ اس لیے سرسید کے نزدیک قلبی بیماریوں میں خوشامد ایک ایسی مہلک بیماری ہے کہ اگر کسی کو لگ جائے تو اُسے تباہ و برباد کر سکتی ہے جو انسان کو طرح طرح کے چیلنجوں کا شکار بنا دیتی ہے۔ سرسید نے اِس موضوع پر بہت گہرائی تک اپنی

بات کہنے کوشش کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اگر انسان کواس بات کا علم ہو جائے کہ خوشامد نالائق اور غیر تعلیم یافتہ لوگوں سے پیدا ہوتی ہے تو یقیناً خوشامد کی خواہش کرنے والا ہر شخص خود کو ویسا ہی نالائق تصور کرنے لگ جائے یہ خوشامد ہی ہوتی ہے جس کی وجہ سے انسان اپنے آپ کو معاشرے میں ایسا پیش کرتا ہے جو دراصل حقیقت میں ہوتا نہیں ہے۔اس کی وجہ سے انسان خلوت میں کچھ اور ہوتا ہے اور جلوت میں کچھ اور!

''ریاکاری'' کو سرسید احمد خاں نے تہذیبی و معاشرتی قدروں کا دشمن قرار دیا ہے۔ ریاکاری انسان کے ظاہر و باطن کی الگ الگ تصویر پیش کرتی ہے۔ ریاکاری کا لباس پہن کر انسان اپنے ہمنواؤں کو دھوکہ دے سکتا ہے جس کا نتیجہ آخر دشمنی کے روپ میں سامنے آتا ہے جس سے سماجی سطح کے رشتوں میں دراڑیں پیدا ہو جاتی ہیں۔

کاہلی اور سستی کو سرسید نے انسان کی جسمانی ریاضت کے بجائے عقلی محنت کی کمی کہا ہے۔انہوں نے اپنے انشائیہ میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ انسان کو دل، دماغ اور عقل کو قوم کی ترقی اور کامیابی میں استعمال کرنا چاہیئے یا جس سے سماج میں خوشحالی قایم ہو۔

اسی طرح تعصب کو سرسید نے انسان کی بری عادات میں سے ایک عادت بتائی ہے اس پر فکر کی جائے تو یہ بھی معاشرے کی ترقی میں رکاوٹ ہے کیوں کہ تعصب ایک ایسی خصلت ہے جو انسان کے نیک اعمال کو بربادی کی طرف لے جاتی ہے۔عدل وانصاف کا دھیرے دھیرے خاتمہ ہوتا ہے جس کے نتیجے میں معاشرہ برائیوں کی نظر ہو جاتا ہے۔

مذہبی رواداری اور بین المذاہب ہم آہنگی:- سرسید احمد خاں نے مذہبی رواداری اور بین المذاہب ہم آہنگی کو فروغ دینے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ مختلف مذاہب کے لوگوں کے درمیان محبت اور بھائی چارے کا ماحول قایم ہو ہے۔ ان کے نزدیک مذہبی اختلافات کو ذاتی دشمنی کا سبب نہیں بننا چاہیئے۔انہوں نے مسلمانوں کو ہندوؤں اور دیگر مذاہب کے پیروکاروں کے ساتھ محبت اوراحترام سے پیش آنے کی تلقین۔ ان کی یہ کوششیں ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کو مستحکم کرنے میں مددگار ثابت ہوئیں اور مختلف مذاہب کے درمیان پائی جانے والی دوریوں کو کم کرنے میں معاون ثابت ہوئی سرسید کی اس فکر کی عکاسی کرتے ہوئے پروفیسر ضیاالرحمٰن صدیقی نے بہت اہم بات لکھی ہے کہ محسن علوم وفنون سرسید نے علی گڑھ میں ایسے دانشور، عالم، فنکار، صاحب قلم، تخلیق کار اور عظیم المرتبت شخصیتوں کو ایک چھت کے نیچے لا کر جمع کر دیا جو نہ صرف سائنسی علوم کے فروغ میں معاون ثابت ہوئے بلکہ انہوں نے زبان وادب کے فروغ قایم کو کرنے میں بھی کلیدی کردار ادا کیا۔ان میں ہر مذہب وملت اور رنگ ونسل کے لوگ شامل تھے۔

جدیدت اور اصلاحات:- سرسید احمد خاں نے مسلمانوں میں جدیدت اور اصلاحات کو متعارف کرانے کی بھی بھرپور کوشش کی۔ ان کا ماننا تھا کہ مسلمانوں کو جدید دنیا کے تقاضوں کے مطابق خود کو ڈھالنے کی ضرورت

ہے۔انہوں نے اسلامی اصولوں کے ساتھ جدید سائنسی علوم اور ٹیکنالوجی کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ان کے نزدیک اسلام اور جدیدیت میں کوئی تضاد نہیں تھا بلکہ وہ دونوں کو ایک دوسرے کا متمم سمجھتے تھے۔انہوں نے اپنی تحریروں اور تقاریر میں جدید علوم کے حصول کے اہمیت پر زور دیا اور مسلمانوں کو جدید علوم وفنون کی طرف راغب کیا۔سرسید کے ان خیالات کی عکاسی کرتے ہوئے پروفیسر صدیقی اپنے مضمون ''سرسید بحیثیت تعلیمی مدبر'' میں لکھتے ہیں کہ سرسید تعلیمی نظریہ ساز یعنی Educational Theorist تھے۔وہ مسلمانوں میں جدید تعلیم اور مغربی علوم کے ساتھ نظریہ تعلیم کو فروغ دینے میں بھی دلچسپی رکھتے تھے جو سائنسی علوم سے متعلق تلاش وتحقیق پر مبنی ہو۔اس مقصد کی تکمیل کے لیے انہوں نے اصلاحی اور اخلاقی نوعیت کے مضامین بھی قلم بند کیے۔مزید برآں سرسید نے مغربی تعلیم کو مشرقی طرز فکر میں ڈال کر اس کے نفاذ کی کاوشیں بھی کیں۔سرسید کو شدید احساس تھا کہ حصول علم کے طریقے فرسودہ اور بے اثر ہو چکے ہیں۔وقت کا تقاضا ہے کہ لایعنی فلسفیانہ بحث ومباحث کی دنیا سے قطع نظر علوم وادبیات کی تدریس کے نئے زاویے تلاش کیے جائیں۔

جدید علوم وفنون کے حوالے سے سرسید احمد خاں کا مسلمانانِ ہند کے نام بہت اہم پیغام بھی تھا جس پر عمل کرنا قوم کے لیے ضروری تھا کہ ایک ہاتھ میں قرآن دوسرے میں جدید علوم اور سر پر لاَ اِلٰہَ اِلا اللّٰہ کا تاج ہو۔اس پر غور کیا جائے تو آج کے ترقی یافتہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے دور میں ان سب چیزوں کو ساتھ ساتھ لے کر چلنا ہی قوم کی کامیابی ہے۔

قومی ہم آہنگی اور اتحاد:- سرسید احمد خاں نے قومی ہم آہنگی اور آپسی بھائی چارے کے فروغ کے لیے بھی اہم کردار ادا کیا۔ان کے نزدیک ہندوستان کی ترقی اور خوشحالی کے لیے نہایت ضروری تھا کہ مختلف قومیں اور مذاہب کے لوگ مل جل کر رہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ محبت اور احترام سے پیش آئیں۔علی گڑھ تحریک بنا کر ثابت کیا کہ یک جہتی کسے کہتے ہیں اس تحریک کے گلدستے میں ہندو مسلم اور دیگر مذاہب ومسالک کے لوگ تھے۔سرسید نے ہمیشہ اپنی تحریر وتقاریر میں امن، اتحاد اور یکجہتی کا درس دیا اور عوام میں قومی ہم آہنگی کی اہمیت کو اجاگر کیا۔مذکورہ چند پہلوؤں کو مدنظر رکھ کر سرسید احمد خاں کی سماجی خدمات کا احاطہ کرنے کی حتی الامکان کوشش کی ہے جن میں کچھ انتہائی اہم اور قابل فکر سماجی سطح کی برائیوں کی طرف توجہ مبذول کرانے کی کوشش کی ہے کہ سرسید احمد خاں نے ان کا قلع قمع کرنے کے لیے سماجی سطح پر کیسا کردار ادا کیا ہے اور کس طرح ایک ترقی یافتہ سماج قایم کر کے قوم کو ترقی کے راستوں پر گامزن کیا۔

مختصراً سرسید احمد خاں کی زندگی اور خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے یہ کہنا بجا ہوگا کہ سرسید نے اپنا کل آج کے ہندوستانی عوام کے لیے قربان کر کے ایک نئی صبح کا آغاز کیا۔ان کی بصیرت، ان کی کاوشیں اور ان کی قربانیاں آج بھی ہمارے لیے مشعل راہ ہیں۔ہمیں ان کے افکار ونظریات کو اپنانے اور ان کے نقش قدم پر چلنے کی

ضرورت ہے تا کہ ہم بھی اپنے معاشرے کو ترقی کی راہ پر گامن کرسکیں۔ان کی شخصیت ایک عظیم مصلح، دانشور اور مدبر کے طور پر ہمیشہ یاد رکھی جائے گی اور ان کے سیاسی، سماجی اور تعلیمی خدمات ہمیشہ ہماری تاریخ کا سنہری باب بنی رہیں گی۔ سرسید احمد خاں نے نہ صرف مسلمانان ہند کی تعلیمی، سماجی اور معاشرتی حالت کو بہتر بنانے میں اہم کردار ادا کیا بلکہ انہوں نے ایک مضبوط اور متحرک ہندوستانی قوم کی بنیاد رکھی جو آج بھی ان کے اصولوں اور نظریات پر عمل پیرا ہو کر ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ان کی بصیرت افروز قیادت نے نہ صرف مسلمانوں کو ایک نئی شناخت دی بلکہ انہوں نے دنیا کے سامنے ہندوستان کے باشندوں کو ایک باوقار طور پر پیش کر کے خوشحال اور ترقی یافتہ سماج کی بنیاد رکھی ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ کیجیے:

.1 سرسید احمد خاں نے برصغیر کے مسلمانوں کی سماجی اور تعلیمی بہتری کے لیے کن اقدامات کو ترجیح دی اور ان کے کیا نتائج برآمد ہوئے؟

.2 سرسید احمد خاں کے دور میں ہندوستانی مسلمانوں کی حالت زار کیا تھی اور انہوں نے اس حالت کو بہتر بنانے کے لیے کون سی حکمت عملی پنائی؟

.3 محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے قیام کے پیچھے سرسید احمد خاں کے کیا مقاصد تھے؟

.4 سرسید احمد خاں کی سماجی اصلاحات میں شامل اہم موضوعات کیا تھے۔؟

12.5 فرہنگ:

الفاظ	معنی
پسماندگی	ترقی کی کمی یا پیچھے رہ جانا
مدبرانہ	حکیمانہ، دانشمندانہ
تحفظ	حفاظت، بچاؤ
مشعل راہ	راہنمائی کی علامت
مخاصمت	دشمنی، عداوت
مفاہمت	صلح، باہمی سمجھوتا
پیش خیمہ	پیشگوئی
بصیرت آمیز	دانشمندانہ
مکالمہ	بات چیت، مذاکرات
خلوص	سچائی، دل سے

مصلح	صلح کرنیوالا
بصیرت افروز	گہری سمجھ بوجھ رکھنے والا
قابل قدر	تعریف کے قابل
رواداری	برداشت
ریاضت	محنت یا جدوجہد
مضمر	پوشیدہ، جو ظاہر نہ ہو
مہذب	اخلاق
تشویش	فکرانگیز
خوداعتمادی	خود پر یقین

12.6 کتب برائے مطالعہ:

1۔ سرسید اور ہندوستانی مسلمان	نورالحسن نقوی
2۔ سرسید اوران کے نامور رفقا	سید عبداللہ
3۔ سرسید اوراردو زبان وادب	پروفیسر قمرالہدیٰ فریدی
4۔ انتخاب مضامین سرسید	انور صدیقی
5۔ اردو صحافت اور سرسید احمد خاں	عبدالحی
6۔ سرسید اوران کے کارنامے	نورالحسن نقوی
7۔ سہ ماہی ''فکر ونظر''	خصوصی شمارہ سرسید (علیگڑھ مسلم) یونیورسٹی کا سہ ماہی، علمی اورادبی رسالہ

☆☆☆

بلاک 4 سرسید احمد خاں کی مقالہ نگاری اور علی گڑھ تحریک

اکائی ۱۳: سرسید احمد خاں کی مقالہ نگاری اور اسلوب تحریر

اکائی ۱۴: شعروادب پر سرسید احمد خاں کے اثرات

اکائی ۱۵: علی گڑھ تحریک اور سرسید احمد خاں

اکائی 13 سرسید احمد خاں کی مقالہ نگاری اور اسلوب تحریر

اکائی کی ساخت

13.1 اغراض و مقاصد

13.2 تمہید

13.3 سرسید احمد خاں کی مقالہ نگاری اور اسلوب تحریر

13.3.1 پس منظر

13.3.2 مقالہ-تعریف اور خصوصیات

13.3.3 سرسید کی مقالہ نگاری-خصوصیات و امتیازات

13.3.4 سرسید کا اسلوب تحریر

13.4 خلاصہ

13.5 آپ نے کیا سیکھا

13.6 اپنی جانچ خود کریں

13.7 سوالوں کے جوابات

13.8 فرہنگ

13.9 کتب برائے مطالعہ

13.1 اغراض و مقاصد

1۔ طلبہ سرسید احمد خاں پر مرتسم ہونے والے ادبی و علمی اثرات سے واقف ہوں گے۔

2۔ طلبہ سرسید احمد خاں کی مقالہ نگاری کے موضوعات سے متعارف ہوں گے۔

3۔ طلبہ سرسید احمد خاں کی مقالہ نگاری کے امتیازات سے واقف ہوں گے۔

4۔ طلبہ سرسید احمد خاں کے اسلوب نگارش سے متعارف ہوں گے۔

5۔ طلبہ سرسید احمد خاں کی لسانی خصوصیات سے واقف ہوں گے۔

13.2 تمہید

سرسید احمد خاں ایک مورخ، مفکر، مصلح، دانشور، مفسر، ماہر تعلیم، بانی علی گڑھ تحریک، مجتہد، صحافی ہونے کے علاوہ ایک بلند پایہ ادیب، شاعر، نثر نگار، سفرنامہ نگار اور جدید اردو نثر کے بانی اور بہترین مقالہ نگار بھی تھے۔ انھوں نے لندن میں رہ کر وہاں کے مضمون نگاروں اور رسائل وجرائد کا مطالعہ کیا تھا اور ان موضوعات کو دیکھنے کی کوشش کی تھی جو اصلاح معاشرت، تہذیب وثقافت اور دیگر سماجی امور کے ریفارم کے لیے تحریر کیے جا رہے تھے۔ سرسید انگریز کی طرز معاشرت، سلیقہ، ڈسپلن، انتظام وانصرام، پوشاک، طریقۂ اظہار اور تعلیمی نصاب سے بے حد متاثر تھے۔ وہ کام کے تئیں اہمیت،

صداقت کی جستجو، تحقیقی کاوشوں اور بے لاگ گفتگو کے بھی گرویدہ تھے۔ وہ ان مادی ترقیوں، سائنسی ایجادات، مغربی علوم کو بھی روایت اور فرسودہ تعلیم اور توہمات کے بالمقابل بے حد اہم تصور کرتے تھے جن کے سبب یوروپ میں ایک روشن باب کھل چکا تھا اور برطانیہ نے اس میں امتیازی صورت اختیار کرلی تھی۔ سرسید نے ان تمام کا مشاہدہ اور مطالعہ اور تجزیہ کیا اور قوم کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ اور اس کے لیے تہذیب الاخلاق کو اپنا وسیلہ بنایا جس میں ان کے مضامین شائع ہوتے تھے۔ آیئے سرسید کی مقالہ نگاری کا جائزہ لیتے ہیں اور ان کے اسلوب تحریر کے بارے میں جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔

13.3 سرسید کی مقالہ نگاری اور اسلوب تحریر

13.3.1 پس منظر

یورپ میں جب خوشحالی، ترقی، سیاسی بیداری اور برتری کا دور عروج پر پہنچا تو انگریزی زبان وادب کو بھی خوب پھلنے پھولنے کا موقع ملا اور دیگر اصناف ادب کی طرح مقالہ نویسی کو بھی فروغ ملا۔ ادب کی اس صنف کے لیے انگریزی میں Essay کا لفظ مروج رہا ہے۔ یورپ میں اس صنف کو ادبی حیثیت عطا کرنے والا پہلا ادیب اطالوی تھا جس کا نام مانتین تھا۔

مقالہ نگاری کو چلن میں لانے اور اس کی ادبی حیثیت متعین کرنے میں لیب، بیکن، میکالے، ہزلٹ، سٹونسن کے نام بے حد اہم ہیں۔ انھوں نے انگریزی زبان میں فلفسیانہ، تاریخی، تنقیدی اور ادبی مضامین تحریر کیے اور بعد والوں کے لیے عظیم ورثہ یادگار چھوڑا۔ ان کے علاوہ امریکہ کے عظیم مصنف ایمرسن نے امریکی تہذیب وثقافت پر بہت سے مضامین لکھے جن میں اخلاقی نقطۂ نظر پیش پیش تھا۔ اس نے تعصب، تنگ نظری، جہالت، توہمات کے خلاف آواز بلند کی۔

بعد میں اس صنف کو مزید مقبول بنانے میں اسٹیل اور ایڈیسن کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ جنھوں نے اسپیکٹر اور ٹیٹلر کے نام سے دو صحیفے نکالے اور پوری دنیا میں مقبول عام حاصل کرلیا۔

اردو میں مضمون نگاری/ مقالہ نگاری کا باقاعدہ آغاز سرسید سے ہی ہوتا ہے۔ جنھوں نے اسٹیل اور ایڈیسن سے متاثر ہوکر ان کا طرز اختیار کیا اور اسپیکٹر اور ٹیٹلر کی طرز پر تہذیب الاخلاق کا ۱۸۷۰ء میں اجرا کیا۔

13.3.2 مقالہ - تعریف اور خصوصیات

مقالہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی قول، مقولہ بمعنی بات اور گفتگو کے آتے ہیں۔ اصطلاح میں کسی خاص موضوع پر علمی، ادبی، تحقیقی وتنقیدی انداز میں صداقت کے ساتھ اور حقائق کی روشنی میں مدلل طریقے سے تحریری اظہار کو مقالہ کہا جاتا ہے۔ مقالہ دراصل سنجیدہ اور عالمانہ بحث کا دوسرا نام ہے جس کے اپنے مخصوص قارئین ہوتے ہیں۔ مقالہ کے لیے انگریزی میں Monopgraph, Treaties, Article, Essay, Thesis, Dessertation کے لفظ موجود ہیں جن کے اپنے اپنے دائرے ہیں اور ان سے ہی معنی کی شناخت ہوتی ہے۔ قاری اس سے ہی کسی قسم کو سمجھ سکتا ہے کہ اس سے کیا مراد ہے۔

کوئی بھی مقالہ تحریر کرنے کے لیے مصنف کوئی موضوع اولاً منتخب کرتا ہے۔اس کے تحت وہ کوئی مفروضہ قائم کرتا ہے جسے ثابت کرنے یا اس کی وضاحت اور توسیع کے لیے پوری تحریر سامنے آتی ہے۔اس دوران وہ مواد کی تحصیل کرتا ہے۔مواد کی فراہمی میں وہ ذوق اور وسعت کے مطابق انتخاب کرتا ہے اور پھر مطالعہ کا گہرائی سے عمل شروع ہوجاتا ہے۔ مطالعہ، مشاہدہ، تجربہ اور یادداشت میں موجود معلومات وغیرہ دوران تحریر کام آتے ہیں جن سے کہ وہ وقتاً فوقتاً شعوری یا لاشعوری طور پر تعاون لیتا رہتا ہے۔ ہر مقالہ نگار کا اپنا منفرد زاویہ نظر ہوتا ہے اور وہ اسی کے تحت ایک مخصوص سمت پر خود کو لے جاتا ہے۔اس کا مخصوص نقطۂ نظر کچھ بھی ہوسکتا ہے جیسے اخلاقی، سماجی، سیاسی، معاشی، معاشرتی، ثقافتی، سائنسی، ادبی غرض کچھ بھی جس کے تحت اس نے مقالہ تحریر کیا ہے۔وہ قاری کو وہاں تک بڑے ہی فطری انداز میں لے جاتا ہے اور اس کو بڑی حد تک اپنے خیال یا فکر سے متفق کرنے یا مختلف سوالات قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

ہر مقالہ کے تین اجزا ہوتے ہیں: (۱) تمہید (۲) درمیان یا وسط (۳) اختتام یا نتیجہ۔

اولاً ہر مقالہ نگار اس موضوع کا تعارف پیش کرتا ہے اور مفروضہ قائم کرتا ہے جس کے تحت وہ مضمون تحریر کرتا ہے۔ پھر درمیانی حصہ میں وہ بحث قائم کرتے ہوئے وضاحت کے ساتھ مدلل طریقے سے اس کو پھیلاتا ہے اور اقسام پر وہ قائم کردہ بحث کے نتائج اخذ کرتا ہے اور کسی خاص مرکز تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔

ہر مقالہ نگار کے اندر ضروری ہے کہ وہ زبان و بیان کا ماہر ہو۔اس کا ذہن اور شعور پختہ ہو۔اس کے اندر تخلیقی صلاحیت ہو،اس کے پاس ذخیرۂ الفاظ ہو اور موثر انداز میں اپنی بات کہنے پر قادر ہو۔اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ بے لاگ اور صاف شفاف شخصیت کا مالک ہو۔اس کے اندر تعصب، خوشامد، ہٹ دھرمی، انتہاپسندی، احساس کمتری وغیرہ نہ ہو۔

ایک اچھے مقالہ کے اوصاف یہ ہیں کہ اس میں قطعیت اور معروضیت ہو۔ بے جا بحث کو ڈھیلا نہ چھوڑا جائے۔ استدلال، موثر اور وضاحتی انداز ہونے کے ساتھ سنجیدگی اور متانت بھی ہو۔مثالوں اور شواہد کو بطور ثبوت بحث کے جواز میں شامل کیا جائے اور اس میں بھی انتخاب ضروری ہے۔اختصار اور جامعیت تحریر کا حصہ ہو۔الا یہ کہ طویل بحث کی گنجائش کہیں پڑ جائے تو مقالہ کی طوالت مناسب ہوگی۔عبارت گنجلک اور پیچیدہ نہ ہو بلکہ صاف ستھری، سادہ سلیس اور رواں ہوں۔ترسیل مقالہ کا اہم وصف ہے لہٰذا جو بات کہی جائے قاری تک اس کی مکمل رسائی ضروری ہے، جملے مختصر اور مکمل ہوں۔ایک جملے میں ایک بات مکمل ادا ہو جائے۔الفاظ کا انتخاب انتہائی مناسب ہو، جس لفظ کی جہاں ضرورت ہو اس کا استعمال بس وہی ہوں لہٰذا متبادل الفاظ سے گریز کیا جائے۔ جہاں ضروری اصطلاحات پیش کرنا لازم ہو وہیں ان کا تذکرہ ہو۔ بحث کو روکھا پھیکا بنانے کے بجائے دلچسپ بنایا جائے تاکہ قاری اکتاہٹ کا شکار نہ ہو۔ادبی چاشنی ہر مقالہ کے لیے از حد ضروری ہے تاکہ مقالہ میں ادبیت برقرار رہے اور اس کا ادبی حسن قائم رہے۔

مقالہ کی یوں تو کئی اقسام ہوسکتی ہیں مگر عموماً ان کو تین حصوں میں منقسم کیا جاتا ہے:

(۱) علمی و سائنسی مقالہ

(۲) ادبی مقالہ

13.3.3 سرسید کی مقالہ نگاری-خصوصیات وامتیازات

سرسید جدید اردو نثر کے بانی بھی ہیں اور مقالہ نگاری کے موسس بھی۔ اسٹیل اور ایڈیسن کی طرز پر انھوں نے اردو میں مقالہ نویسی کا سلسلہ قائم کیا اور اسپیکٹٹر اور ٹیٹلر کی طرز پر تہذیب الاخلاق کا اجرا کیا۔ انگلستان میں دوران قیام انھوں نے دونوں صحیفوں کے اثرات کا اندازہ بخوبی لگالیا تھا۔ ان کو اخلاقی اقدار اور تہذیب وثقافت، سوسائٹی اور معاشرہ کو فروغ دینے کا یہ طریقہ بے حد پسند آیا۔ وہ اپنی قوم کی حالت سے بخوبی واقف تھے اور ان میں اصلاح اور بیداری لانے کے لیے کوشاں بھی۔ لہٰذا انھوں نے طے کیا کہ ملک اور قوم کی حالت بدلنے کے لیے ایسا ہی ایک رسالہ ہندوستان میں شروع کرنا ہوگا جس سے معاشرہ صحت منداوراخلاقی اقدار کا حامل بنے۔ اور یہیں سے مقالہ نگاری کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے۔ حالاں کہ انگلینڈ اور ہندوستان کے ماحول میں بڑا فرق تھا۔ ایک طرف انگلستان میں سکون، تعیش، راحت اور علم وادب کی فضا بے حد ہموار تھی اور دوسری طرف ہندوستان میں انتشار، بدامنی، افلاس، تنگ نظری، توہم، جہالت عام تھی۔ لہٰذا تہذیب الاخلاق کے اجرا اور سرسید اوران کے رفقائے خاص کو اسی طرح مضامین لکھنے میں کئی دشواریوں اور چیلنجز کا سامنا کرنا پڑا۔ ان تمام کا مقابلہ کرتے ہوئے انھوں نے بڑی جرأت اور خلوص کے ساتھ سماجی وتہذیبی نوعیت کے مضامین پیش کیے۔ عبدالقیوم صاحب کا یہ اقتباس اس سلسلے کو سمجھنے میں بڑا اہم معلوم ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''مگر سرسید نے اپنا کام جاری رکھا۔ اگر چہ خاص اختلاف مذہبی خیالات پر تھا مگر مخالفت کی لپیٹ میں تعلیمی، اخلاقی اور معاشرتی اصلاحات بھی آ گئیں۔ عام خیال ہے کہ سرسید نے مذہبی مباحث چھیڑ کر غلطی کی۔ سرسید خود اس خطرے سے آگاہ تھے لیکن ہندوستان کے مسلمانوں کی تہذیبی زندگی کا ڈھانچا کچھ اس طرح تھا کہ دینی ودنیوی سارے مسائل پر مذہبی خیالات کا غلبہ تھا۔ سرسید نے ایک جگہ کہا ہے کہ ''ہم جس کام کے کہتے کو کہتے ہیں، لوگ کہتے ہیں کہ مذہباً منع ہے اور جس کام سے انہیں روکتے ہیں، کہتے ہیں کہ مذہباً جائز ہے۔'' اس عجیب وغریب صورت حال میں سوائے اس کے چارہ نہ تھا کہ سرسید زندگی کے تمام مسائل پر اظہار خیال کریں بلکہ خود بخود مسائل ایک دوسرے سے وابستہ ہو جاتے تھے، جن لوگوں نے سب سے پہلے مسلمانوں کی معاشرتی پیچیدگیوں کو سمجھا اور سرسید کی حمایت کی ان میں حالی بھی تھے۔'' (حالی کی اردو نثر نگاری، عبدالقیوم، ص: ۵۶۷)

سرسید خود تہذیب الاخلاق جاری کرنے اور اس کے مقاصد کی تفصیل میں لکھتے ہیں کہ:

''ہمارے اس پرچے (تہذیب الاخلاق) کی عمر سوا برس کی ہوئی اور ۶۳ مضمون اس میں چھپے۔ اب ہم کو سوچنا چاہیے کہ ہم کو اس سے قومی تہذیب اور قومی ترقی حاصل ہونے کی کیا توقع ہے۔ جب ہم

کچھ اوپر ڈیڑھ سو برس کی دنیا پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم پاتے ہیں کہ لندن میں بھی وہ زمانہ ایسا ہی تھا جیسا کہ اب ہندوستان میں ہے اور وہاں بھی اس قسم کے پرچے جاری ہوئے تھے......خدا نے یہ کام لندن کے پیغمبروں اور سولیزشن کے دیوتا سر رچرڈ اسٹیل اور مسٹر ایڈیسن کی قسمت میں لکھا تھا۔''

(تہذیب الاخلاق، جلد دوم، ص: ۴۴۷)

اس اقتباس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ سرسید نے ان دونوں مستند مضمون نگاروں کے طرز اور فکر کو اپنایا ہے اور انگریزی میں موجود بعض مضامین کا چربہ بھی کیا ہے حالاں کہ جب ہم بغور مطالعہ سرسید کے مضامین کا کرتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے یہاں موضوعات کا تنوع ہے۔ ان کا طرز ان کا خاص اور نجی ہے اور ان کے بیان اور زبان کی صفات ان کی ایک الگ پہچان قائم کرتی ہے۔ سرسید کے مضامین کو عموماً تین حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔ سید عبداللہ کے مطابق:

سرسید کے مضامین تین طرح کے ہیں:

اول- خالص مذہبی اور دینی مضامین

دوم- سیاسی مضامین

سوم- اصلاح، اخلاق و معاشرت سے متعلق مضامین۔

سرسید کے یوں تو مضامین کی تعداد سیکڑوں تک پہنچتی ہے۔ لاہور سے ان کے مقالات کا مجموعہ ''مقالات سرسید'' کے عنوان سے ۱۶ جلدوں میں شائع ہو چکا ہے۔ ان کے یہ مقالہ جات سیاسی، سماجی، اصلاح معاشرت، تاریخی، مذہبی، تعلیمی، ادبی، علمی، تحریکی، اخلاقی، تہذیبی و ثقافتی نوعیت کے ہیں۔ البتہ اس دور میں جب انھوں نے تہذیب الاخلاق کا اجرا کیا تو ان کے مقبول و معروف مضامین جیسے ''تعصب، خوشامد، کاہلی، تعلیم و تربیت، مخالفت، بحث و تکرار، امید کی خوشی، اخلاق یار، گزرا ہوا زمانہ، اپنی مدد آپ، سویلزیشن، سمجھ، رسوم و رواج کے نقصانات، عورتوں کے حقوق، آزادئ رائے، تربیت اطفال، انسان کے خیالات، سراب حیات، خودغرضی، قومی ہمدردی اور آخری پرچہ تہذیب الاخلاق کو غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔ ان کے یہ تمام مضامین یا مقالے تہذیب الاخلاق کے مختلف شماروں میں شائع ہوئے اور بیداری کی مہم کو فروغ دیتے رہے۔

سرسید کی مقالہ نگاری کا بنیادی وصف اختصار اور جامعیت ہے۔ ان کے بیشتر مضامین اسی پیمانے پر پورے اترتے ہیں۔ جتنی باتوں کی ضرورت ہے اس سے زائد تفصیل میں نہیں جاتے بلکہ قلّ مادلّ کے مصداق ہر بات کو اس کی ضرورت اور ترسیل کے مطابق بیان کرنے پر زور دیتے ہیں۔ اس سے قاری اکتاہٹ کا شکار نہیں ہوتا اور بے جا طوالت نہ ہونے سے مقالہ کی روح اور اثر باقی رہتا ہے۔ سرسید کے ذہن میں مقالہ تحریر کرنے کا ایک طے شدہ پیمانہ تھا وہ اسی کے مطابق بڑے ہی جامع اور موثر انداز میں اپنی بات شروع کرتے، درمیانی حصوں کو وسعت دیتے اور اختتامی حصے پر نتائج اخذ کرتے ہوئے قاری کے ذہن میں کوئی سوالات قائم کر دیتے ہیں۔

سرسید کے بعض مقالوں میں خاص طرح کی جزویت اور ناتمامیت بھی ملتی ہے اور ایک اچھے مقالہ کی خوبی ہوتی ہے۔ دراصل ہر مضمون یا مقالہ کا ایک مرکز ہوتا ہے جس کے اردگرد خیالات کی بُنت ہوتی ہے۔ سید عبداللہ نے اسے

مرکزی موڈ سے تعبیر کیا ہے۔ایسے مضمون خیال سے خیال کا ربط قائم کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں اور بہت سی تہوں کو کھولتے ہیں۔ان میں پہلے سے کوئی منصوبہ بندی نہیں ہوتی۔ایسے مضامین میں تخیل کی کارفرمائی بھی ہوتی ہے جو خیال سے دوسرا خیال منتقل کرنے میں معاون ہوتی ہے۔قاری کا ذہن اور قلب ان پرتوں میں گم ہوجاتے ہیں اور محویت ان پر خوشگوار مسرت قائم کرتی ہے۔امید کی خوشی، گزرا ہوا زمانہ اور سراب حیات اسی نوع کے مضامین ہیں۔

سرسید کے بعض مقالے طوالت بھی رکھتے ہیں اور ان میں منصوبہ بندی بھی ہوتی ہے جس کے سہارے طے شدہ طریقے سے مقالہ آگے بڑھتا اور تمام ہوتا ہے۔ایسے مقالوں میں لطف کی کمی ہوتی ہے اور سنجیدگی اس کا وصف بن جاتی ہے۔ظاہر ہے ایسے مضامین زیادہ تر علمی نوعیت کے ہوتے ہیں، جن میں اصطلاحات بھی ہوتی ہیں لہٰذا ان سے شگفتگی کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

سرسید کے مقالوں کا اہم اور بنیادی وصف مقصدیت اور افادیت ہے۔وہ اپنے مقالوں سے شگفتگی اور مسرت پیدا کرنے کے قایل نہیں ہیں بلکہ ان کی تحریروں کے پیچھے ایک خاص مقصد کارفرما ہے اور وہ ہے مسلم قوم اور معاشرہ کی اصلاح اور بیداری۔لہٰذا وہ جو کچھ بھی کہتے ہیں اس میں ایک مدعا اور مقصد ہوتا ہے۔ان کے تمام مقالے اس صفت سے مزین ہیں۔

کہیں تعلیمی ترقی، کہیں اخلاقی اقدار، کہیں سویلائزیشن اور تمدن کا مسئلہ، کہیں توہمات وبدعات کو دور کرنے کی کوششیں، کہیں اصلی مذہب کی ترویج، کہیں مغربی علوم اور علوم جدیدہ، سائنس وٹکنالوجی کی حمایت، کہیں انگریزی تہذیب وشایستگی پر اصرار غرض ہر اعتبار سے عوام الناس اور ہندوستانی مسلم قوم کی اصلاح کا مقصد ہی ان کے مقالوں کی روح ہے۔اس اعتبار سے وہ ادیب بعد میں اور مصلح پہلے نظر آتے ہیں۔ان کے مضامین میں مادی ترقیاں بے حد اہم ہیں جو انسان کو ترقی یافتہ بناتی ہیں۔ان کے یہاں دین اور دنیا میں ایک خاص رشتہ قایم رہتا ہے۔اتحاد واتفاق، قوموں کا متحد ہونا، سیکولزم، عالمی اخوت کا فلسفہ بے حد اہم نظر آتا ہے۔دو تین اقتباسات اس حوالے سے ملاحظہ کیجیے جن میں مقصدیت صاف جھلکتی ہے:

> ''مجھ کو اپنے ملک کے بھائیوں پر اس بات کی بدگمانی ہے کہ وہ بھی تعصب کی بدخصلت میں گرفتار ہیں اور اس سبب سے ہزاروں قسم کی بھلائیوں کے حاصل کرنے سے محروم اور ذلت اور خواری اور بے عملی اور بے ہنری کی مصیبت میں گرفتار ہیں اور اسی لیے میری کوشش ہے کہ وہ اس بدخصلت سے نکلیں اور اعلیٰ درجے کی عزت تک پہنچیں۔''

> ''تعصب میں سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ جب تک وہ نہیں جاتا کوئی ہنر وکمال اس میں نہیں آتا۔تربیت وشایستگی، تہذیب وانسانیت کا مطلق نشان نہیں پایا جاتا جب کہ وہ مذہبی غلط نما نیکی کے پردے میں ظہور کرتا ہے تو اور بھی سم قاتل ہوجاتا ہے کیوں کہ مذہب سے اور تعصب سے کچھ تعلق نہیں ہے۔''

اپنے ایک مضمون آزادیٔ رائے میں لکھتے ہیں:

''ہر ایک شخص کو گو اس کی رائے کہیں ہی زبردست اور مضبوط ہو اور وہ کیسی ہی مشکل اور نارضامندی سے اپنی رائے کے غلط ہونے کے امکان کو تسلیم کرے، یہ بات خوب یاد رکھنی چاہیے کہ اگر اس رائے پر بخوبی تمام اور نہایت بے باکی سے بے دھڑک مباحثہ نہیں ہو سکتا تو وہ ایک مردہ اور مردار رائے قرار دی جاوے گی نہ ایک زندہ اور سچی حقیقت اور وہ کبھی ایسی حق اور سچ بات قرار نہیں پا سکتی جس اثر ہمیشہ لوگوں کی طبیعتوں پر رہے۔''

اسی مضمون کے آغاز میں لکھتے ہیں کہ:

''کوئی وجہ اس بات کی نہیں ہے کہ پانچ آدمیوں کو تو بمقابلہ پانچ آدمیوں کی رایوں کے غلط ٹھہرانے کا استحقاق ہو اور ایک آدمی کو بمقابل نو آدمیوں کے یہ استحقاق نہ ہو۔ رائے کی غلطی آدمیوں کی تعداد کی کمی بیشی پر منحصر نہیں ہے بلکہ قوت استدلال پر منحصر ہے جیسے کہ یہ بات ممکن ہے کہ نو آدمیوں کی رائے بمقابلہ ایک شخص کے صحیح ہو ویسے ہی یہ بھی ممکن ہے کہ ایک شخص کی رائے بمقابل نو کے صحیح ہو۔''

ان کے مقالوں کا ایک اہم وصف فلسفیانہ انداز ہے۔ سرسید کا ذہن دراصل دانشور، مفکر اور مدبر کا ذہن تھا۔ مسلسل غور و فکر کے نتیجے میں ادراک اور شعور کی پختگی اپنے عروج پر تھی۔ انھوں نے زندگی، کائنات، معاشرہ، انسان، وقت، خدا، جنت، جہنم، ملائکہ، پیغمبر، ماضی، حال، مستقبل، انسانی تاریخ، عمارتیں، کتب خانے، منظر غرض ہر چیز اور شے کا مشاہدہ یا تجربہ یا عمیق مطالعہ کیا تھا۔ لہٰذا ان کی سوچ ہر کسی سے منفرد اور زمانے سے جدا تھی۔ ہر مسئلہ پر ان کی ایک رائے اور ایک فیصلہ تھا اور اس کے پیچھے ایک منطق تھی۔ لہٰذا فلسفہ ان کی تحریروں کی جان تھا جو ان کا نجی اور ذاتی تھا حالاں کہ ان پر بہت سے دانشوری کے اثرات بھی تھے مگر رد و قبول کی سطحیں مختلف تھیں۔ اور ان کا عمل دخل مختلف تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں ایک خاص نکتہ، فلسفہ یا نظریہ ضرور گردش کرتا ہے اور اس سے ان کی تحریروں میں سنجیدگی آ جاتی ہے۔ ان کی تحریروں میں تصورات و افکار اور معقولات کا غلبہ رہتا ہے۔ وہ عقل کو ترجیح دیتے ہیں اور اس کی کسوٹی پر ہی ہر مسئلہ کو پرکھتے ہیں۔

ان کے مقالوں کی ایک خوبی دوران بحث مثالوں اور شواہد کا استعمال ہے۔ وہ اپنی بات کو بڑے ہی زوردار اور موثر انداز میں کہتے ہیں۔ بات کو ثابت کرنے کے لیے وہ تاریخ، جغرافیہ، تہذیب و ثقافت، مدنیات، سماجیات، معاشیات، معلومات عامہ، سائنسی معلومات غرض تمام کا سہارا لیتے ہیں۔ کبھی واقعات تو کبھی حالات کی یا کیفیات کی شکل میں مثالوں اور شواہد کو بڑے ہی مدلل اور منطقی انداز میں پیش کرتے ہیں کہ قاری کے ذہن و دل میں بات بیٹھ جاتی ہے اور وہ مقالہ نگار سے متفق ہو جاتا ہے۔ یہ اقتباس دیکھیے: رسوم و رواج کی پابندی کے نقصانات بتاتے ہوئے وہ اپنی بات کو ایک دانشور کے قول سے تصدیق حاصل کرتے ہیں اور تحریر کو مدلل اور مثبت بنا دیتے ہیں:

''کیا عمدہ قول ایک بڑے دانا کا ہے کہ ''انسان کی زندگی کا منشا یہ ہے کہ اس کے تمام قومی اور جذبات نہایت روشن اور شگفتہ ہوں اور ان میں باہم نامناسبت اور تناقض واقع نہ ہو بلکہ سب کا

مل کر ایک کامل اور نہایت متناسب مجموعہ ہو۔'' مگر جس قوم میں کہ پرانی رسم ورواج کی پابندی ہوتی ہے یعنی ان رسموں پر نہ چلنے والا مطعون اور حقیر سمجھا جاتا ہے وہاں زندگی کانٹا معلوم ہوتی ہے۔''

ایک اور بڑے دانا شخص کی رائے کا یہ نتیجہ ہے کہ آزادی اور اپنی خوشی پر چلنا جہاں تک کہ دوسروں کو ضرر نہ پہنچے، ہر انسان کی خوشی اور اس کا حق ہے پس جہاں کہیں معاشرت کا قاعدہ جس پر کوئی چلتا ہے خاص اس کی خصلت پر مبنی نہیں ہے بلکہ اگلی روایتوں پر یا پرانی رسموں پر مبنی ہے وہاں انسانوں کی خوشحالی کا ایک بڑا جزو موجود نہیں ہے۔''

ایک جگہ اپنی بات کی دلیل میں وہ چینی قوم کی خوبیوں کا تذکرہ کچھ اس طرح کرتے ہیں:

''اس معاملہ میں ہم کو ملک چین کے حالات پر غور کرنے سے عبرت ہوتی ہے۔ چینی بہت لئیق آدمی ہیں بلکہ اگر بعض باتوں پر لحاظ کیا جاوے تو عقلمند بھی ہیں اور اس کا سبب یہ ہے کہ ان کی خوش قسمتی سے ابتدا ہی میں ان کی قوم میں ہوتی اچھی اچھی رسمیں قائم ہوگئیں اور یہ کام ان لوگوں کا تھا جو اس قسم میں نہایت دانا اور بڑے حکیم تھے۔''

سرسید کے مقالوں کا ایک امتیازی وصف صداقت اور حقیقت کا ہونا ہے۔ وہ کسی بھی بات کو دوٹوک انداز میں بے لاگ لپیٹ کے کہنے کے عادی ہیں۔ جو بات جیسی ہوتی ہے اس کو بعینہ اسی طرح کہنے اور کرنے کے قایل ہیں۔ مبالغہ، غلو، خوشامد، احتیاط، خوف، لالچ کا دور دور تک ان کے یہاں گزر نہیں ہے لہٰذا ہر پل صداقت کی جستجو ان کی تحریروں کا خاصہ بن جاتی ہے۔

سرسید کے مقالوں میں تحقیقی اور سائنٹفک طریقۂ کار موجود رہتا ہے جو ان کی تحریروں کو مستند، معیاری اور اعلیٰ بناتا ہے۔ وہ جو بات بھی کہتے ہیں پوری طرح چھان بین کے بعد، چھان پھٹک کر بڑی احتیاط سے کہتے ہیں اور بڑے ہی مدلل انداز میں کہتے ہیں۔ تحقیق کی اعلیٰ خوبیاں ان کے مضامین کا حصہ بن جاتی ہیں۔ جن سے ان کے مقالے میں جان پڑ جاتی ہے۔

سرسید کی مقالہ نگاری کا اہم وصف اپنے موقف پر مضبوطی سے ڈٹے اور جمے رہنا ہے۔ وہ جو مفروضہ قائم کرتے ہیں اور جس مقصد کے تحت قائم کرتے ہیں اس مرکز سے وہ کبھی نہیں ہٹتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں بکھراؤ اور انتشار نہیں ملتا۔ وہ To the point ہر بات کو کہنے کے عادی ہیں اور اپنی بات کو بڑے ہی موثر طریقے سے کہنے پر قادر بھی۔

سرسید کے مقالوں کی ایک خوبی مضامین کا تنوع ہے۔ ان کے علم کا دائرہ بے حد وسیع ہے اور ان کے منصوبے بھی اسی قدر وسعت رکھتے ہیں لہٰذا مضامین کی پیشکش میں تنوع کا ہونا لازمی ہے۔ وہ اپنے آپ میں تحریک تھے لہٰذا مذہب، تعلیم، اخلاق، فلسفہ، سائنس، صنعت وحرفت، تہذیب وثقافت، علوم وفنون، تاریخ، تمدن، سیاست، معاشیات، سماجیات، زبان، شعروادب غرض کون سا حصہ ایسا نہیں ہے جس پر ان کے مقالے میں بحث قائم نہ ہوئی ہو۔ مگر سب کی خوبی یہ ہے کہ یہ تمام موضوعات ان کے اصلاحی مشن سے وابستہ ہوکر ایک اکائی میں ڈھل جاتے ہیں۔ یعنی دانے الگ الگ ہیں مگر تسبیح کے ایک دھاگے میں پروئے ہوئے ہیں۔

13.3.4 سرسید کا اسلوب تحریر

سرسید سے قبل اردو نثر میں ہمیں دو نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ایک تو فارسی کے زیر اثر پُر تکلف اندازِ بیان جن میں صناعی، مقفیٰ جملے، صنائع و بدائع کا استعمال، شاعرانہ انداز، خیال آرائی اور مشکل پسندی کو خاص دخل تھا جب کہ دوسری جانب فورٹ ولیم کالج کے مصنفین کا سادہ سلیس عام فہم ہندوستانی زبان کا اثر لیے ہوئے طرز تھا۔ جس میں مدعا اہم تھا طرز بیان نہیں۔ مرزا غالب نے ایک قدم آگے بڑھ کر اس نثر کو شخصی تجربات سے آشنا کر دیا اور مدعا نویسی کو مزید حسن عطا کر دیا۔ سرسید کا یہ اہم کارنامہ ہے کہ انھوں نے اسی طرز کو اپناتے ہوئے نثر کو زندگی اور معاشرے کا ترجمان بنا دیا۔ انھوں نے صداقت اور حقیقت کو نثر میں بنیاد بنایا اور مبالغہ، جھوٹ، انشاء اور پُر تکلف انداز کی تردید کی۔ وہ خود اپنے ایک اقتباس میں اس سے متعلق تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ''جہاں تک ہم سے ہو سکا ہم نے اردو زبان کے علم و ادب کی ترقی میں اپنے ناچیز پرچوں (یعنی تہذیب الاخلاق) کے ذریعے کوشش کی مضمون کی ادا کا ایک صاف اور سیدھا طریقہ اختیار کیا۔ جہاں تک ہماری کج مج زبان نے یاری دی، الفاظ کی درستی اور بول چال کی صفائی پر کوشش کی رنگینیٔ عبارت سے (جو تشبیہات و استعارات خیال سے بھری ہوتی ہے اور جس کی شوکت صرف لفظوں ہی لفظوں میں رہتی ہے اور دل پر کچھ اثر نہیں ہوتا) پرہیز کیا۔ تک بندی سے جو اس زمانے میں مقفیٰ عبارت کہلاتی تھی ہاتھ اٹھایا۔ جہاں تک ہو سکا سادگیٔ عبارت پر توجہ کی۔ اس میں کوشش کی کہ جو لطف ہو مضمون کے ادا میں ہو۔ جو اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل میں پڑے تاکہ دل سے نکلے اور دل ہی میں بیٹھے۔'' (بحوالہ سرسید اور ان کے نامور رفقاء، ص: ۵۹-۶۰)

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلوب بیان کی کیا کیا خوبیوں ہونی چاہئیں۔ اور خود ان کا اسلوب کیسا ہے وہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے۔ ان کے مطابق تحریر میں سادگی ہونی چاہیے اور مضمون ادا کے مقابلے زیادہ اہم ہوتا ہے اور اس میں ہی لطف قائم ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ ان کے یہاں ترسیل کا مسئلہ بے حد اہم ہے یعنی جو چیز کہی جا رہی ہے وہ پوری طرح دوسرے یعنی قاری تک پہنچ جائے اور مضامین کی پیشکش میں صداقت کا دامن کبھی نہ چھوٹنا چاہیے۔ حالی نے سرسید کی طرز تحریر کی خوبیاں سادگی، بے تکلفی و بے ساختگی اور مدعا نویسی کو قرار دیا ہے اور اسے نیچرل طرز بیان کا نام دیا ہے یعنی جہاں تکلف اور تصنع کی ذرہ برابر گنجائش نہ ہو اور مطالب کی ادائیگی پوری طرح ہوتی ہو، ظاہر ہے سرسید مصلح قوم ہیں لہٰذا ان کی نثر میں افادیت کو اہمیت لازم ہے لہٰذا انشاء کے مقابلے ترسیل کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

سرسید کی تحریروں میں ایک خاص قسم کا جوش اور ولولہ بھی گردش کرتا ہے۔ ہم اسے خطیبانہ جوش سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں تلقین اور ترغیب کا انداز بھی رہتا ہے۔ اسی وجہ سے وہ صناعی جو حالی یا شبلی کے مضامین کا خاصہ ہے سرسید کے یہاں کم ہو جاتی ہے۔ ان کے یہاں اثر آفرینی بھی خوب ملتی ہے۔ وہ کسی بھی بات کو موثر انداز میں کہنے کا

ہنر بخوبی جانتے ہیں۔ان کے مزاج کی شوخی و بذلہ سنجی بھی ان کی تحریروں میں جھلکتی ہے جس سے وہ تحریر کو خوشگوار بنادیتے ہیں وہ مکالمہ کے ذریعہ ڈرامائیت بھی پیدا کرتے ہیں اور طنز وظرافت سے سٹائر اور ہیومر بھی۔

ان کی تحریروں کا ایک خاص وصف یہ بھی ہے کہ مضمون کتنا ہی سنجیدہ کیوں نہ ہو، مسئلہ کتنا ہی دقیق اور پیچیدہ کیوں نہ ہو، نکتہ کتنا ہی علمی کیوں نہ ہو، وہ انتہائی خشک موضوع کو بیان کرتے ہوئے بڑی ہمواری اور روانی کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ان کا قلم ہر صورت میں بے حد رواں اور یکساں انداز میں بیان کی قدرت رکھتا ہے۔اس سلسلے میں سید عبداللہ لکھتے ہیں کہ:

> ''سرسید کے بیان کی اس خصوصیت سے جسے بے رنگی کہا جاتا ہے، وہ ہمہ رنگی پیدا ہوئی جس کے سبب وہ ہر مضمون پر بے تکان اور بے تکلف لکھنے پر قادر تھے۔چنانچہ انھوں نے تاریخ، فن تعمیر، سیرت، فلسفہ، مذہب، قانون، سیاست، تعلیم، اخلاقیات، مسائل ملکی، وعظ، تذکیر اور تقابل مذاہب پر قلم اٹھایا ان سب مضامین میں ان کا رہوار قلم یکساں پھرتی اور ہمواری کے ساتھ رواں دواں معلوم ہوتا ہے۔ یہ ان کی قدرت بیان کا کرشمہ ہے۔'' (سرسید اور ان کے نامو رفقاء، سید عبداللہ، ص:۶۴)

چوں کہ سرسید خود مورخ اور واقعہ نگار ہیں لہٰذا ان کے مقالوں میں جزئیات نگاری اور تفصیلات کا بھی خاص دخل ہے۔وہ حالتوں اور مقامات کے مرقع بھی کھینچنے پر قادر ہیں۔واقعیت اور حقیقت ان کی تحریروں کا وصف ہے۔منطقیت اور استدلالی انداز جملوں اور عبارت کی عمدہ تنظیم کرتا ہے۔

سرسید کی عبارت کا اہم ترین وصف زبان کا عام فہم اور گفتگو کا انداز ہونا ہے۔ہاں سنجیدگی کے سبب زیادہ تر مقامات پر شگفتگی نہیں موجود رہتی۔

سرسید کی تحریروں کا ایک خاصہ یہ ہے کہ ان میں بعض انگریزی الفاظ کا بھی شعوری طور پر استعمال کیا گیا ہے، اس سے اردو زبان کو اصطلاحات اور الفاظ کی سطح پر وسعت ملی ہے اور آگے چل کر اسی نہج پر بہت سے انگریزی اور دیگر زبانوں کے الفاظ اردو کا حصہ بن کر مستعمل ہوگئے ہیں۔البتہ کہیں کہیں ان کی تکرار ناہمواریت ضرور پیدا کردیتی ہے۔اس کے علاوہ سرسید نے جمع الجمع کا استعمال بھی کیا ہے جیسے رسم سے رسوم کے بجائے رسومات وغیرہ۔کہیں کہیں فقروں میں کھردراہٹ بھی موجود ہے۔ترکیبوں کا بھدا پن بھی ہے، حروف ربط وعطف کی تکرار بھی ہے، بعض نامانوس الفاظ کا دخل بھی ہے جس سے ان کی نثر کا ادبی حسن کم ہوا ہے۔حالی اور شبلی کے مقابلے ان کی تحریروں میں ادبی لطافت کی کمی بھی صاف محسوس ہوتی ہے اور تحریر کی خشکی بھی خوشگوار فضا کو کبھی کبھی معدوم کردیتی ہے۔کہیں کہیں لمبے جملے اور ایک ایک پیراگراف والے جملے بھی تحریر کا عیب بن جاتے ہیں تو کبھی کبھی مقالوں کی طوالت بھی اکتاہٹ کا سبب بنتی ہے۔کسی کسی مضمون میں خطیبانہ اور واعظانہ انداز شدت سے حاوی ہوتا ہے تو ادب کی فضا مفقود ہوجاتی ہے۔پھر بھی مجموعی سطح پر ان کی تحریروں کا اسلوب کئی اہم خصوصیات سے مزین ہے اور وہ اردو کے باقاعدہ پہلے نثر نگار اور مقالہ نگار ہیں جن کے وسیلے سے اردو نثر نے ترقی کے کئی منازل طے کیے ہیں اور ہم تک اس انداز میں پہنچی ہے۔

13.4 خلاصہ

اردو مقالہ نگاری کا باقاعدہ آغاز سرسید سے ہوتا ہے۔ سرسید کے سامنے اسٹیل اور ایڈیسن کی تحریروں اور رسالوں اسپیکٹر اور ٹیٹلر کے نمونے تھے جن کی انھوں نے اتباع کی اور اصلاح معاشرت اور اصلاح قوم کے لیے نیز بیداری کی مہم کو آگے بڑھانے کے لیے تہذیب الاخلاق کا اجراء کیا اور اس میں مختلف موضوعات جیسے مذہب، سائنس، فلسفہ، سماجیت، تہذیب وثقافت، سیاست، تمدن، تعلیم، صنعت وحرفت، تاریخ، طب وغیرہ پر مقالے تحریر کیے۔ ان مقالوں میں افادیت اور مقصدیت، مدعا نگاری کو اصل بنیاد بنایا گیا اور استدلال، تعقل، منطقیت، فلسفیانہ طرز کو بطور خاص اہمیت دی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی مقالہ نگاری میں سنجیدگی، متانت اور خشکی زیادہ دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان کے سامنے نثر کے دو نمونے تھے۔ اول پُر تکلف اور مقفی نثر اور دوم فورٹ ولیم کالج کے تحت وجود میں آنے والی سادہ عام فہم، سلیس اور رواں دواں نثر جسے بے تکلف اور بیساختہ بنانے میں اور تجربے کا حصہ بنانے میں غالب نے مدد دی۔ سرسید نے اسی نثر کا اپنے لیے انتخاب کیا اور اسے حقیقت اور صداقت سے پُر نثر بنا دیا جس میں مادی زندگی کے مسائل اور معاشرہ کی ترجمانی کی گئی تھی۔ سرسید کی تحریریں صاف ستھری زبان اور موثر بیان کی حامل ہیں۔ ان کی تحریر سادہ، رواں ہموار ہوتی ہے اور ترسیل کے سارے تقاضے پورے کرتی ہے۔ وہ علمی، ادبی، تحقیقی، تنقیدی غرض ہر نوع کے مضامین تحریر کرنے پر یکساں قدرت رکھتے ہیں اور نہایت موثر اور مدلل پیرایے میں بڑی روانی سے بیان پر قادر ہیں۔

13.5 آپ نے کیا سیکھا

آپ یورپ میں مقالہ نگاری کی ضرورت اور اہمیت سے واقف ہوئے۔
آپ مقالہ نگاری کے تصور، اس کی اہمیت وافادیت اور امتیازات سے آشنا ہوئے۔
آپ سرسید کی مقالہ نگاری کے موضوعات سے متعارف ہوئے۔
آپ سرسید کی مقالہ نگاری کے جملہ امتیازات سے واقف ہوئے۔
آپ سرسید کے اسلوب تحریر سے بخوبی متعارف ہوئے۔

13.6 اپنی جانچ خود کریں

1- یورپ اور انگلینڈ میں مقالہ نگاری کو کن شخصیات نے پروان چڑھایا؟
2- سرسید نے کن مقالہ نگاروں سے متاثر ہو کر مقالہ نگاری کا آغاز کیا؟
3- سرسید نے کن موضوعات کو اپنے مضامین میں بطور خاص جگہ دی؟
4- سرسید کی مقالہ نگاری کے کسی ایک وصف پر اظہار خیال کیجیے۔
5- سرسید کے اسلوب نگارش پر گفتگو کیجیے۔

13.7 سوالوں کے جوابات

1- یورپ میں جب خوشحالی، ترقی، سیاسی بیداری اور برتری کا دورعروج پر پہنچا تو انگریزی زبان وادب کو بھی خوب پھلنے پھولنے کا موقع ملا اور دیگر اصناف ادب کی طرح مقالہ نویسی کو بھی فروغ ملا۔ مقالہ نگاری کو چلن میں لانے اور اس کی ادبی حیثیت متعین کرنے میں لیب، بیکن، میکالے، ہزلٹ، سٹونسن کے نام بے حد اہم ہیں۔ انھوں نے انگریزی زبان میں فلفسیانہ، تاریخی، تنقیدی اور ادبی مضامین تحریر کیے اور بعد والوں کے لیے عظیم ورثہ یادگار چھوڑا۔ ان کے علاوہ امریکہ کے عظیم مصنف ایمرسن نے امریکی تہذیب وثقافت پر بہت سے مضامین لکھے جن میں اخلاقی نقطۂ نظر پیش پیش تھا۔ اس نے تعصب، تنگ نظری، جہالت، توہمات کے خلاف آواز بلند کی۔

2- اردو میں مضمون نگاری/ مقالہ نگاری کا باقاعدہ آغاز سرسید سے ہی ہوتا ہے۔ جنھوں نے اسٹیل اور ایڈیسن سے متاثر ہوکران کا طرز اختیار کیا اور اسپیکٹر اور ٹیٹلر کی طرز پر تہذیب الاخلاق کا ۱۸۷۰ء میں اجرا کیا۔

3- ان کے یہاں موضوعات کا تنوع ہے۔ سرسید کے یوں تو مضامین کی تعداد سینکڑوں تک پہنچتی ہے۔ ان کے یہ مقالہ جات سیاسی، سماجی، اصلاح معاشرت، تاریخی، مذہبی، تعلیمی، ادبی، علمی، تحریکی، اخلاقی، تہذیبی وثقافتی نوعیت کے ہیں۔ البتہ اس دور میں جب انھوں نے تہذیب الاخلاق کا اجرا کیا تو ان کے مقبول ومعروف مضامین جیسے ''تعصب، خوشامد، کاہلی، تعلیم وتربیت، مخالفت، بحث وتکرار، امید کی خوشی، اخلاق یار، گزرا ہوا زمانہ، اپنی مدد آپ، سویلزیشن، سمجھ، رسوم ورواج کے نقصانات، عورتوں کے حقوق، آزادئ رائے، تربیت اطفال، انسان کے خیالات، سراب حیات، خودغرضی، قومی ہمدردی اور آخری پرچہ تہذیب الاخلاق کو غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔ ان کے یہ تمام مضامین یا مقالے تہذیب الاخلاق کے مختلف شماروں میں شائع ہوئے اور بیداری کی مہم کو فروغ دیتے رہے۔

4- سرسید کے مقالوں کا اہم اور بنیادی وصف مقصدیت اور افادیت ہے۔ وہ اپنے مقالوں سے شگفتگی اور مسرت پیدا کرنے کے قایل نہیں ہیں بلکہ ان کی تحریروں کے پیچھے ایک خاص مقصد کارفرما ہے اور وہ ہے مسلم قوم اور معاشرہ کی اصلاح اور بیداری۔ لہٰذا وہ جو کچھ بھی کہتے ہیں اس میں ایک مدعا اور مقصد ہوتا ہے۔ ان کے تمام مقالے اس صفت سے مزین ہیں۔

کہیں تعلیمی ترقی، کہیں اخلاقی اقدار، کہیں سویلائزیشن اور تمدن کا مسئلہ، کہیں توہمات وبدعات کو دور کرنے کی کوششیں، کہیں اصلی مذہب کی ترویج، کہیں مغربی علوم اور علوم جدیدہ، سائنس وٹکنالوجی کی حمایت، کہیں انگریزی تہذیب وشایستگی پر اصرار غرض ہر اعتبار سے عوام الناس اور ہندوستانی مسلم قوم کی اصلاح کا مقصد ہی ان کے مقالوں کی روح ہے۔ اس اعتبار سے وہ ادیب بعد میں اور مصلح پہلے نظر آتے ہیں۔ ان کے مضامین میں مادی ترقیاں بے حد اہم ہیں جو انسان کو ترقی یافتہ بناتی ہیں۔ ان کے یہاں دین اور دنیا میں ایک خاص رشتہ قایم رہتا ہے۔ ان کے اتحاد واتفاق، قوموں کا متحد ہونا، سیکولرزم، عالمی اخوت کا فلسفہ بے حد اہم نظر آتا ہے۔

5- حالی نے سرسید کی طرزِ تحریر کی خوبیاں سادگی، بے تکلفی و بے ساختگی اور مدعا نویسی کو قرار دیا ہے اور اسے نیچرل طرزِ بیان کا نام دیا ہے یعنی جہاں تکلف اور تصنع کی ذرہ برابر گنجائش نہ ہو اور مطالب کی ادائیگی پوری طرح ہوتی ہو۔ سرسید کی تحریروں میں ایک خاص قسم کا جوش اور ولولہ بھی گردش کرتا ہے۔ ہم اسے خطیبانہ جوش سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ ان کے یہاں اثر آفرینی بھی خوب ملتی ہے۔ ان کا قلم ہر صورت میں بے حد رواں اور یکساں انداز میں بیان کی قدرت رکھتا ہے۔ واقعیت اور حقیقت ان کی تحریروں کا وصف ہے۔ منطقیت اور استدلالی انداز جملوں اور عبارت کی عمدہ تنظیم کرتا ہے۔ سرسید کی عبارت کا اہم ترین وصف زبان کا عام فہم اور گفتگو کا انداز ہونا ہے۔ ہاں سنجیدگی کے سبب زیادہ تر مقامات پر شگفتگی نہیں موجود رہتی۔

13.8 فرہنگ

پیش پیش	آگے آگے	متحد	اکٹھا
زائد	زیادہ	شناخت	پہچان
شواہد	ثبوت	قلّ و مادلّ	جامع
مفروضہ	Hypothesis	یکساں	برابر
مسرت	خوشی	ترغیب	ابھارنا
اصرار کرنا	زور دینا، ضد کرنا	اصطلاحات	Terminology
نوع	قسم	تنوع	مختلف قسم کی، طرح طرح کی
اخوت	بھائی چارہ	طوالت	لمبائی
مصلح	ریفارمر، اصلاح کرنے والا	منطق	Logic
منفرد	انوکھا	ردو قبول	رجیکٹ اور Eccept،
گریز اور تسلیم			
عروج	اونچائی، بلندی		

13.9 کتب برائے مطالعہ

سرسید اور ان کے نامور رفقاء، سید عبداللہ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۱۱ء

سرسید احمد خاں، مرتبہ محمد علی جوہر، آفتاب عالم نجمی، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ۲۰۲۱ء

اردو نثر کا فنی ارتقاء

سرسید اور اوران کا عہد، ثریا حسین

اکائی 14 اردو زبان وادب پر سرسید کے اثرات

ساخت

14.1 اغراض ومقاصد

14.2 تعارف

14.3 اردو زبان وادب پر سرسید کے اثرات

14.3.1 اردو زبان کو علمی بنانے میں سرسید کی کوششیں

14.3.2 اردو نثر پر سرسید کے احسانات واثرات

14.3.3 اردو شاعری پر سرسید کے اثرات

14.4 ماحصل

14.5 اپنا امتحان خود لیجیے

14.6 سوالوں کے جوابات

14.7 فرہنگ

14.8 کتب برائے مطالعہ

14.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ

☆ سرسید کی ان کوششوں سے آگاہ ہوں گے جن کی بدولت اردو زبان علمی موضوعات کو پیش کرنے

کے قابل ہوئی۔

☆ سرسید کی ان کوششوں سے واقف ہوں گے جن سے اردو کی ادبی نثر حقیقت پسندی اور سلاست و

روانی سے مالا مال ہوئی۔

☆ سرسید کے ان اقدامات سے بخوبی آگاہ ہوں گے جن کی بدولت اردو شاعری فطرت پسندی اور

حقیقت پسندی کی جانب مائل ہوئی۔

☆ سرسید کی ان کوششوں کے بارے میں جان پائیں گے جن سے اردو زبان وادب عقلیت،

منطقیت اور سادہ اسلوب و انداز سے ہمکنار رہا۔

14.2 تعارف

سرسید نے زندگی کے تقریباً تمام تر شعبوں مثلاً سیاست، سماج، مذہب اور تعلیم وغیرہ کے ساتھ ساتھ اردو زبان وادب کی بھی اصلاح کی۔ ان کی اصلاحات سے ہماری زبان علمی، افادی اور مقصدی ہونے لگی تھی۔ سرسید کی کوششوں کا ہی نتیجہ ہے کہ اردو کی ادبی نثر کا دامن وسیع ہوا اور اس میں مختلف النوع موضوعات کو پیش کرنے کا رجحان فروغ پانے لگا تھا۔ جدید مغربی نثری اصناف داخل ہوئیں اور بہ اعتبار اسلوب و انداز اردو نثر میں سادگی، سلاست، روانی اور فطری پن کو رواج ملنے لگا تھا۔ اسی طرح اردو شاعری میں بھی وسعت پیدا ہونے لگی تھی اور اس میں نت نئے ہیئتی تجربات ہونے لگے تھے۔ لیکن نثر کے مقابلے میں شاعری کا دامن ادبیت اور شعریت کے لحاظ سے تنگ ہونے لگا تھا۔ اس کے باوجود سرسید نے اردو زبان وادب کو جس نوع کے حقیقی، فطری اور سادہ انداز و اسلوب میں ڈھالنا شروع کر دیا تھا، اس کے اثرات بڑی تیزی سے مرتب ہونے لگے تھے۔ بلکہ آج تک اردو میں زبان وادب کی جتنی بھی تحریکیں وجود میں آئیں، ان سب پر سرسید کے اثرات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

14.3 اردو زبان وادب پر سرسید کے اثرات

14.3.1 اردو زبان کو علمی بنانے میں سرسید کی کوششیں

یوروپ کی بیداریِ نو (Renaissance) میں یونانی اور اطالوی زبان کے تراجم نے جو مثبت رول ادا کیا تھا، اس سے سرسید بخوبی واقف تھے۔ دلی کالج کی 'ورناکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی' کسی حد تک ہندستان میں یہ رول ادا کرنے لگی تھی، لیکن 1857 کے ان مجاہدین نے، جو جسمانی طاقت وقوت کو سب کچھ مان بیٹھے تھے اور انگریزوں کی لائی ہوئی ہر چیز کو شک اور نفرت کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے، اسے بھی تباہ و برباد کر ڈالا تھا۔

اٹھارہ سوستاون میں ہوئی پہلی جنگ آزادی کی شکست کے بعد برصغیر کے عوام نے کچھ سدھ لی تو انگریزوں نے اپنی سابقہ حکمت عملی کے تحت یہاں کے مختلف شہروں میں بعض ایسی انجمنیں اور سوسائٹیاں قائم کرنا شروع کر دی تھیں جو انگریزی/مغربی علوم وفنون اور فکر و فلسفے کو دیسی/اردو زبان میں منتقل کر کے ہندستانیوں کے اذہان کو مزید بدلنے لگی تھیں۔

سرسید چونکہ ترجمے کی اہمیت کو سمجھ رہے تھے، اس لیے انگریزوں کی منشا و حکمت عملی کے مطابق ہی سہی، انھوں نے اس نہج پر کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ انگریزوں/عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان وہ مصالحت کی راہ ہموار کرنے لگے تھے اور برصغیر کے عوام میں جدید علوم وفنون کے تئیں بیداری پیدا کرنے کے لیے بعض منصوبے بھی بنانے لگے تھے۔ چنانچہ 1862 میں ان کا تبادلہ مشرقی یوپی کے ایک شہر غازی پور میں ہوا، تو وہاں

انھوں نے انگریزی زبان اور دیگر یوروپی زبانوں کے سائنسی کاموں کومختلف علاقائی زبانوں میں منتقل کرانے کی غرض سے جنوری 1864 میں 'سائنٹفک سوسائٹی' نام کا ایک ادارہ قائم کیا تاکہ ترجمے کی مدد سے برصغیر کے عوام پیشہ ورانہ اور ترقی پسند علوم سے متعارف ہوسکیں۔ خصوصاً سیاسیات اور معاشیات جیسے علوم وفنون سے یہاں کے باشندگان کو آشنا کرنے کے لیے سرسید نے اپنی توجہ مرکوز کردی تھی۔ کیونکہ کسی بھی ملک کی ترقی کے لیے وہاں کے عوام کا سیاسی اور معاشی تعلیم سے آراستہ ہونا، ان کے نزدیک بے حد ضروری تھا۔

سرسید کی نظر میں ہندستان پر انگریزوں کی حکمرانی کی بنیادی وجہ یہاں کے عوام میں سیاسی اور معاشی تعلیم سے بے رغبتی اور عدم دلچسپی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہندستانیوں کو یہ بتانے لگے تھے کہ اگر انگریزوں کی غلامی سے نجات پانا ہے تو انھیں سیاسی اور معاشی علوم سے خود کو آشنا کرنا ہوگا۔ چنانچہ اسی سال یعنی 1864 میں سرسید نے غازی پور میں نونہالانِ وطن کو ترقی پسند علوم سے بہرہ مند کرنے کے لیے راجہ دیونرائن سنگھ کی سرپرستی میں ایک مدرسہ کھولا۔ اس میں پانچ زبانوں —— انگریزی، اردو، فارسی، عربی اور سنسکرت —— میں تعلیم دینے کا انتظام کیا۔ یہی مدرسہ بعد میں وکٹوریہ ہائی اسکول کہلایا۔ اس کے ماسوا ایک رسالہ بعنوان 'التماس بخدمت ساکنانِ ہند درباب ترقیِ اہلِ ہند' شائع کی۔

مذکورہ بالا اصلاحی پروگراموں کی سرسید نے ابھی شروعات ہی کی تھی کہ ان کا تبادلہ علی گڑھ ہوگیا۔ سرسید نے چونکہ ہندستانیوں کی اصلاح کا بیڑہ اٹھالیا تھا، اس لیے انھوں نے سب سے زیادہ کارآمد اور مددگار پروگرام 'سائنٹفک سوسائٹی' اور اس کے پورے دفتر کو علی گڑھ منتقل کردیا۔

علی گڑھ میں سرسید نے سوسائٹی کو مزید فعال بنانا شروع کردیا تھا۔ مختلف النوع علوم وفنون کی کتابوں کو اردو میں منتقل کرنے کے لیے اب وہ اپنی تمام تر کوششیں صرف کرنے لگے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مختصر سے عرصے میں اس کے تحت سرسید نے مکنیکس (Mechanics)، برق نیومیٹکس (Electro Pneumatic)، نیچرل فلاسفی (Natural Philosophy)، جدید زراعت (Modern Agriculture) اور ریاضی (Mathematics) جیسی کتابوں کا ترجمہ کروایا۔ یہی نہیں، مہینے میں کئی بار وہ اس کے جلسے بھی کروانے لگے تھے جن میں تعلیمی، اصلاحی اور سائنسی مضامین پڑھے جاتے تھے۔ ہر مہینے طبیعیات (Physics) کے کسی نہ کسی پہلو پر تقریر کی جاتی اور سامعین کے سامنے عملی تجربات بھی پیش کیے جاتے تھے۔

'سائنٹفک سوسائٹی' کے زیرِ اہتمام جس نوع کی کتابوں کے ترجمے ہونے لگے تھے، اس سے نہ صرف یہ کہ اردو زبان علمی زبان میں باقاعدہ تبدیل ہونے لگی تھی، بلکہ یہاں کے عوام میں ترقی پسند خیالات کو قبول کرنے کا رجحان بھی فروغ پانے لگا تھا۔ بحث ومباحثے کا آغاز ہوا اور لوگوں میں روشن خیالی پیدا ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ بعض ناقدین نے علی گڑھ میں 'سائنٹفک سوسائٹی' کے قیام کو علی گڑھ تحریک کا نقطۂ آغاز تصور کیا ہے۔ جبکہ حقیقت یہ

ہے کہ اس کا آغاز اتر پردیش کے غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی کے قیام سے ہوجاتا ہے۔ البتہ ارتقا علی گڑھ میں ہوا۔ کیونکہ یہاں اس کے زیرِ انتظام سرسید نے بہت سارے علمی اور اصلاحی پروگراموں کا آغاز کیا۔ مثلاً ہندستانی عوام اور برطانوی حکمرانوں کے درمیان موانست و روابط قائم کرنے کے لیے انھوں نے سوسائٹی کے زیرِ اہتمام 30 مارچ 1866 کو 'علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ' نام کا ایک اخبار جاری کیا۔ اس سے ملک میں ترقی پسند خیالات عام ہونے لگے تھے۔ خصوصاً انگریزوں اور ہندستانیوں کے درمیان جس نوع کی منافرت پیدا ہوگئی تھی، اسے دور کرنے کے لیے سرسید نے گزٹ کو اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی میں بھی شائع کروایا۔ شروع میں یہ اخبار ہفتہ وار تھا، بعدازاں سہ روزہ ہوگیا تھا۔ علاوہ ازیں 10 مئی 1866 کو سرسید نے علی گڑھ میں یوروپی اور ہندستانی عوام پر مشتمل ایک مقتدر مجمع سے خطاب کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ اب ہندستانی معاملات کو پارلیمنٹ کے سامنے پیش کیا جانا بے حد ضروری ہے۔ اسی جلسے میں British Indian Association کا قیام عمل میں آیا اور انھوں نے ایک ایسے ادارے کے قیام کی ضرورت پر زور دیا جو برطانوی پارلیمنٹ کو ہندستانی عوام کی ضروریات اور خواہشات سے باخبر رکھ سکے۔ اس کے ساتھ ہی وہ برطانوی پارلیمنٹ کے تعلق سے ہندستانی عوام کی عدم دلچسپی اور لاعلمی بھی دور کرنے لگے تھے۔ دراصل سرسید چاہتے تھے کہ ہندستان کے عوام اپنی تمام تر شکایات بلا جھجک حکومت کے سامنے رکھیں تاکہ انگریز ان پر اعتماد کرکے ان کی ترقی کے لیے منصوبے بنا سکیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ اس طرح کی سیاسی حکمت عملی میں یقین رکھنے کے باوجود سرسید نے اپنی زندگی کے اخیر اخیر تک عملی سیاست میں قدم نہیں رکھا۔ انھوں نے اپنی زندگی کا واحد مقصد ہندستانیوں، خصوصاً مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کے ذریعے ترقی پسند علوم وفنون کو عام کرنا بنالیا تھا۔ کیونکہ وہ اسے ترقی کا پہلا زینہ تصور کرتے تھے۔ اس کے بغیر کسی بھی قسم کی ترقی سرسید کے نزدیک ناممکن تھی۔

سرسید کے یہ وہ عزائم ہیں جن کی بدولت انھوں نے ہندستانیوں بالخصوص مسلمانوں کو جدید پیشہ ورانہ اور ترقی پسند علوم سے بہرہ ور کرنے کے لیے اردو زبان میں سیاسی، سماجی، معاشی، سائنسی، منطقی اور علمی موضوعات کو پیش کرنا شروع کردیا تھا۔ رفتہ رفتہ سرسید کی یہ کوششیں رنگ لائیں اور بہت جلد اردو زبان میں نت نئے علمی موضوعات کو بآسانی پیش کیا جانے لگا تھا۔

14.3.2 اردو نثر پر سرسید کے احسانات واثرات

سرسید نے 1869 میں لندن کا سفر کیا۔ یہ سفر اگرچہ انھوں نے اپنے بیٹوں سید حامد اور سید محمود کی تعلیم کی غرض سے کیا تھا لیکن انگلستان میں اپنے قیام کے دوران انھوں نے مغربی تعلیم کا بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا۔ انگریزوں سے ربط ضبط پیدا کیا۔ لندن کے بازاروں، کارخانوں، تعلیمی اور تہذیبی اداروں کو بھی دیکھا۔ یہاں انھوں نے انگلستان کے تاریخی اور معاشرتی حالات کا مطالعہ کیا تو وہ اٹھارہویں صدی کے مشہور انگریزی

رسالے 'ٹیٹلر' (Tatler) اور 'اسپکٹیٹر' (The Spectator) کی معنویت کے قائل ہو گئے تھے۔ یہ وہ رسالے ہیں جنھیں دو انگریز مدیروں 'جوزف اڈیسن' اور 'سر رچرڈ اسٹیل' نے لندن سے جاری کیا تھا۔

انگریزی شاعر، مضمون نگار، ڈرامہ نگار اور سیاست دان جوزف ایڈیسن (Joseph Addison: 1672-1719) کا نام عام طور پر اس کے دیرینہ دوست سر رچرڈ اسٹیل (Sir Richard Steele: 1672-1729) کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ 1709 میں اسٹیل نے Tatler کا اجرا کیا تو ایڈیسن نے اس کی باقاعدہ معاونت کی۔ ایڈیسن نے اس کے لیے 42 مضامین لکھے۔ اسی طرح مارچ 1711 میں The Spectator شروع کیا تو اس کے لیے ایڈیسن نے 274 مضامین جبکہ اسٹیل نے 236 مضامین لکھے۔ یہ وہ مضامین ہیں جن کے سادہ نثری انداز نے سترہویں صدی کے طرزِ عمل اور روایتی کلاسیکی تصورات کو ختم کرنے میں اہم رول ادا کیا۔

مذکورہ بالا دونوں پرچوں نے اس زمانے میں انگریزوں کے اخلاق و عادات اور تہذیب و معاشرت پر چونکہ زبردست اثر ڈالا تھا، اس لیے سرسید نے ان پرچوں کی طرز پر ہندستان میں ایک ایسا رسالہ نکالنے کا ارادہ کر لیا جس کے ذریعے وہ لندن کی برکتوں کو ہندستانی عوام تک پہنچا سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ لندن سے واپس آنے کے فوراً بعد سرسید نے علی گڑھ سے 'تہذیب الاخلاق' نام کا ایک رسالہ جاری کیا جس کا پہلا شمارہ 24 دسمبر 1870 کو منظر عام پر آیا۔ یہ وہ رسالہ ہے جس میں خود سرسید کے متعدد مضامین شائع ہوئے۔ علاوہ ازیں دو مغربی دانشوروں 'ایف گیزٹ' اور 'ہنری طامس بکل' کے مضامین کا ترجمہ بھی 'تہذیب الاخلاق' میں شائع کیا گیا۔

ایف گیزٹ (Francois Guizot:1787-1874) نے پیرس میں قانون کی تعلیم حاصل کی اور نپولین مخالف ادبی حلقوں میں اس نے شرکت کی۔ 1812 میں پیرس یونیورسٹی میں وہ تاریخ کا پروفیسر مقرر ہوا۔ 1828 میں تین جلدوں پر مشتمل ایف گزٹ کی کتاب 'یوروپ میں تہذیب کی عمومی تاریخ' (General History of Civilization in Europe) اور 1829 سے 1832 کے درمیان پانچ جلدوں پر مشتمل اس کی کتاب 'فرانس میں تہذیب کی تاریخ' (The History of Civilization in France) منظر عام پر آئی۔ 37-1832 کے درمیان ایف گیزٹ وزیر تعلیم تھا اور 1833 میں اس نے ایک قانون (Guizot) پاس کیا جس کی رُو سے تمام شہریوں کے لیے سیکولر پرائمری تعلیم قابل رسائی بنا دی گئی تھی۔

ہنری طامس بکل (Henry Thomas Buckle:1821-1862) کو برطانیہ کی تاریخ سے بے پناہ دلچسپی تھی۔ تاریخ سے اس کی دلچسپی کے باعث اسے سائنسی تاریخ کا موجد قرار دیا جاتا ہے۔ 1840 تک بکل نے اپنی تمام تر صلاحیتیں اور توانائیاں اپنے کام کی تیاری کے لیے وقف کر دی تھی۔ اگلے سترہ برسوں کے دوران اس نے اس مقصد کے لیے روزانہ دس گھنٹے کام کیا۔ 1851 تک بکل نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اس کا کام تہذیب کی تاریخ ہوگا۔ اپنے اس کام کی پہلی جلد اس نے 'انگلینڈ میں تہذیب کی تاریخ' (History of Civilisation

in England) کے عنوان سے 1857 میں شائع کی۔

جوسف ایڈیسن، ریچرڈ اسٹیل، ایف گیزٹ، طامس بکل کے علاوہ جان اسٹورٹ مل جیسے مغربی ادیبوں/ فلسفیوں کے افکار وخیالات کو بھی سر سید نے اپنی تخلیقات میں پیش کرنے کی کوشش کی یا اس کے زیر اثر اپنی تحریریں پیش کیں۔

جان اسٹورٹ مل (John Stuart Mill: 1806-1873) نے اگر چہ جمہوری حکومت کی حمایت کی، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ 'انتہائی جمہوریت' کا مخالف بھی تھا کیونکہ اس کے مطابق اس سے انفرادیت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسٹورٹ مل نے قیامِ جمہوریت کے لیے قانون ساز کا دانا، تعلیم یافتہ، خوش حال، وسیع القلب اور ذاتی اغراض سے بالاتر ہونا ضروری قرار دیا تھا۔ اس کے مطابق جمہوری حکومت اسی وقت کامیاب ہو سکتی ہے جب اس کے تمام رائے دہندگان تعلیم یافتہ اور باشعور ہوں۔

سر سید کا مقصد چونکہ ہندستانی عوام کو مہذب اور شائستہ بنانا تھا، اس لیے 'تہذیب الاخلاق' میں انھوں نے مذکورہ بالا تمام مغربی ادیبوں، تاریخ دانوں اور فلسفیوں کے افکار وخیالات پر مشتمل مضامین کو شائع کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس پرچے کے اغراض ومقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے سر سید نے اس کے پہلے شمارے میں لکھا تھا:

> ''اس پرچہ کے اجرا سے مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجہ کی سویلزشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جاوے تا کہ جس حقارت سے سویلزڈ یعنی مہذب قومیں [انگریز] ان کو دیکھتی ہیں، وہ رفع ہو اور وہ بھی دنیا میں معزز و مہذب قومیں کہلاویں۔ سویلزشن انگریزی لفظ ہے جس کا تہذیب ہم نے ترجمہ کیا ہے مگر اس کے معنی نہایت وسیع ہیں اور اس سے مراد انسان کے تمام افعال ارادی اور اخلاق اور معاملات اور معاشرت اور تمدن، صرف اوقات اور علوم اور ہر قسم کے فنون اور ہنر کو اعلیٰ درجہ کی عمدگی تک پہنچانا اور ان سے نہایت خوبی اور خوش اخلاقی اور تمکین اور وقار اور قدر و منزلت حاصل کی جاتی ہے اور وحشیانہ پن اور انسانیت میں تمیز نظر آتی ہے۔''

(تہذیب الاخلاق (علی گڑھ)، جلد: 1، شمارہ: 1 (24 دسمبر 1870)، ص 1۔)

سر سید کا مقصد چونکہ واضح تھا، اس لیے 'تہذیب الاخلاق' کے ذریعے سر سید نے تعلیم کی اہمیت، آزادیِ رائے، اخلاقیات، ریاکاری اور رسم ورواج کی پابندی جیسے موضوعات کو بے حد سلیس اور سادہ انداز میں پیش کرنا شروع کر دیا تھا۔ آراستہ اور پیراستہ عبارت آرائی سے احتراز کرتے ہوئے سلاست وصراحت پر زور دیا تا کہ اردو نثر کو اس قابل بنایا جا سکے کہ وہ علمی اور سائنسی موضوعات کی ترسیل کا ذریعہ بن سکے۔ اس حوالے سے 'بحث وتکرار'،

'گزراہوازمانہ'، 'امید کی خوشی'، 'تعلیم'، 'آزادیِ رائے'، 'اخلاق'، 'ریاکاری'، 'خوشامد' اور 'رسم ورواج کی پابندی' جیسے مضامین کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔

'تہذیب الاخلاق' کے ذریعے سرسید نے دراصل ہندستانیوں کو یہ مشورہ دینا شروع کردیا تھا کہ وہ خیالات میں آزادی اور وسعت پیدا کریں، معاملات میں سائنسی نقطۂ نظر اختیار کریں، ان مذہبی اعتقادات سے نجات حاصل کریں جن کی بنیاد مذہبی اصولوں پر نہیں ہے اور ترقیِ تہذیب کے لیے رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔

'تہذیب الاخلاق' میں شائع ہونے والے دیگر حضرات کے مضامین بھی اصلاحی نوعیت کے ہوتے تھے ۔یہی وجہ ہے کہ اس کے زیر اثر نہ صرف یہ کہ ہمارا نثری ادب بلکہ پورا کا پورا ادب برق رفتاری سے سادگی اور حقیقت نگاری کی جانب رواں دواں ہوگیا تھا۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کی ترقی کے لیے سرسید نے اگرچہ عملی طور پر انگریزی اسکول کھولا، علمی کتابوں کا ترجمہ کرنے کے لیے 'سائنٹفک سوسائٹی' جیسا ادارہ قائم کیا، 'علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ' اور 'تہذیب الاخلاق' جیسے اخبارات ورسائل کا اجرا کیا اور دیگر بہت سی تعلیمی، اصلاحی اور تہذیبی انجمنیں قائم کیں۔ لیکن ان کی تشہیر وتبلیغ کے لیے جو زبان استعمال کی، وہ اردو تھی۔اسی زبان میں انھوں نے اپنے پیغام کو لوگوں تک پہنچایا۔اس کے لیے سرسید نے خاص طور پر نثر کا سہارا لیا۔اس سے قبل ہمارے ادیبوں نے شاعری پر زیادہ توجہ دی تھی۔وہ بھی ایسی شاعری جس میں محض عشق وعاشقی اور ہجر ووصال کا ذکر ہوتا تھا۔اس کی زبان بھی بے حد رنگین اور پیچیدہ ہوتی تھی۔اس کے برعکس سرسید نے اپنے پیغام کو عام کرنے کے لیے منطقی، استدلالی اور سادہ نثر کا استعمال کیا جس میں قطعیت اور حقیقت نگاری شامل ہوتی تھی۔

سرسید سے قبل نثر اور شاعری کی زبان میں بہت زیادہ فرق نہیں کیا جاتا تھا۔ہمارا قدیم نثری سرمایہ شاعری کی مانند جذبات وتخیل پر مبنی ہوتا تھا۔جبکہ شاعری اور نثر کے درمیان تخیل اور عقل کی بنیاد پر فرق کیا جاتا ہے۔ سرسید نے نثر کی بنیاد عقل پر رکھ کر اسے حقیقی نثر کے دائرے میں داخل کیا۔ان سے قبل غالب (1797-1869) نے اپنے خطوط کے ذریعے اس نوع کی نثر لکھنی شروع کردی تھی لیکن سرسید نے اسے باقاعدہ ایک تحریک کی شکل دی۔یہی وجہ ہے کہ بعض ناقدین نے انھیں بجا طور پر جدید اردو نثر کا بانی قرار دیا ہے۔

حقیقت نگاری، منطقیت، ہمہ گیری، مفکرانہ سنجیدگی اور تبلیغی جوش کو داخل کرکے سرسید نے حقیقت یہ ہے کہ اردو نثر میں ایک ایسی روایت قائم کی جس میں سادگی اور فطری پن کو غلبہ حاصل تھا۔یہ وہ روایت ہے جسے سرسید کے بعض رفقا مثلاً محمد حسین آزاد، حالی، شبلی اور نذیر احمد نے اپنی تحریروں کے ذریعے مزید وسعت دی۔انھوں نے اردو نثر میں مضامین اور مقالات کے علاوہ انشائیہ نگاری، سوانح نگاری، ناول نگاری، خطوط نگاری، سفرنامہ نگاری اور تنقید نگاری جیسی اصناف کو داخل کیا۔

محمد حسین آزاد(1910-1830) نے 'قصص الہند'(1869)، 'نیرنگِ خیال' (1880)، 'آب حیات' (1881)، 'سیر ایران'(1886)، 'دربار اکبری'(1898)اور 'سخن دانِ فارس'(1907) جیسی تصانیف کے ذریعے اردو نثر کو وسعت بخشی۔ 'نیرنگِ خیال' تمثیلی انشائیوں کا مجموعہ ہے جو دو حصوں پر مشتمل ہے۔اس کے تصورات آزاد نے انگریزی ادب سے مستعار لیے تھے۔خاص طور پر 'ایڈیسن' اور 'جانسن' کی مضمون نگاری کے سانچوں میں آزاد نے ان انشائیوں کی تخلیق کی ہے۔ 'آب حیات' میں محمد حسین آزاد نے شاعروں کے احوال زندگی اور ان کے واقعات پر پہلی بار قدرے تفصیل سے روشنی ڈالی۔اس سے قبل اگرچہ اردو میں تذکرے لکھے گئے تھے،لیکن ان کی زبان عام طور پر فارسی ہوا کرتی تھی اور شعرا کے حالات بے حد مختصر ہوتے تھے۔'آب حیات' کی نمایاں خوبی یہ ہے کہ اس میں تنقید کا پہلو شامل ہے۔یہی وجہ ہے کہ اسے اردو میں تاثراتی تنقید کا اوّلین نمونہ قرار دیا جاتا ہے۔اس کے ماسوا اس میں سوانح نگاری اور خاکہ نگاری کے نقوش بھی ابھرتے ہیں۔ 'دربار اکبری' میں تاریخ ہند کے ایک سنہرے دور کو موضوع بنایا گیا ہے جس کے تحت اکبر اعظم کی رواداری، وسیع النظری اور روشن خیالی کو حسن و خوبی پیش کیا گیا ہے۔جبکہ 'سخن دان فارس' فارسی زبان و ادب سے متعلق مختلف مقالات کا مجموعہ ہے۔

الطاف حسین حالی(1914-1837) نے 'حیات سعدی'(1886)، 'یادگار غالب'(1897)اور 'حیات جاوید'(1901) جیسی کتابیں لکھ کر اردو کو مغرب کی ایک نثری صنف سوانح نگاری سے متعارف کرایا۔سرسید کے زیر اثر حالی نے نثر میں سلاست، بے تکلفی، شگفتگی اور جاذبیت پیدا کرنے کی سعی کی۔تصنع اور مقفٰی و مسجع عبارتوں سے پرہیز کیا۔1893 میں ان کا مجموعۂ کلام ان کے ایک مبسوط مقدمہ کے ساتھ شائع ہوا تو ادبی حلقوں میں تہلکہ مچ گیا تھا۔کیونکہ حالی نے اپنے مقدمے میں پہلی بار مشرق کے ساتھ ساتھ مغربی اصولِ نقد کی طرف باقاعدگی سے توجہ کی اور مربوط شکل میں تنقیدی نظریات پیش کیے۔انھوں نے ورجل، شیکسپیئر، جان ملٹن، گولڈ اسمتھ ، بائرن اور سر والٹر اسکاٹ جیسے مغربی شاعروں اور ادیبوں کا حوالہ دے کر یہ واضح کرنے کی کوشش کی کہ شعر و ادب اپنے عہد کا آئینہ ہوتا ہے اور اس کے ذریعے معاشرے میں بعض مثبت تبدیلیاں لائی جاسکتی ہیں۔جبکہ اس سے قبل ہمارا شعر و ادب محض الفاظ و محاورات کی خوبیوں، بندش کی چستی، بحر کی روانی، تعقید لفظی اور صحتِ زبان پر ہی مشتمل ہوا کرتا تھا۔حقیقت یہ ہے کہ حالی نے اپنے ان خیالات کے ذریعے اردو شعر و ادب کو باقاعدہ 'ترقی پسندی' کی جانب مائل کر دیا تھا۔

حالی کے مذکورہ بالا مقدمے کو اس قدر مقبولیت ملی کہ 1920 میں اسے 'مقدمۂ شعر و شاعری' کے نام سے علاحدہ کتابی صورت میں شائع کیا گیا۔اس کے بعد ہمارا تنقیدی سرمایہ روز افزوں ترقی کرنے لگا تھا۔اس حوالے سے امداد امام اثر، عبدالرحمٰن بجنوری، نیاز فتح پوری ،کلیم الدین احمد ،آل احمد سرور، احتشام حسین، سردار جعفری، شمس الرحمٰن فاروقی اور گوپی چند نارنگ جیسے ناقدین کا ذکر کیا جاسکتا ہے جنھوں نے اردو تنقید کو نت

نئی بلندیوں سے ہمکنار کیا۔

سرسید نے روایات سے کسی قدر بغاوت کر رکھی تھی۔ وہ عصری اور مغربی افکار ونظریات کی روشنی میں اسلام کا مطالعہ کرنے کی وکالت کرتے تھے۔ جبکہ شبلی نعمانی (1914-1857) مشرقی افکار ونظریات کو اہمیت دیتے تھے۔ مغربی اقدار کو وہ اسلامی نقطۂ نظر سے جانچنے کی سعی کرتے تھے۔ تاریخ، تنقید اور سوانح جیسی صنف پر شبلی نے اسی نقطۂ نظر سے طبع آزمائی کی ہے۔ اس حوالے سے ان کی 'المامون' (1887)، 'الجزیہ' (1889)، 'سیرۃ النعمان' (1891)، 'سفرنامۂ روم وشام ومصر' (1894)، 'الفاروق' (1899)، 'الغزالی' (1902)، 'علم الکلام (1902)'، 'الکلام' (1904)، 'سوانح مولانا روم' (1906)، 'موازنۂ انیس و دبیر' (1907)، 'شعرالعجم' (پانچ جلدیں یکے بعد دیگرے 1908، 1910، 1910، 1912 اور 1918 میں شائع ہوئیں)، 'اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر' (1909) اور 'سیرت النبی - دو جلدیں' (1918) جیسی کتابوں کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔ 'موازنۂ انیس و دبیر' لکھ کر شبلی نے اردو میں تقابلی تنقید کی باقاعدہ بنیاد ڈالی۔ اس سے قبل اگرچہ تقابلی تنقید کے کچھ نقوش، تذکروں میں ملتے ہیں، لیکن 'موازنۂ انیس و دبیر' کو اس میدان میں اولیت حاصل ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد (1910-1836) نے 'مراۃ العروس' (1869)، 'بنات النعش' (1872)، 'توبت النصوح' (1877)، 'محصنات' (1885)، 'ابن الوقت' (1888)، 'ایامیٰ' (1891)، 'رویائے صادقہ' اور 'منتخب الحکایات' جیسی چیزیں لکھ کر پہلی بار اردو میں حقیقت پر مبنی قصے کہانیوں کو فروغ دینا شروع کر دیا تھا۔ اس سے قبل ہمارا افسانوی ادب مافوق فطری (Supernatural) عناصر پر مبنی غیر حقیقی داستانوں تک محدود تھا۔ سرسید کے زیر اثر نذیر احمد نے جس نوع کے حقیقی قصے لکھے، اس کی تقلید میں رتن ناتھ سرشار (1902-1846)، عبدالحلیم شرر (1926-1860)، مرزا محمد ہادی رسوا (1931-1858)، راشد الخیری (1936-1868) اور منشی پریم چند (1936-1880) جیسے ادبا بھی ناول نگاری اور افسانہ نگاری کی جانب راغب ہو کر اردو ادب کے افسانوی ادب کو 'ترقی پسندی' سے ہمکنار کرنے لگے تھے۔

14.3.3 اردو شاعری پر سرسید کے اثرات

سرسید شاعر تو نہیں تھے لیکن نثر میں جس نوع کی سادگی، وضاحت وصراحت، منطقیت اور حقیقت نگاری کو انھوں نے رواج دیا، شاعری میں بھی اسی طرح کی حقیقت نگاری کو وہ داخل کرنا چاہتے تھے۔ اس حوالے سے سرسید نے اپنے بعض مضامین اور خطوط میں اس کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً 1874 میں 'انجمن پنجاب' کے زیر اہتمام محمد حسین آزاد کی نگرانی میں جس قسم کے مناظموں کا آغاز ہوا اور اس میں جس طرح کی نیچرل نظموں کو رواج دیا جانے لگا تھا، اس سے سرسید بہت خوش ہوئے تھے۔ اس کا اندازہ سرسید کے اس جوابی خط سے لگایا جاسکتا ہے جسے انھوں نے محمد حسین آزاد کو لکھا تھا۔ 19 اکتوبر 1874 کو محمد حسین آزاد کے نام اپنے ایک خط میں سرسید نے آزاد کی کچھ

یوں حوصلہ افزائی کی تھی:

''...افسوس صد افسوس کہ کبھی مسلمانوں میں باہم اتفاق نہ ہوا۔ شعروسخن پر ردوقدح دوسری چیز ہے اور آپس کا نفاق دوسری چیز ہے۔ میری نہایت قدیم تمنا اس مجلس مشاعرہ سے برآئی ہے۔ میں مدت سے چاہتا تھا کہ ہمارے شعرا نیچر کے حالات کے بیان پر متوجہ ہوں۔ آپ کی مثنوی 'خواب امن' پہنچی، دل بہت خوش ہوا۔ دراصل شاعری اور زورسخن وری کی داد دی ہے۔ اب بھی اس میں خیالی باتیں بہت ہیں۔ اپنے کلام کو اور زیادہ نیچر کی طرف مائل کرو۔ جس قدر کلام نیچر کی طرف مائل ہوگا، اتنا ہی مزہ دے گا۔ اب لوگوں کے طعنوں سے مت ڈرو۔ ضرور ہے کہ انگریزی شاعروں کے خیالات لے کر اردو زبان میں ادا کیے جائیں۔ یہ کام ہی ایسا مشکل ہے کہ کوئی کرتو دے۔ اب تک ہم میں خیالات نیچر کے ہیں ہی نہیں۔ ہم بیان کیا کر سکتے ہیں...''

(سرراس مسعود [مرتب]، خطوط سرسید، بدایوں: نظامی پریس، 1931، ص22۔)

سرسید کے اس جوابی خط سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے شاعری میں بھی خیالی باتوں سے دور رہنے اور حالات کو نیچرل انداز میں بیان کرنے پر زور دیا۔ انگریزی شاعروں کے خیالات اردو میں ادا کرنے، سادگیِ الفاظ، صفائیِ بیان اور عمدگیِ خیال سے قارئین اور سامعین کے دلوں کو اپنی جانب مائل کرنے کے لیے کہا۔

شاعری کے حوالے سے سرسید کی یہ باتیں اس زمانے میں، جبکہ موضوعی نظمیں لکھنے کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا اور ہیئت کے مختلف تجربے بھی ہونے لگے تھے، شعرا کو روایت سے بغاوت کرنے کے لیے مزید آمادہ کرنے لگی تھیں۔ شعروادب کو سماجی پروگراموں کے زیر اثر لانے کے تصور نے شعرا کے تخلیقی جذبے اور اس کی ماہیت کو متاثر کرنا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ بہت جلد شعروادب تخلیق سے زیادہ افادی پروگراموں کی تلقین وترسیل کا آلۂ کار بننے لگا تھا۔ اس حوالے سے وقتاً فوقتاً منظر عام پر آنے والی سرسید کی دیگر تحریروں نے اسے مزید پختہ کیا۔ مثلاً اپنے ایک مضمون میں انھوں نے شعرا کے متعلق لکھا کہ:

''شاعر کے ذہن میں وہی چند محدود خیالات جمع ہیں جن کو اگلے شعرا باندھ گئے ہیں یا صرف وہی معمولی باتیں اس کو بھی معلوم ہیں جیسی کہ عام لوگوں کو معلوم ہوتی ہیں۔ اور اس نے شاعری کی تکمیل کے لیے اپنی معلومات کو وسعت نہیں دی اور صحیفۂ فطرت کی عادت نہیں ڈالی۔''

(بحوالہ الطاف علی بریلوی، مقدمہ، مشمولہ 'علی گڑھ تحریک اور قومی نظمیں' [مرتبہ الطاف علی بریلوی و محمد ایوب قادری]، کراچی: اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، 1970، ص30۔)

خیال کی محدودیت کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کی محدودیت کو بھی سرسید نے اجاگر کیا۔ اس میں وسعت اور دل نشینی پیدا کرنے کے لیے وہ شعرا کو دوسری زبانوں کے الفاظ داخل کرنے کی تلقین کرتے نظر آتے ہیں۔ بندھی ٹکی لفظیات میں دوسری زبانوں کے الفاظ شامل کر کے سرسید اردو ادب کو زیادہ کارآمد، مفید اور دلپذیر بنانا چاہتے تھے۔ اس ضمن میں انھوں نے اپنے ایک دوسرے مضمون میں لکھا ہے کہ:

> ''دوسری زبان کے لفظوں کو اپنی زبان میں بولنا کبھی عبارت کا لطف بڑھانے کے لیے ہوتا ہے کبھی اپنی زبان کو وسعت دینا اور نئے لفظوں کا اس میں داخل کرنا مقصود ہوتا ہے۔ کبھی سامعین کو مطلب کی طرف زیادہ متوجہ کرنے کے لیے بولا جاتا ہے۔ کبھی اس مطلب کی عظمت جتانے کو کہا جاتا ہے جو عظمت اس مرادف لفظ سے جو اس زبان میں مستعمل ہے، دل میں نہیں بیٹھتی۔''

(سرسید احمد خاں، ترقیِ علم انشا، مشمولہ 'تہذیب الاخلاق: جلد دوم' [مرتبہ: منشی فضل الدین]، لاہور: مصطفائی پریس، 1895، ص ص 02-601۔)

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ سرسید نے اپنے مختلف مضامین کے ذریعے ایسی شاعری پر زور دیا جس میں خیال کی بلندی کے ساتھ ساتھ زبان و اسلوب میں بھی بلندی پائی جائے۔ زبان و اسلوب کی بلندی سے ان کی مراد فطری پن اور عقل کے عین مطابق سے ہے۔ اس کے لیے انھوں نے دوسری زبانوں کے الفاظ سے استفادہ کرنے کی وکالت کی۔

لاہور میں اپنے قیام کے دوران (74-1872) الطاف حسین حالی نے 'انجمن پنجاب' کے زیر اہتمام منعقدہ مناظموں میں جس نوع کی نظمیں پیش کیں، ان سے سرسید اس قدر خوش ہوئے تھے کہ انھوں نے حالی سے ایک ایسی نظم لکھنے کی فرمائش کر ڈالی تھی جس میں مسلمانوں کے اخلاقی تنزل، معاشی بدحالی اور ذہنی پستی کو پیش کر کے ان کے زوال پر افسوس کیا گیا ہو۔ نیز بدلے ہوئے حالات میں جینے اور نئے شعار کو اپنانے کی تلقین کی گئی ہو۔ چنانچہ حالی نے مسدّس کی ہیئت میں ایک نظم 'مدوجزر اسلام' کے عنوان سے رقم کی۔ 1879 کی اس نظم کے ابتدائی چند بند میں حالی نے ظہور اسلام سے قبل عرب کی جو ابتر حالت (دور جاہلیت) تھی، اس کا نقشہ پیش کیا ہے۔ اس کے بعد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سرپرستی میں اسلام کا طلوع ہونا، ان کی تعلیم سے مسلمانوں میں دینی اور دنیوی ترقیات کے باعث پوری دنیا پر ان کا سبقت لے جانا وغیرہ کو پیش کیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد جس طرح کی تنزلی شروع ہوگئی تھی، اس کو بھی بیان کیا ہے۔ نظم کے اخیر میں حالی نے مسلمانوں کو امید کا دامن نہ چھوڑنے کی تلقین کرتے ہوئے علم کی اہمیت کچھ یوں واضح کی ہے۔

حکومت سے مایوس تم ہو چکے ہو　　زر و مال سے ہاتھ تم دھو چکے ہو

دلیری کو ڈھک ڈھک کے منہ رو چکے ہو بزرگی بزرگوں کی سب کھو چکے ہو

مدار اب فقط علم پر ہے شرف کا

کہ باقی ہے ترکہ یہی اک سلف کا

ہمیشہ سے جو کہتے آئے ہیں سب یاں کہ ہے علم سرمایۂ فخرِ انساں

عرب اور عجم، ہند اور مصر و یوناں رہا اتفاق اس پہ قوموں کا یکساں

یہ دعویٰ تھا اک جس پہ حجت نہ تھی کچھ

کھلی اس پہ اب تک شہادت نہ تھی کچھ

سر سید ہی کا اثر ہے کہ حالی نے قومی اور ملی مسائل کے ساتھ ساتھ خواتین کے معاشرتی مسائل پر بھی اپنی توجہ مرکوز کی۔ عورت کی مظلومیت اور بیکسی کو انھوں نے اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ اپنی بعض نظموں میں وہ خواتین کی بے کسی اور بے بسی پر خون کے آنسو روتے نظر آتے ہیں۔ اس کے جائز حقوق کی پامالی کے خلاف انھوں نے آواز بلند کی۔ اس کی مظلومیت کو بیان کرکے حالی نے مَردوں کو آئینہ دکھایا۔ 'مناجات بیوہ' اور 'چُپ کی داد' ایسے ہی دو آئینے ہیں۔ 1886/87 کی تحریر کردہ نظم 'مناجات بیوہ' میں حالی نے بیوہ عورتوں کی کچھ یوں تصویر پیش کی ہے ۔

ہنسیے تو ہنسنا عیب ہے ہم کو

کیوں کر الٰہی کاٹیے غم کو

گر سسرال میں جاتی ہوں

میں

نحسِ قدم کہلاتی ہوں میں

میکے میں جس وقت ہوں آتی

رو رو کر ہوں سب کو رلاتی

سوچ میں میرے سارا گھر

ہے

میرے چلن پر سب کی نظر

ہے

آپ کو ہوں ہر وقت مٹاتی

پہنتی اچھا میں ہوں نہ کھاتی

'مناجات بیوہ' کے ذریعے حالی نے اگر بیواؤں کی ناگفتہ بہ حالت بیان کی تو 1905 کی تحریر کردہ

نظم 'چُپ کی داد' کے ذریعے ہندستانی معاشرت میں موجود شادی شدہ لڑکیوں کی صورتحال کو بیان کیا۔ شادی ہو جانے کے بعد لڑکیوں کو سسرال میں جس طرح کے مصائب سے دوچار ہونا پڑتا ہے، اس کی تصویر حالی نے کچھ یوں پیش کی ہے۔

میکے میں سارے گھر کی تھیں گو مالک و مختار تم
پر سارے کنبے کی رہیں بچپن سے خدمت گار تم
سسرال میں پہنچیں تو واں اک دوسرا دیکھا جہاں
جا اتریں گویا دیس سے پردیس میں اک بار تم
واں فکر تھی ہر دم یہاں ناخوش نہ ہو تم سے کوئی
اپنے سے رنجش کے کبھی پاؤ نہ واں آثار تم
بدلے نہ شوہر کی نظر، سسرے کا دل میلا نہ ہو
آنکھوں میں ساس اور نند کی کھٹکو نہ مثلِ خار تم

جو ذلتیں لازم ہیں دنیا میں جہالت کے لیے
وہ ذلتیں سب نفس پر اپنے گوارا تم نے کیں
سمجھا نہ تم کو ایک دن مَردوں نے قابل بات
کے
تم بے وفا کہلائیں لیکن لونڈیاں بن کر رہیں
آخر تمہاری چُپ دلوں میں اہلِ دل کے چبھ گئی
سچ ہے کہ چُپ کی داد آخر بے ملے رہتی نہیں
بارے زمانہ نیند کے ماروں کو لایا ہوش میں
آیا تمھارے صبر پر دریائے رحمت جوش میں

اس زمانے میں سرسید کے زیر اثر حالی کے علاوہ اردو کے دیگر بہت سے شعرا نے اردو شاعری کو افادی اور مقصدی بنانا شروع کر دیا تھا۔ اس حوالے سے محمد حسین آزاد اور حالی کے علاوہ اسمٰعیل میرٹھی، اکبر الہ آبادی، شوق قدوائی، نظم طباطبائی، شبلی نعمانی، وحید الدین سلیم، سرور جہان آبادی، نادر کاکوروی اور برج نارائن چکبست جیسے شعرا کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ سرسید کے زیر اثر جس نوع کی افادی اور مقصدی شاعری ہونے لگی تھی، اسے ادبی تاریخ نگاروں نے 'جدید شاعری' سے موسوم کیا ہے۔

سرسید نے شاعری میں جس نوع کی اصلاحات پر زور دیا، اس سے ہماری شاعری افادی اور مقصدی ہوئی اور نت نئے موضوعات کے دخول سے اردو شاعری نے وسعت بھی اختیار کی، لیکن ادبیت اور شعریت کے لحاظ سے اس کا دامن تنگ ہونے لگا تھا۔ البتہ نثر کا دامن ضرور وسیع ہوا۔ اس میں مختلف النوع موضوعات کو پیش کرنے کا رجحان فروغ پانے لگا تھا۔ نثر کی جدید مغربی اصناف اردو ادب میں داخل ہوئیں اور بہ اعتبار اسلوب و انداز سادگی، سلاست، روانی اور فطری پن کو رواج ملنے لگا تھا۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ سرسید کی مذکورہ بالا کوششوں کے زیر اثر اردو زبان و ادب میں مادیت، عقلیت، افادیت، اجتماعیت، حقیقت نگاری، دنیاوی امور پر زور اور آزادیِ رائے جیسی خصوصیات بڑی تیزی سے شامل ہونے لگی تھیں۔ یہ وہ خصوصیات ہیں جن کے اثرات آج کے زبان و ادب پر بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ سرسید ہی کی دین ہے کہ اردو زبان و ادب میں فکری آزادی آئی؛ حقیقت پسندی داخل ہوئی؛ فکری اور تنقیدی رجحان غالب ہونے لگا اور ہمارا شعر و ادب با مقصد بنا۔ اب تک ہمارا شعر و ادب ایک محدود دائرے میں گردش کر رہا تھا، سرسید نے اس کے دائرے کو وسیع کیا۔ اس کا رشتہ زندگی، فرد اور معاشرہ سے باقاعدہ وابستہ کر کے اردو زبان و ادب کو 'ترقی پسندی' کی جانب مائل کر دیا۔

14.4 آپ نے کیا سیکھا

اس اکائی میں آپ نے

☆ سرسید کی ان خدمات سے آگاہی حاصل کی، جن سے اردو زبان حقیقت پسند اور علمی زبان میں تبدیل ہوئی۔

☆ سرسید کی ان کوششوں سے واقفیت حاصل کی جن سے اردو نثر نے حقیقی اور منطقی انداز و اسلوب اختیار کیا۔

☆ سرسید کی ان کوششوں سے بھی آگاہی حاصل کی جن سے اردو شاعری حقیقت پسند، سادہ، رواں اور فطری ہونے لگی تھی۔

☆ سرسید کی مجموعی ادبی خدمات کے مطالعے سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ سرسید کے زیر اثر اردو زبان و ادب بڑی تیزی سے عالمی زبان و ادب کا ہم پلہ بننے لگا تھا اور اس میں اب نت نئے موضوعات کو

حقیقی و

منطقی انداز میں پیش کیا جانے لگا تھا۔

14.5 اپنا امتحان خود لیجیے

1۔ اردو نثر کو علمی بنانے میں سرسید کی کس سوسائٹی نے اہم رول ادا کیا؟

2۔ اردو نثر میں منطقیت اور قطعیت جیسی خصوصیات کو داخل کرنے میں سرسید کے کس رسالہ نے اہم رول ادا کیا؟

3۔ سرسید نے اردو کے کس شاعر کی باقاعدہ خط لکھ کر حوصلہ افزائی کی تھی؟

4۔ حالی نے سرسید کی فرمائش پر کون سی نظم لکھی؟

5۔ کیا سرسید کو جدید اردو نثر کا باقاعدہ موجد کہا جا سکتا ہے؟

14.6 سوالات کے جوابات

1۔ اردو نثر کو علمی بنانے میں سرسید کی 'سائنٹفک سوسائٹی' کا اہم رول رہا ہے۔

2۔ اردو نثر میں منطقیت اور قطعیت جیسی خصوصیات کو داخل کرنے میں سرسید کے رسالہ 'تہذیب الاخلاق' نے اہم

رول ادا کیا۔

3۔ سرسید نے اردو کے شاعر محمد حسین آزاد کی باقاعدہ خط لکھ کر حوصلہ افزائی کی تھی۔

4۔ حالی نے سرسید کی فرمائش پر نظم 'مدوجزر اسلام' لکھی۔

5۔ جی، بالکل! سرسید کو جدید اردو نثر کا باقاعدہ موجد کہا جا سکتا ہے۔

14.7 فرہنگ

لفظ	معنی
افادی	فائدہ مند
سلاست	بات چیت یا تحریر میں مشکل الفاظ کا نہ آنا یا نہ لانا، آسانی
روانی	بہاؤ، بغیر کسی جھجک کے کسی چیز کا آگے بڑھنا
فطری پن	جس میں کسی قسم کا کوئی دکھاوا نہ ہو
بیداری نو	نشاۂ ثانیہ یعنی کسی قوم یا ملک کا از سر نو ترقی کرنا

نہج	طور طریقہ
بے رغبتی	کسی چیز سے کسی بھی قسم کی دلچسپی کا نہ ہونا
منافرت	باہم نفرت، دشمنی
موانست	محبت، دوستی
روابط	ربط کی جمع ہے، تعلقات، وابستگی
مقتدر	طاقت رکھنے والا، حاکم، زور آور
معاونت	مدد، حمایت
اجرا	جاری کرنا، شروع کرنا
موجد	ایجاد کرنے والا، نئی بات پیدا کرنے والا
تمکین	طاقت، مرتبہ، عزت
آراستہ و پیراستہ	سجا سجایا، بنا سنورا، درست، ترتیب سے
صراحت	تشریح، وضاحت
ریاکاری	مکاری، فریب، نفاق
قطعیت	کسی چیز کا مکمل یا یقینی ہونا
مملو	بھرا ہوا، لبریز
پُراسرار	راز سے بھرا ہوا، چھپی ہوئی بات
منطقی	عقلی، وہ بات جو عقلی دلائل سے ثابت ہو
استدلال	دلیل یا ثبوت
وسیع النظری	بلند خیالی، نظر کا وسیع ہونا
مبسوط	پھیلا ہوا، کشادہ
تصنع	بناوٹی، دکھاوٹی
مقفیٰ	قافیہ دار، ایسی عبارت یا بات جس میں قافیہ کا خیال رکھا گیا ہو
مسجع	وہ عبارت یا مضمون جس میں قافیہ کا اہتمام کیا گیا ہو
مربوط	بندھا ہوا، وابستہ
تعقید لفظی	عبارت کے الفاظ کو آگے پیچھے کر دینا جس سے قارئین یا سامعین کو مصنف کی باتیں سمجھنے میں

دقت ہو

ردوقدح	حجت، بحث، تکرار
مدوجزر	جوار بھاٹا، چاند کی کشش سے سمندر کے پانی کا اتار چڑھاؤ، مراد عروج وزوال
ناگفتہ بہ	شرمناک، ایسی بات جس کا نہ کہنا بہتر ہو

14.8 کتب برائے مطالعہ

اصغر عباس، سرسید کی صحافت، نئی دہلی: انجمن ترقی اردو ہند، 1975۔

افتخار عالم، سرسید اور سین ٹیفیک سوسائٹی، دہلی: مکتبہ جامعہ، 2000۔

الطاف حسین حالی، حیات جاوید، نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، 1982۔

انور سدید، اردو ادب کی تحریکیں (ابتدا تا 1975)، دہلی: کتابی دنیا، 2008۔

ثریا حسین، سرسید احمد خاں اور ان کا عہد، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، 1993۔

خلیق احمد نظامی، سید احمد خاں (مترجم: اصغر عباس)، نئی دہلی: پبلی کیشن ڈویژن، 1971۔

خلیق احمد نظامی، سرسید اور علی گڑھ تحریک، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس،، 2017۔

سید عبداللہ، سرسید اور ان کے نامور رفقا، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، 1994۔

مظہر مہدی، علی گڑھ تحریک، دہلی: انجمن ترقی اردو (ہند)، 1993۔

منظر اعظمی، اردو ادب کے ارتقا میں تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ، لکھنؤ: یوپی اردو اکادمی، 1996۔

نور الحسن نقوی، سرسید اور ہندستانی مسلمان، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، 1979۔

☆☆☆

اکائی 15 سرسید احمد خاں اور علی گڑھ تحریک

اکائی کی ساخت

15.1 اغراض ومقاصد

15.2 تمہید

15.3 علی گڑھ تحریک اور سرسید احمد خاں

15.3.1 پس منظر

15.3.2 علی گڑھ تحریک آغاز وارتقا

15.3.3 بانی تحریک سرسید احمد خاں، ان کے رفقاء اور کارنامے

15.3.4 علی گڑھ تحریک کی اہم سرگرمیاں

15.4 خلاصہ

15.5 آپ نے کیا سیکھا

15.6 اپنی جانچ خود کریں

15.7 سوالوں کے جوابات

15.8 فرہنگ

15.9 کتب برائے مطالعہ

15.1 اغراض ومقاصد

1۔ طلبہ علی گڑھ تحریک کے پس منظر سے واقف ہوں گے۔

2۔ طلبہ علی گڑھ تھریک کے اہم مقاصد سے روشناس ہوں گے۔

3۔ طلبہ علی گڑھ تحریک کی سرگرمیوں سے آشنا ہوں گے۔

4۔ طلبہ علی گڑھ تحریک کے افکار وتصورات سے واقف ہوں گے۔

5۔ طلبہ علی گڑھ تحریک کے اہم نمائندگان اور سرسید کے رفقاء سے متعارف ہوں گے۔

15.2 تمہید

کوئی بھی تحریک ایک متعینہ دن اور تاریخ سے اپنا آغاز نہیں کرتی اور نہ ہی اس کے لیے کوئی طے شدہ لمحہ ہوتا ہے جس سے اس کا آغاز اور انجام طے ہوتا ہے۔ کسی بھی رجحان یا تحریک کے پروان چڑھنے کے پس پشت کئی عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ وہ مختلف واقعات اور کیفیات، سیاسی وسماجی حالات یا معاشی صورت حال یا تہذیبی بحران یا مختلف انقلابی تغیرات کے نتیجے یا کسی خاص تاریخی، سیاسی وسماجی، علمی وادبی عمل کے ردعمل میں وجود پاتی ہے۔ یہ تمام تبدیلیاں آہستہ آہستہ اثرانداز ہوتی ہیں اور پھر ایک آواز، تحریر، تخلیق ابھرتی ہے جس کی ہمنوائی میں کئی آوازیں، کئی تحریریں اور تخلیقات سامنے

آجاتی ہیں۔اس طرح ایک ہی مزاج کے کئی دانشور، مفکر، فضلا وادبا مجتمع ہوجاتے ہیں اور رفتہ رفتہ منصوبہ بند طریقے سے کسی فکر، تصور، نہج عمل کی ترویج کی جانے لگتی ہے۔ظاہر ہے یہ تبھی ممکن ہے جب افراد، علاقے، معاشرے میں اس کی اشد ضرورت ہو۔علی گڑھ تحریک کا وجود بھی سماجی، سیاسی، تعلیمی، مذہبی، علمی وادبی ضرورت کے تحت عمل میں آیا، جس کا مقصد ہندوستان کی ترقی، مسلمانوں کی بیداری اور اصلاح تھا۔دانشوروں نے اسے نشاۃ ثانیہ سے تعبیر کیا ہے۔اس کے روح رواں سرسید احمد خاں تھے۔آیئے اب ہم علی گڑھ تحریک کے اغراض ومقاصد اور اس کے تصورات وافکار نیز اس کی خصوصیات سے واقف ہوتے ہیں۔

15.3 علی گڑھ تحریک اور سرسید احمد خاں

15.3.1 پس منظر

علی گڑھ تحریک سے قبل ہندوستان انتشار اور بدامنی کا شکار تھا۔مغلیہ سلطنت کا زوال ہو چکا تھا اور انگریز ہندوستان پر اپنا تسلط قائم کر چکے تھے۔۱۸۵۷ء کی شورش سے قبل پوری ڈیڑھ صدی پے در پے زوال اور شکست وریخت کی صدی تھی۔۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب کے انتقال کے بعد اس کے جانشینوں کی نااہلی سے ملک اندرونی سازشوں کا شکار ہو گیا تھا۔ملک کا مستقل اور مستحکم نظام چلانے والا کوئی اہل نہیں تھا۔دوسری جانب نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں اور لوٹ پاٹ نے دلی اور دیگر علاقوں کو کنگال کر دیا تھا۔دوسری جانب سراج الدولہ پلاسی اور شاہ عالم بکسر کی جنگ ہار چکے تھے اور ۱۷۹۹ء میں انگریزوں کے ہاتھوں ٹیپو سلطان کی شہادت ہو چکی تھی۔ڈچ، پرتگال، فرانسیسی ہندوستان میں مختلف علاقوں پر قابض تھے تو دوسری جانب ایسٹ انڈیا کمپنی اور انگریزوں کا تسلط ہندوستان کے اچھے خاصے علاقوں پر ہو چکا تھا۔تمام تر جبر وتسلط، معاشی استحصال کے بعد انگریزوں نے ۱۸۱۸ء میں اصلاحات کا دور شروع کیا۔بہت سی سائنسی ترقیوں جیسے تار، بجلی، ٹرین وغیرہ اور دیگر انتظامی سہولیات کے ذریعہ مثبت نتائج بھی برآمد ہو رہے تھے۔بے جا رسوم وقیود اور جہالت آمیز روایتی اقدار اور بے جا عقاید وتوہمات کا خاتمہ کیا جا رہا تھا۔تعلیمی مراکز قائم ہو رہے تھے جس میں بلاتفریق مذہب ونسل اور ذات پات کے کوئی بھی تعلیم حاصل کرسکتا تھا۔علوم جدیدہ اور انگریزی زبان وعلم کی ترویج واشاعت کا کام چل رہا تھا۔تہذیبی اشتراک بھی دونوں قوموں کے مابین نئی صورت پیدا کر رہا تھا۔طرز معاشرت میں تبدیلی آ رہی تھی۔راجہ رام موہن رائے نے اپنی قوم کے لیے ان سب کا خیر مقدم کرتے ہوئے سماجی وتعلیمی اصلاحات میں انگریزوں کا ساتھ دیا۔آریہ سماج اور برہمو سماج کی کوششیں اسی طرز پر آگے جاری تھیں۔سرسید نے ان تمام تبدیلیوں کا بغور معائنہ کیا اور انھیں اپنی قوم کی اصلاح اور بیداری کی فکر ہوئی۔لہٰذا انھوں نے مسلم قوم کی ترقی وفلاح کے لیے ان تمام مثبت تبدیلیوں اور اشاعتی کاموں کا بیڑا خود اٹھایا۔یہی وجہ ہے کہ علی گڑھ تحریک پر انگریزوں کی قائم کردہ اصلاحات، راجہ رام موہن رائے کے افکار، آریہ سماج اور برہمو سماج کے طریقوں اور شاہ ولی اللہ کی روشن خیالی کے اثرات موجود ہیں۔

15.3.2 علی گڑھ تحریک-آغاز وارتقا

علی گڑھ تحریک تعلیمی اور اصلاحی تحریک ہونے کے علاوہ سیاسی، سماجی، علمی اور ادبی تحریک بھی ہے، جس نے زندگی

کے ہر شعبہ کو اثر انداز کیا۔تحریک کے روح رواں سرسید احمد خاں تھے۔انھوں نے ۱۸۵۷ء کے واقعے کے نتیجے میں ہونے والی تباہی اور مغلیہ سلطنت کے خاتمے کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ان کی دوراندیشی نے یہ نتیجہ اخذ کرلیا تھا کہ انگریز حکومت سے زور آزمائی کرنے کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہونے والا ہے۔مناسب یہی ہے کہ حکومت کا ساتھ دیا جائے اور ہر پہلو سے اپنا جائزہ لے کر اپنی اصلاح کی جائے۔انھوں نے دوسرے کو کمزور بنانے کے بجائے خود کو ہر اعتبار سے مضبوط بنانے پر زور دیا۔سرسید نے محسوس کرلیا تھا کہ زوال اس قوم کا مقدر بن چکا ہے اور اس کی بنیادی وجہ قوم کی تعلیمی وتہذیبی گراوٹ ہے۔جب تک معاشرہ ہر اعتبار سے صحت مند نہیں ہوگا قوم کا ترقی کرنا ناممکن ہے اور معاشرہ کا علاج سوائے تعلیم کے کسی اور سے نہیں ہوسکتا۔وہ دیکھ رہے تھے کہ ہندوستان کا تعلیمی نظام فرسودہ ہے جب کہ مغربی نظام تعلیم کئی اعتبار سے مفید،تازہ اور مثبت ہے۔ایسے علوم کے حصول کے لیے زبان اور ادب ہی وسیلہ ہوتے ہیں۔سرسید کو اپنی زبان اور ادب کی صورت حال کا بخوبی علم تھا کہ اس میں بڑی تبدیلیوں کی ضرورت ہے لہٰذا جدید تعلیم کا حصول،زبان کی ترقی اور ادب میں وسعت سرسید کا اولین مقصد قرار پایا۔سائنٹفک سائوٹی کی تشکیل،تہذیب الاخلاق کا اجرا،اے ایم یو کالج کا قیام،مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور دیگر تصنیفات وتالیفات کا سلسلہ دراصل وہ اقدامات تھے جن کے ذریعہ ملک اور قوم کی ترقی ممکن تھی۔اس طرح یہ تحریک جوان ہوئی اور اس نے علمی وادبی روپ بھی اختیار کرلیا۔انھوں نے صداقت اور جستجو کو بنیاد بنایا۔افادیت اور مقصدیت کو لازم تصور کیا اور مطلق علم کو مذہب اور تہذیب سے مربوط کردیا۔سید عبداللہ اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

> ’’ہندوستان میں سرسید کے زمانے سے کچھ پہلے ہماری علمی تصانیف کا دائرہ مذہبیات،تاریخ اور رتصوف اور تذکرہ نویسی تک محدود تھا۔مذہبیات میں منقولات وروایات سے مواد حاصل کیا جاتا تھا اور مذہب کی ان قدروں پر خاص زور دیا جاتا تھا جو زندگی کے مادی پہلوؤں سے دور لے جانے والی ہوں......تذکرے بہت لکھے جاتے تھے مگر ان میں سچے تذکرے کچھ زیادہ نہ تھے......سرسید کی علمی وادبی تحریک نے ان سب رجحانات کو بدل ڈالا اور ایک ایسے علمی مذاق کی بنیاد ڈالی جسے ایک طرف حقیقت او رصداقت کی جستجو تھی مگر دوسری طرف وہ افادیت اور مقصدیت کی علمبردار بھی تھی...... یہ دو اہم بنیادیں ہیں جن پر سرسید کے تمام علمی کاموں کی بنیاد کھڑی ہے......یہی علی گڑھ کی علمی تحریک کی روح ہے۔‘‘(سرسید اوران کے نامور رفقاء،سید عبداللہ،ص:۶۸)

سید احتشام حسین نے اس منظرنامے کو سیاسی وسماجی اور تاریخی تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔وہ اس بیداری کو نشاۃ ثانیہ کے بجائے نشاۃ اولین قرار دیتے ہیں۔وہ لکھتے ہیں:

> ’’انیسویں صدی کا ہندوستان اپنی کامیابیوں اور ناکامیوں کے لحاظ سے سترہویں اور اٹھارہویں صدی کا زائیدہ تھا لیکن ہر زمانی تسلسل کی طرح نہ تو خالص ارتقائی،نہ خط مستقیم کی طرح سیدھا۔روایتوں کی سخت جانی،تہذیبی اثرات کے اختلاط،معاشی تغیرات اور سیاسی حالات نے ایسے پیچیدہ،مرکب اور متضاد عناصر پیدا کردیے تھے کہ تصورات اور اقدار کے نئے نئے حلقے بن گئے

تھے جو زوال پذیر معاشی حدوں کے اندر اپنے پجاری رکھتے تھے۔......اور یہ سب کچھ صدیوں سے کچلے ہوئے ارمانوں اور خوابوں، مشرق و مغرب کے تصادم سے پیدا ہونے والے تاریخی تقاضوں کا نتیجہ تھا۔ اس حرکت اور ذوق کی ایک شکل وہ تحریک تھی جو علی گڑھ تحریک کے نام سے موسوم کی جاتی ہے۔ یہ تحریک ہندوستان کے اس عام دور بیداری کا ایک جز تھی جسے کبھی کبھی نشاۃ ثانیہ کہا جاتا ہے۔ حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ اپنی ہمہ گیری اور نئے شعوری اثرات و مطالبات کے لحاظ سے یہ دور تغیر ہندوستان کی کسی اور تحریک سے مماثلت نہیں رکھتا تھا بلکہ اگر کہہ سکیں تو 'نشاۃ اولین' تھا جسے عام گفتگو میں 'دور جدید' کہتے ہیں۔'' (علی گڑھ تحریک: آغاز تا امروز، مرتبہ نسیم قریشی، ص: ۱۷)

سر سید ایک مورخ بھی تھے اور ایک مفکر بھی۔ ہندوستان کی سیاسی و سماجی صورت ان کے سامنے تھی جو خاصی ڈراونی تھی۔ دوسری طرف وہ سائنسی ایجادات اور مغرب کی ترقیوں کو بھی دیکھ رہے تھے۔ وہ ان کے حرکت و عمل، علم و ادب سے گہرے شغف، طرز معاشرت میں سلیقہ، ڈسپلن اور انتظام و طاقت سے بخوبی واقف تھے۔ دوسری جانب انہیں ہندوستانی فلسفہ و فکر میں جمود، قدامت پرستی، توہمات، نئی تعلیم سے بے رغبتی اور خوف و اندیشے کا بھی اندازہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے مغربی علوم و فنون اور ترقیوں میں بہت سی مفید باتوں اور چیزوں کو قبول کیا بلکہ اس کی برملا اشاعت بھی کی۔ دراصل سر سید زندگی کے ہر شعبہ میں انقلاب کے خواہش مند تھے، اسی لیے انھوں نے بڑے ہی موثر انداز میں علی گڑھ تحریک کا آغاز کیا۔ انھوں نے زندگی کو دنیا اور مادی ضرورتوں کی طرف مائل کیا، دین کا دنیا سے گہرا تعلق قائم کیا، شعر و ادب کو تلذذ و رمسرت، تفنن و تفریح کے بجائے مقصدیت اور افادیت کے تابع کیا۔ اور اسے سماجی رشتوں سے منسلک کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ دراصل یہ ایک انقلاب تھا جس نے ہر جگہ ایک ہلچل پیدا کر دی اور زندگی کے تمام نمائندہ پہلوؤں کا رخ تبدیل کر کے رکھ دیا۔ آل احمد سرور نے بڑی وضاحت سے تحریک کا جائزہ لیا ہے۔ ان کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''سر سید کی تحریک صرف ایک محدود سیاسی یا تعلیمی تحریک نہیں تھی۔ یہ ایک جامع ذہنی تحریک تھی جس کا مقصد تہذیب کا ایک نیا تصور دینا اور سماج میں ایک بڑا انقلاب لانا تھا۔ اس انقلابی تصور کے لیے انھوں نے مغربی فکر و تجربے سے پورا فائدہ اٹھایا۔......سر سید نے مسلمانوں کو دنیوی نقطۂ نظر کی طرف مائل کیا۔ انھوں نے نئی تعلیم کی حمایت کر کے نئے تہذیبی خزانوں کے دروازے اپنی قوم پر کھول دیے۔ انھوں نے ان کو جاگیردارانہ نظام سے لپٹے رہنے پر ٹوکا اور ملامت کی۔ انھوں نے زندگی کے امکانات سے فائدہ اٹھانے اور اس میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ انھوں نے بے شک انگریزی حکومت کی حمایت کی مگر اس سے فائدہ بھی اٹھایا۔ ان کا کالج جو بعد میں یونیورسٹی بنا ان کی تحریک کا ایک پہلو ہے۔ ان سے بڑا پہلوان کا وہ قومی اور اخلاقی مشن ہے جس کے سہارے انھوں نے فکر و فن کے سانچوں کو بدل دیا اور پوری قومی زندگی کو تعمیری جوش اور جذبے سے معمور کر دیا......مشرقیت اور مغربیت کے خانوں کو ختم کر کے دنیوی معاملات کی اہمیت کو واضح کر کے تجربے، عقل، مشاہدے کو رہنما بنا کر اپنی زبان و ادب کے ذریعہ سے خیالات کی اشاعت کر کے

اخلاق اور معاشرت کے اصول بنا کر، بول چال کی عام زبان استعمال کر کے تعلیم کی اہمیت پر زور دے کر، ادب کو شعلۂ نفس بنا کر اور اسے مقاصد جلیلہ کی گرمی او سماجی شعور کی برکت عطا کر کے سرسید نے اردو ادب کو پستی سے بلندی تک پہنچایا۔ اس میں علمی سرمایہ پیدا کیا۔ اس کو مختلف اصناف سے مالامال کیا۔ اس سے زندگی کی رہنمائی کا کام لیا۔'' (علی گڑھ تحریک آغاز تا امروز، ص:۷۴-۷۵)

15.3.3 بانیِ تحریک سرسید احمد خاں، ان کے رفقاء اور کارنامے

علی گڑھ تحریک کا باقاعدہ اور اجتماعی آغاز غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی کے قیام سے ہوتا ہے، جس کا کام انگریزی اور دیگر علوم مغربی سے متعلق کتابوں کا دیسی زبان میں ترجمہ کرنا تھا۔ یعنی سائنس، فلسفہ، سماجی علوم اور ادب یا علوم جدیدہ کی اشاعت اور ہندوستانیوں کو اس سے متعارف یا بہرہ ور کرنا۔ اس سے قبل تاریخ سرسری واقعہ نگاری کا نام تھا، مذہب میں روایت اور منقولات کو ہی اصلی ماخذ تصور کیا جاتا تھا اور ان قدروں کو ہی بنیاد خیال کیا جاتا تھا جس کا تعلق روحانی معاملات سے تھا۔ یا جو مادی پہلوؤں سے دور لے جاتے ہوں۔ تذکرے مبالغہ اور فضائل پر مشتمل ہوتے تھے اور تصوف جمود کا دوسرا نام تھا۔ سرسید کی اس علمی و ادبی تحریک نے ان تمام رجحانات کو بدل کر رکھ دیا اور تمام کی بنیاد صداقت، حقیقت اور جستجو و اجتہاد پر رکھی۔ جس میں افادیت اور مقصدیت، زندگی کی مادی معنویت اور اس کی ترقی کو اصل قرار دیا گیا۔ اس نے ہر چیز کو سائنٹفک انداز میں سمجھنے کی کوشش کی۔ اس کا اصل سہرا سرسید احمد خاں کی ذات گرامی کے سر ہے۔ مگر ان کے تمام رفقاء کی کوششیں بھی بے حد قابل قدر ہیں۔ ظاہر ہے کہ کوئی بھی تحریک محض ایک فرد سے نہیں فروغ پاتی اس کو آگے بڑھانے میں ایک ہی جیسی سوچ اور فکر رکھنے والے ایک ہی زاویۂ نگاہ رکھنے والے اور ایک ہی جیسا کم وبیش ذوق رکھنے والے افراد ہوتے ہیں جو اس اہم ذمہ داری کو بخوبی ادا کرتے ہیں۔ سرسید کے نامور رفقاء یا براہ راست ان کے مشوروں سے کام کرنے والوں میں اس تحریک کے کئی ارکان تھے جن میں نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، مولانا الطاف حسین حالی، علامہ شبلی نعمانی، ڈپٹی نذیر احمد، مولوی چراغ علی، مولوی ذکاء اللہ، مولوی زین العابدین، مولوی سمیع اللہ اور بعد میں وحید الدین سلیم، نواب عماد الملک اور عبدالحلیم شرر وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اس کے بعد دوسرے سلسلے میں نواب صدر یار جنگ، سر ضیاء الدین، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، مولوی عبدالحق، سر راس مسعود، مولانا طفیل احمد، مولانا ظفر علی خاں، مولوی عزیز مرزا، مولوی عنایت اللہ وغیرہ کے نام اہم ہیں جنھوں نے مختلف تبدیلیوں کے ساتھ سرسید تحریک کو فروغ دیا۔

تیسرے کارواں میں رشید احمد صدیقی، عبدالماجد دریا آبادی، خواجہ غلام السیدین، عابد حسین، سید ہاشمی فرید آبادی، ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر محمد مجیب، علامہ اقبال سہیل، پروفیسر محمد مجیب، قاضی تلمذ حسین، پروفیسر الیاس برنی وغیرہ کے نام آتے ہیں جنھوں نے اس مشن کو زندہ و تابندہ رکھا۔

سرسید نے اپنے رفقاء خاص کے ذریعہ علی گڑھ تحریک کے دامن کو مزید وسیع کیا۔ انھوں نے علمی وادبی کاموں کے ذریعہ اصلاح معاشرہ، اصلاح تعلیم کا بیڑا اٹھایا اور اردو زبان وادب میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔ اس اعتبار سے اسے ایک ہمہ گیر اصلاحی تحریک کہا جاسکتا ہے جس نے ہر شعبہ میں تجدید کا کام کیا۔ آیئے پہلے اسی پر نظر ڈالتے ہیں۔

سرسید چوں کہ خود تصنیف وتالیف سے گہرا شغف رکھتے تھے اور مختلف علوم وفنون سے ان کو گہری دلچسپی بھی تھی لہٰذا انھوں نے آثار الصنادید جیسی مایہ ناز اور مستند کتاب آثار قدیمہ اور تاریخ پر تصنیف کی اور خالص تحقیقی ذوق کا ثبوت پیش کیا اس کے ساتھ انھوں نے امیر تیمور سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک ۴۳ بادشاہوں کی مختصر تاریخ بھی پیش کی جو ان کی مورخانہ تدقیق کا عمدہ ثبوت ہے۔ انھوں نے آئین اکبری اور تاریخ فیروز شاہی کی تدوین بھی کی جس میں محققانہ صداقت اور باریک بینی کے رموز آشکار ہوتے ہیں۔ تاریخ نگاری سے یہ دلچسپی فن تحقیق کو ایک نئی سمت عطا کرتی ہے۔ اس راہ کو اپناتے ہوئے علامہ شبلی نعمانی نے سیرت نگاری کی طرف توجہ مرکوز کی اور المامون، الفاروق، سوانح مولانا روم، الغزالی اور سیرۃ النبی جیسی یادگار تصنیفات پیش کیں جن میں صداقت، تحقیقی جستجو اور اعلیٰ ادبی ذوق موجود ہے۔ الطاف حسین حالی نے باقاعدہ سوانح نگاری کا آغاز کیا اور حیات سعدی، یادگار غالب اور حیات جاوید جیسی سائنٹفک، مدلل اور سنجیدہ سوانحوں کی اردو میں روایت قائم کی۔ مولوی ذکاء اللہ نے بھی تاریخ ہندوستان رقم کرتے ہوئے ایک نئے تاریخی باب کا اضافہ کیا۔ اردو میں ناول نگاری کا سہرا بھی علی گڑھ تحریک کے سر جاتا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد اردو کے پہلے ناول نگار ہیں جنھوں نے اصلاح معاشرت، تعلیمی ترقی اور تعلیم نسواں کو بنیاد بنا کر مرأۃ العروس، بنات النعش، توبۃ النصوح، ابن الوقت، ایامی اور رویائے صادقہ جیسے بہترین ناول تخلیق کیے۔ اردو تنقید کا باضابطہ آغاز بھی الطاف حسین حالی کی مقدمہ شعر وشاعری سے ہوتا ہے جس پر سرسید کے شعر وادب کے تعلق سے واضح اثرات موجود ہیں۔ مقدمہ کے ذریعہ اردو پہلی بار تذکروں کی دنیا سے نکل کر اپنا تنقیدی مزاج طے کرسکی۔ اس سلسلے کو مزید مستحکم شبلی نے شعر العجم اور موازنہ انیس ودبیر لکھ کر کیا۔ اسی طرح سفر نامہ نگاری کو بھی سرسید اور شبلی کے ذریعہ نئی روشنی ملی۔ سرسید نے سفر نامہ لندن لکھ کر عجائبات فرنگ کی روایت سے ہٹ کر نئی بنا ڈالی اور اسے سائنٹفک اور افادی بنادیا۔ شبلی نے سفر نامہ مصر وشام وروم بھی اسی طرز پر لکھا جس میں سفر نامہ نگاری کے جدید اور مستند اصول تشکیل پاتے ہیں۔

سرسید نے اردو میں اجتہاد کی روایت قائم کرتے ہوئے قرآن کی تفسیر ''تفسیر القرآن'' پیش کی جس میں عقل اور فکر کی بنیاد پر دین کو سمجھنے کی سعی کی گئی تھی۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ عوام الناس میں مذہب کے امور اور جملہ پہلوؤں کو سمجھنے اور قاری کو متن کی سائنٹفک تعبیر کرنے کا ذوق پیدا ہوا۔ اردو میں ادبی صحافت کو ایک نیا مقام سرسید نے تہذیب الاخلاق کے ذریعہ عطا کیا۔ اس کے علاوہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے ذریعہ بھی ان کی کوششیں جاری رہیں۔ آزادئ رائے، ترسیل خیال، فکری اظہار، قوت بیان اور سیاسی وسماجی مسایل پر بحث کا سلسلہ تہذیب الاخلاق کے ذریعہ شروع ہوا اور یہ علی گڑھ تحریک کی روح بن گیا۔ اردو میں مضمون نگاری کی صنف کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے جس کے بانی خود سرسید ہیں۔ سرسید اور ان کے رفقاء نے تہذیب الاخلاق میں سادہ، صاف، رواں، عام فہم زبان میں سنجیدہ، متین، مدلل اور سائنٹفک نثر لکھنے کی روایت قائم کی جس میں مفروضے، ابتدا، تمہید، درمیان، اختتام اور تکمیلیت وغیر تکمیلیت، موضوع، مقصد جیسے تکنیکی اور فنی ضابطوں

کا اہتمام بھی شامل ہے۔تہذیب الاخلاق جسے اسپیکٹٹر اور ٹیٹلر کی اتباع میں شروع کیا گیا تھا اس نے زندگی کے مسائل کی ترجمانی کی اور سرسید تحریک کے اصلاحی مقصد کو پورا کیا۔ سرسید کے ساتھ محسن الملک، حالی، مولوی پیر بخش، مولوی فارقلیط اللہ وغیرہ نے متعدد موضوعات پر مضامین تحریر کیے۔ بقول انور سدید:

''علی گڑھ تحریک اور تہذیب الاخلاق کے وساطت سے اردو ادب کا تعارف ایک ایسی صنف سے ہو گیا تھا جس کی جہتیں بے شمار تھیں اور جس میں اظہار کے بوقلموں قرینے موجود تھے۔'' (اردو ادب کی تحریکیں، انور سدید، ص:۳۲۱)

تہذیب الاخلاق سے قبل اردو نثر تصنع، تکلف، عبارت آرائی، قافیہ پیمائی و تک بندی، پیچیدگی، مشکل پسندی جیسے معائب کا شکار تھی۔ اس رسالے کے ذریعہ بے تکلفی، بے ساختگی، مدلل انداز بیان، قطعیت، سادگی اور متانت کو نثر میں بنیادی حیثیت حاصل ہوئی۔

سرسید کا ایک بڑا کمال یہ بھی ہے کہ انھوں نے فرسودہ اور روایتی شاعری سے ہٹ کر نیچرل شاعری کی طرف توجہ دلائی اور اسے بھی مقصدیت و افادیت عطا کی۔ محض تک بندی اور جمالیاتی امور یا روایتی قسم کے عشقیہ معاملات کو متروک قرار دیا۔تحریک کے زیر اثر مادی قدروں کو اہمیت اور مسرت کے بجائے افادیت پر زور دیا گیا۔ یکم محرم ۱۲۸۹ھ کو تہذیب الاخلاق کے شمارے میں سرسید علم و ادب اور انشاء کے نقائص پر محو گفتگو ہیں کہ:

''فن شاعری جیسا کہ ہمارے زمانے میں خراب اور ناقص اس سے زیادہ کوئی چیز بری نہ ہوگی۔ مضمون تو بجز عاشق کے اور کچھ نہیں ہے۔ وہ بھی نیک جذبات انسانی کو ظاہر نہیں کرتا۔'' (تہذیب الاخلاق، یکم محرم ۱۸۷۳ء، ص:۳)

کرنل ہالرائڈ کے ایما پر محمد حسین آزاد اور حالی نے لاہور میں طرحی نظمیہ مشاعروں کی بنیاد ڈالی اور اس میں نیچرل شاعری کو فروغ دیا گیا۔نظم جدید کا آغاز اور نیچرل و مختلف النوع موضوعات پر ہونے والی شاعری کا سرسید نے دل سے خیر مقدم کیا۔ سرسید کے خیالات کی بازگشت یہاں بھی موجود ہے۔ وہ ۲۹ /اکتوبر ۱۸۸۴ء میں ایک خط میں محمد حسین آزاد کو لکھتے ہیں:

''میری قدیم تمنا اس مجلس مشاعرہ سے برآئی۔ میں مدت سے چاہتا تھا کہ ہمارے شعراء نیچر کے حالات کے بیان پر متوجہ ہوں......اپنے کلام کو نیچر کی طرف مائل کرو جس قدر کلام نیچر کی طرف مائل ہوگا اتنا ہی مزہ دے گا۔'' (خطوط سرسید، مرتبہ راس مسعود، ص:۵۴)

دراصل سرسید اس قسم کے شعری رجحانات پیدا کرنا چاہتے تھے اور اس کی شروعات مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسوں سے ہو گئی تھی۔ ان جلسوں سے ہی قومی شاعری کا تصور فروغ پانے لگا اور بعد میں اس نے نظم جدید کی شکل میں انقلابی صورت اختیار کر لی۔ حالی نے اس میں کلیدی رول ادا کیا اور تحریک کے مقاصد کو شاعری اور نظموں میں پیش کیا۔ برکھارت، مناجات بیوہ، نشاط امید، چپ کی داد، مناظرہ رحم و انصاف اور مسدس مدو جزر اسلام کو علی گڑھ تحریک اور سرسید کے مقاصد کا ہی ترجمان کہنا درست ہوگا۔

15.3.4 علی گڑھ تحریک کی اہم سرگرمیاں

ایرانی تصوف، ابن العربی کے فلسفہ وحدۃ الوجود اور بھگتی تحریک کے اثرات نے ہندوستان میں مذہب کے تصور کو بے حد محدود کر دیا تھا۔ اقتدار کے چلے جانے، معاشی صورت حال کے ابتر ہو جانے سے لوگوں کے ذہن میں یہ نظریات گھر کر گئے تھے اور عوام الناس بے عملی کی زندگی کو ترجیح دے بیٹھے تھے۔ دوسری طرف بدعات، رسوم ورواج کی کثرت عین مذہب بن گئی تھیں۔ لوگ فرقوں اور طبقوں میں منقسم تھے، حلقہ بگوشی وسیلہ نجات بن چکی تھی۔ جب شاہ ولی اللہ کی تحریک آئی تو اس نے دین میں تجدید کا کام کیا۔ اس کے اندر مذہب کا ایک وسیع تصور موجود تھا۔ اس نے بدعات سے گریز کیا اور مسلم قوم میں عسکری نظام قائم کرنے میں پہل کی۔ ۱۸۵۷ء کی شورش میں اس کا خاتمہ ہو گیا۔ دوسری جانب انگریزوں کی آمد سے سائنس، مغربی خیالات اور مادیت کے تصور نے ہندوستان میں پیر پسار لیے اور عیسائی مشنریوں نے مذہب اسلام کو زد پر لے رکھا تھا۔ خود مسلم قوم کے سامنے سائنس اور ٹکنالوجی، جدید علوم اور دنیاوی ترقیوں سے اسلام کے تطابق کی صورت حال نہیں نکل رہی تھی لہٰذا اسلامی عقائد کی دنیاوی ضرورتوں کے سامنے نفی ہو رہی تھی جو اسلام کے عین منافی تھا۔ علی گڑھ تحریک نے اس خطرے کا مقابلہ کیا اور اس خطرے کو روکا کہ لوگ اپنے مذہب کو کم علمی کے سبب تبدیل نہ کر بیٹھیں کیوں کہ انھوں نے اسلام کا وہی محدود اور جامد تصور ذہن ودل پر نقش کر رکھا ہے۔ علی گڑھ تحریک نے مسلم قوم کو باور کرایا کہ اسلام درحقیقت ایک متحرک اور ترقی پسند مذہب ہے جو عقل اور سائنس کے منافی نہیں بلکہ اس کے عین مطابق ہے اور تہذیب وشائستگی اس کا اہم ترین حصہ ہے۔ انھوں نے دلائل کی بنیاد پر یہ ثابت کیا کہ اسلام ہی وہ مذہب ہے جو بدلتے ہوئے ماحول اور بدلتے ہوئے تیز رفتار وقت کے ساتھ چل سکتا ہے۔ سرسید نے اسلام کا ایک جدید تصور پیش کیا اور علم کلام کی بنیاد ڈالی اور اسلام کو ایک سائنٹفک مذہب قرار دیا۔ سائنٹفک سوسائٹی، انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق کے قیام کا مقصد ان خیالات کی اشاعت بھی تھا۔ علی گڑھ تحریک نے اسلام اور سائنس میں مطابقت پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ سرسید کا خیال تھا کہ اسلام دین فطرت ہے۔ قرآن خدا کا قول ہے اور فطرت خدا کا فعل۔ اس طرح قول وفعل میں تضاد ہونا ممکن ہے۔ ان کی تمام مذہبی تصانیف فطرت اور عقل میں ہم آہنگی کی راہ تلاش کرتی ہیں۔ اسلام اور سائنس میں مطابقت کرنے، جدید تعلیم کو فروغ دینے کے لیے ایسے مدارس قائم کیے گئے جہاں اسلامی تعلیم کے ساتھ سائنس اور جدید تعلیم سے استفادہ کیا جا سکے۔ اس کی عمدہ ترین صورت ایم اے او کالج ہے۔ مدرسۃ العلوم علی گڑھ تحریک کا اہم حصہ اور ایسا ذریعہ تھا جس کے ذریعہ اصلاحی اور تعلیمی مشن کو غیر معمولی تقویت حاصل ہوئی۔ ۱۸۷۵ء میں اس کا قیام عمل میں آیا۔ حالی کی نظم ''مدرسۃ العلوم'' اس کے مقاصد اور کیفیت کی ترجمانی کرتی ہے جس کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ایک ایسا ادارہ ہے جہاں رنگ، نسل، مذہب، تہذیب ومعاشرت غرض کسی کی کوئی تفریق نہیں ہے بلکہ علم کی پیاس اہمیت رکھتی ہے۔

علی گڑھ تحریک کا ایک اہم مقصد مسلمانوں اور انگریزوں کی باہمی قربت تھا۔ چوں کہ اس وقت مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ انگریزوں کا مخالف اور انگریزی حکومت کی پالیسیوں سے متنفر تھا۔ دوسری طرف انگریز مسلمانوں کو اپنا جانی دشمن سمجھتے

تھے۔اوران کے عتاب کا پہلا نشانہ وہ ہی بنتے تھے۔

سرسید نے ہوا کے رخ کو پہچان لیا تھا، لہٰذا انھوں نے تبیین الکلام، طعام اہل کتاب، تحقیق لفظ نصاریٰ جیسی کتابیں لکھ کر دونوں قوموں کے مابین رفاقت کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ وہیں رسالہ اسباب بغاوت ہند، سرکشی ضلع بجنور لکھ کر انگریزوں کی غلطیوں اور غلط پالیسیوں کی جانب اشارہ بھی کیا۔ دوسری جانب سرسید نے مسلمانوں کو انگریزی تعلیم کی جانب راغب ہونے اور متوجہ کرنے کی کوشش کی تاکہ وہ حکومت کی پالیسیوں میں حصہ دار بن سکیں۔اس کا آغاز انھوں نے ۱۸۷۷ء میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی نیو رکھ کر کیا۔ ان کی منصوبہ بندی کا اندازہ ان کی تقریر کے ان الفاظ سے لگایا جاسکتا ہے۔وہ کہتے ہیں:

> ''مگر تم دیکھ لو کہ ہندوستان کو علوم وفنون میں اور زیادہ ترقی درکار ہے چند ہندوستانیوں کا Legistative کونسل میں داخل ہونا ہندوستانیوں کی ترقی کا شروع ہے۔تم میری پیشن گوئی کو یاد رکھو کہ وہ دن کچھ دور نہیں کہ ہر ضلع میں سے ایک شخص کا کونسل میں داخل ہونا ضرور ہوگا۔ وہ دن آوے گا کہ تم خود ہی قانون بناؤ گے اور خود ہی اس پر عمل کرو گے۔'' (مضمون سرسید کی بصیرت، شان محمد، تہذیب الاخلاق، مارچ ۱۹۶۸ء، ص:۳۴)

سرسید اس امر سے بخوبی واقف تھے کہ تعلیمی منصوبوں کی تکمیل اور سیاسی بیداری کے سارے تقاضے تبھی ممکن ہیں جب انگریز حکومت مسلم قوم کا ساتھ دے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے انگریز حکومت کی کھلم کھلا حمایت کی اور مسلمانوں کو کسی سیاسی جماعت سے منسلک ہونے سے منع کیا۔۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کا پہلا اجلاس جب ممبئی میں ہوا تو سرسید نے اس کی مخالفت کی اور مسلمانوں کو اس میں شریک کرنے سے باز رہنے کو کہا۔ وہ جانتے تھے کہ ابھی وہ وقت نہیں آیا ہے کہ ہندوستانی مسلمان سیاست میں قدم رکھیں۔ سیاسی طور پر مضبوط ہونے کے لیے اعلیٰ تعلیم کے حصول کی ضرورت تھی جو مسلمانوں کے پاس نہیں تھی اور وہ صرف اور صرف حکومت کے ذریعہ ہی ممکن تھی۔

15.4 خلاصہ

سرسید تحریک ایک محدود سیاسی یا تعلیمی تحریک ہونے کے بجائے زندگی کے کئی شعبوں کو محیط ایک جامع تحریک تھی جس نے تہذیب وثقافت، سماج و سیاست، تعلیم و تربیت، مذہب وفکر، شعروادب، زبان و بیان، اقدار و اخلاق ہر حصہ میں تبدیلی پیدا کی۔ اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور کامیاب کوششیں کیں جس کے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے۔ یہ تحریک سماج ومعاشرہ میں اصلاح، مذہب میں اجتہاد اور تازگی، دنیا سے دین کا رشتہ، ادب میں وسعت، افادیت اور اسلوب میں سادگی اور سلاست کی قایل تھی۔ تجربہ، عقل، مشاہدہ اس کی روشنی تھے۔صداقت اور حقیقت اس کی جستجو اور استدلال، تعقل اور فکر اس کی بنیاد تھے۔ اس تحریک نے سائنس، ٹکنالوجی، صنعت وحرفت، مغربی علوم کی اشاعت، علوم جدیدہ کی ترویج، انگریزی تعلیم کو بطور خاص اہمیت دی۔مسلمانوں اور انگریزوں یا حکومت کے مابین ذہنی ہم آہنگی قائم کرنے کی

کوشش کی۔ اعلیٰ تعلیم کے حصول پر اصرار کیا۔ اسلام اور سائنس و عقل میں تطابق پیدا کرنے کی سعی کی۔ نیچر کو اہمیت دی۔ سائنٹفک سوسائٹی، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، انسٹی ٹیوٹ گزٹ، تہذیب الاخلاق، محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا قیام اسی تحریک کا رہین منت ہے۔ اردو شعر و ادب میں افادیت، مقصدیت، مدعا نگاری، سائنٹفک اور معروضی و مدلل طرز بیان اور نیچر پر اصرار کیا گیا۔ اس تحریک کے زیر اثر اردو ناول کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ سوانح کے جدید اور مغربی اصولوں کی روشنی میں اردو سوانح نگاری اور اردو تنقید کی باضابطہ ابتدا ہوئی۔ اجتہاد اور علم الکلام کی روشنی میں تفسیر تحریر کی گئی، تحقیقی اصولوں کی روشنی میں مذہبی تصانیف وجود میں آئیں۔ تاریخ نگاری اور سیرت نگاری میں جدید مغربی اصولوں اور تحقیق و صداقت کو ملحوظ رکھا گیا۔ اردو شاعری میں موضوعات کا تنوع در آیا۔ نیچرل شاعری کو فروغ ملا اور نظم جدید کا آغاز ہوا۔ ڈپٹی نذیر احمد، حالی، شبلی، ذکاء اللہ، محسن الملک، وقار الملک، مولوی سمیع اللہ، زین العابدین تحریک کے روح رواں اور سرسید کے ہمنوا رہے۔

15.5 آپ نے کیا سیکھا

آپ علی گڑھ تحریک کے سیاسی و سماجی پس منظر سے واقف ہوئے۔

آپ کو علی گڑھ تحریک کے آغاز اور ابتدائی کوششوں کا علم ہوا۔

آپ علی گڑھ تحریک کے اغراض و مقاصد سے واقف ہوئے۔

آپ علی گڑھ تحریک اور سرسید کی علمی، ادبی، تعلیمی، سیاسی، و سماجی، اصلاحی کوششوں سے واقف ہوئے۔

آپ علی گڑھ تحریک کے ارکان اور رفقاء سرسید سے متعارف ہوئے۔

15.6 اپنی جانچ خود کریں

1- علی گڑھ تحریک کا آغاز کب اور کیسے ہوا؟

2- علی گڑھ تحریک نے کن امور پر زور دیا؟

3- علی گڑھ تحریک کے اہم کارکنان کون کون تھے؟

4- علی گڑھ تحریک نے زبان و ادب کے فروغ میں کیا کردار ادا کیا؟

15.7 سوالوں کے جوابات

1- علی گڑھ تحریک تعلیمی اور اصلاحی تحریک ہونے کے علاوہ سیاسی، سماجی، علمی اور ادبی تحریک بھی ہے، جس نے زندگی کے ہر شعبہ کو اثر انداز کیا۔ تحریک کے روح رواں سرسید احمد خاں تھے۔ انھوں نے ۱۸۵۷ء کے واقعے کے نتیجے میں ہونے والی تباہی اور مغلیہ سلطنت کے خاتمے کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ان کی دور اندیشی نے یہ نتیجہ اخذ کرلیا تھا کہ انگریز حکومت سے زور آزمائی کرنے کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہونے والا ہے۔ مناسب یہی ہے کہ حکومت کا ساتھ دیا جائے اور ہر پہلو سے اپنا جائزہ لے کر اپنی اصلاح کی جائے۔ انھوں نے دوسرے کو کمزور بنانے کے بجائے خود کو ہر اعتبار سے مضبوط بنانے پر زور دیا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ ہندوستان کا تعلیمی نظام فرسودہ ہے جب کہ

مغربی نظام تعلیم کئی اعتبار سے مفید، تازہ اور مثبت ہے۔ایسے علوم کے حصول کے لیے زبان اور ادب ہی وسیلہ ہوتے ہیں۔سرسید کو اپنی زبان اور ادب کی صورت حال کا بخوبی علم تھا کہ اس میں بڑی تبدیلیوں کی ضرورت ہے لہٰذا جدید تعلیم کا حصول، زبان کی ترقی اور ادب میں وسعت سرسید کا اولین مقصد قرار پایا۔

2- دراصل سرسید زندگی کے ہر شعبہ میں انقلاب کے خواہش مند تھے،اسی لیے انھوں نے بڑے ہی موثر انداز میں علی گڑھ تحریک کا آغاز کیا۔انھوں نے زندگی کو دنیا اور مادی ضرورتوں کی طرف مائل کیا، دین کا دنیا سے گہرا تعلق قائم کیا، شعروادب کو تلذذ اور مسرت، تفنن و تفریح کے بجائے مقصدیت اور افادیت کے تابع کیا۔ اور اسے سماجی رشتوں سے منسلک کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ دراصل یہ ایک انقلاب تھا جس نے ہر جگہ ایک ہلچل پیدا کردی اور زندگی کے تمام نمائندہ پہلوؤں کا رخ تبدیل کر کے رکھ دیا۔

3- اس سے قبل تاریخ سرسری واقعہ نگاری کا نام تھا، مذہب میں روایت اور منقولات کو ہی اصلی ماخذ تصور کیا جاتا تھا اور ان قدروں کو ہی بنیاد خیال کیا جاتا تھا جس کا تعلق روحانی معاملات سے تھا۔یا جو مادی پہلوؤں سے دور لے جاتے ہوں۔تذکرے مبالغہ اور فضائل پر مشتمل ہوتے تھے اور تصوف جمود کا دوسرا نام تھا۔سرسید کی اس علمی وادبی تحریک نے ان تمام رجحانات کو بدل کر رکھ دیا اور تمام کی بنیاد صداقت، حقیقت اور جستجو واجتہاد پر رکھی۔ جس میں افادیت اور مقصدیت، زندگی کی مادی معنویت اور اس کی ترقی کو اصل قرار دیا گیا۔اس نے ہر چیز کو سائنٹفک انداز میں سمجھنے کی کوشش کی۔اس کا اصل سہرا سرسید احمد خاں کی ذات گرامی کے سر ہے۔مگر ان کے تمام رفقاء کی کوششیں بھی بے حد قابل قدر رہے۔ظاہر ہے کہ کوئی بھی تحریک محض ایک فرد سے نہیں فروغ پاتی اس کو آگے بڑھانے میں ایک ہی جیسی سوچ اور فکر رکھنے والے ایک ہی زاویۂ نگاہ رکھنے والے اور ایک ہی جیسا کم وبیش ذوق رکھنے والے افراد ہوتے ہیں جو اس اہم ذمہ داری کو بخوبی ادا کرتے ہیں۔ سرسید کے نامور رفقاء یا براہ راست ان کے مشوروں سے کام کرنے والوں میں اس تحریک کے کئی ارکان تھے جن میں نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، مولانا الطاف حسین حالی، علامہ شبلی نعمانی، ڈپٹی نذیر احمد، مولوی چراغ علی، مولوی ذکاء اللہ، مولوی زین العابدین، مولوی سمیع اللہ اور بعد میں وحید الدین سلیم، نواب عماد الملک اور عبدالحلیم شرر وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

4- سرسید چوں کہ خود تصنیف وتالیف سے گہرا شغف رکھتے تھے اور مختلف علوم وفنون سے ان کو گہری دلچسپی بھی تھی لہٰذا انھوں نے آثار الصنادید جیسی مایہ ناز اور مستند کتاب آثار قدیمہ اور تاریخ پر تصنیف کی اور خالص تحقیقی ذوق کا ثبوت پیش کیا اس کے ساتھ انھوں نے امیر تیمور سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک ۴۳ بادشاہوں کی مختصر تاریخ بھی پیش کی جو ان کی مورخانہ تدقیق کا عمدہ ثبوت ہے۔ انھوں نے آئین اکبری اور تاریخ فیروز شاہی کی تدوین بھی کی۔علامہ شبلی نعمانی نے سیرت نگاری کی طرف توجہ مرکوز کی اور المامون، الفاروق، سوانح مولانا روم، الغزالی اور سیرۃ النبی جیسی یادگار تصنیفات پیش کیں۔ الطاف حسین حالی نے باقاعدہ سوانح نگاری کا آغاز کیا اور حیات سعدی، یادگار غالب اور حیات جاوید جیسی سائنٹفک، مدلل اور سنجیدہ سوانحوں کی اردو میں روایت قائم کی۔ مولوی ذکاء اللہ نے بھی تاریخ ہندوستان رقم کرتے ہوئے ایک نئے تاریخی باب کا اضافہ کیا۔اردو میں ناول نگاری کا سہرا

بھی علی گڑھ تحریک کے سر جاتا ہے۔ڈپٹی نذیر احمد اردو کے پہلے ناول نگار ہیں جنھوں نے اصلاح معاشرت، تعلیمی ترقی اور تعلیم نسواں کو بنیاد بنا کر مرأۃ العروس، بنات النعش، توبۃ النصوح، ابن الوقت، ایامیٰ اور رویائے صادقہ جیسے بہترین ناول تخلیق کیے۔اردو تنقید کا باضابطہ آغاز بھی الطاف حسین حالی کی مقدمہ شعروشاعری سے ہوتا ہے جس پر سرسید کے شعروادب کے تعلق سے واضح اثرات موجود ہیں۔مقدمہ کے ذریعہ اردو پہلی بار تذکروں کی دنیا سے نکل کر اپنا تنقیدی مزاج طے کر سکی۔اس سلسلے کو مزید مستحکم شبلی نے شعرالعجم اور موازنہ انیس و دبیر لکھ کر کیا۔ اسی طرح سفرنامہ نگاری کو بھی سرسید اور شبلی کے ذریعہ نئی روشنی ملی۔اردو میں مضمون نگاری کی صنف کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے جس کے بانی خود سرسید ہیں۔سرسید اور ان کے رفقاء نے تہذیب الاخلاق میں سادہ، صاف، رواں، عام فہم زبان میں سنجیدہ، متین، مدلل اور سائنٹفک نثر لکھنے کی روایت قائم کی۔سرسید کا ایک بڑا کمال یہ بھی ہے کہ انھوں نے فرسودہ اور روایتی شاعری سے ہٹ کر نیچرل شاعری کی طرف توجہ دلائی اور اسے بھی مقصدیت وافادیت عطا کی۔

15.8 فرہنگ

پس پشت	پیچھے	مقدر	قسمت
تغیرات	تبدیلیاں	تلذذ	لذت کا حصول
فضلاء	فاضل کی جمع	مسرت	خوشی
ادباء	ادیب کی جمع	تابع	پیرو
نہج	راستہ، طریقہ	وضاحت سے	تفصیل سے
نشاۃ ثانیہ	دوبارہ سے پیدا ہونا، زندہ ہونا	متن	Text
اہل	لائق	جملہ	تمام
فرسودہ	پرانا	نقائص	نقص کی جمع، کمیاں
منافی	ناقابل قبول	وسیلہ	ذریعہ
تضاد	مخالف		

15.9 کتب برائے مطالعہ

سرسید اور ان کے نامور رفقاء، سید عبداللہ، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۲۰۱۱ء
اردو ادب کی تحریکیں، انور سدید
سرسید اور ان کا عہد، ثریا حسین
حیات جاوید، الطاف حسین حالی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان